متاعِ علم وفکر

شریعت کے بعض قوانین کی وضاحت، دعوت واصلاح سے متعلق بعض اہم جہتوں کی رہنمائی، دلچسپ اور عبرت خیز سفرنامے، نیز کچھ اہم کتابوں کے تعارف وتجزیہ پر مشتمل مضامین کا مجموعہ، سلیس اور آسان زبان میں۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

ناشر : ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی (انڈیا)

جملہ حقوق بہ حق مؤلف محفوظ

۲۰۱۲ء ——— ۱۴۳۳ھ

نام کتاب	:	متاعِ علم وفکر
تالیف	:	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
صفحات	:	۳۸۳
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
کمپیوٹر کتابت	:	محمد نصیر عالم سنبھلی
قیمت	:	۱۸۰/روپے

ایفا پبلی کیشنز

بیسمنٹ ۱۶۱۔ایف، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فون: ۲۶۹۸۱۳۲۷، ای میل: ifapublication@gmail.com

فہرست مضامین

پیش لفظ : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۵

مسائل حاضرہ

عقل کے اندھوں کا شریعت پر الزام ۱۱
افغانستان کے واقعات سے ذہنوں پر کیا کیا اثرات پڑے؟ ۱۵
اصل مسئلہ نقشۂ کار کا نہیں افرادِ کار کا ہے ۲۸
سیول کوڈ اور اسلامی قوانین ۳۸
سپریم کورٹ میں دائر ''لے پالک'' کے بارے میں ایک رٹ کا جواب ۴۲
تغیر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں اجتہاد کا حصہ — ایک تاریخی جائزہ ۵۱
غیر مسلموں میں تبلیغ — ایک دینی فریضہ اور ملی وسیاسی ضرورت ۶۶
معاشرہ کی اصلاح سے متعلق کچھ ضروری باتیں ۶۹

تاریخ، تذکرہ اور سفر نامے

سیرتِ نبویہ کا ہر پہلو درخشاں اور نفع رساں ۷۹
سچی محبت کی علامت ۸۷
ملیشیا میں عالمی اسلامی کیلنڈر سیمینار ۸۹
تحریک آزادی پر فکر ولی اللّٰہی کے اثرات ۹۸
قدیم اسلامی علوم کا منہج، تعلیم اور نصاب ۱۱۱

کولمبس کے دیش (امریکہ) میں ڈھائی ہفتے ۱۲۰
موجودہ دور میں کارِ نبوت انجام دینے والے ۱۴۵
ردِ قادیانیت پر علماء کی تصنیفی خدمات ۱۶۴
ربِ کریم کے فضل خاص کے تین ہفتے ۱۷۸
ایک مبارک سفر کی کچھ خوشگوار یادیں! ۲۱۲
دارالعلوم دیوبند — قیام، مقاصد، خدمات اور عام تاثرات ۲۲۰

کتابیات

تفسیر عثمانی پر کئے جانے والے اعتراضات کا جائزہ ۲۳۷
صحیح بخاری کے حواشی میں الامام محمد قاسم النانوتوی کا انداز ۲۵۵
الکوکب الدری علی جامع الترمذی کی اہم خصوصیات ۲۷۰
''مجموعۂ قوانین اسلامی'' یعنی مسلم پرسنل لا سے متعلق احکام کا دفعہ وار مرتب مجموعہ ۲۹۴
''تاریخ عزت اسلام'' پر تبصرہ ۳۰۳
''القول الجلی'' کے مقدمہ کا تنقیدی جائزہ ۳۰۸
صحیح البخاری کی ایک خدمت — التصویبات لمافی حواشی البخاری من التصحیفات ۳۱۶
علامہ کشمیریؒ اور فیض الباری کی عظمت واہمیت اور اس پر محنت کی ضرورت ۳۲۶
''تکملۂ تفسیر فتح العزیز'' (مخطوطہ) — ایک تعارف ۳۴۸
شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور فن تفسیر ۳۶۱
مولانا شمس نوید عثمانی کی کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' کے بارے میں کچھ قابل غور باتیں ۳۷۶

☆ ☆ ☆

Z

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کے زندگی گذارنے کے لئے جو طریقہ منتخب کیا ہے، اس کا نام اسلام ہے، یہی دین ہے جو حضرت آدم علیہ السلام پر اُتارا گیا، پھر حضرت نوح علیہ السلام اور مختلف انبیاء کرام پر نازل ہوتا رہا اور اپنی آخری اور مکمل شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لے کر دنیا میں تشریف لائے :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحاً وَالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَا
إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ
أَقِيْمُوْا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ (الشوریٰ:۱۳)

آپ سے پہلے ہر عہد میں اللہ کے نبی آتے رہتے تھے، دورِ فترت بہت کم ہوتا تھا، اس لئے خود انبیاء کرام دین کی تشریح وتوضیح فرمایا کرتے تھے؛ لیکن نبوت کا سلسلہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوگیا، اس لئے اب یہ اعزاز علماء کو عطا کیا گیا کہ وہ اللہ کے دین کی

تشریح وتوضیح اور شریعت اسلامی سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ کا فریضہ انجام دیں، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا، یہ فریضہ ہر دور میں انجام دیا جاتا رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک دیا جاتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ ہندوستان کے علماء شروع سے ہی اس سلسلہ میں پیش پیش رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان میں اسلامیات پر کمیت اور کیفیت دونوں جہتوں سے اتنی عظیم الشان خدمت انجام دی گئی ہے کہ عربی زبان کے سوا کوئی اور زبان اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی، موجودہ دور میں ہندوستان کے جو بزرگ علماء اس قلمی جہاد میں مشغول ہیں، ان میں ایک اہم نام مخدوم گرامی حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی دامت برکاتہم کا ہے، ان کے شب وروز کم سے کم نصف صدی سے تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، فکری وعملی تربیت اور دین کی تشریح وتعبیر میں گذر رہے ہیں، مولانا کی ایسی ہی کاوشوں کا ایک مظہر یہ کتاب ''متاعِ علم وفکر'' بھی ہے۔

یہ کتاب مولانا کے مختلف مقالات کا مجموعہ ہے، جو مختلف مناسبتوں سے مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں اور اہم رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں یا سیمیناروں میں پیش کئے گئے ہیں؛ چنانچہ ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک حصہ 'مسائل حاضرہ' کا ہے، جس میں بعض بین الاقوامی واقعات پر تبصرہ ہے، شریعت اسلامی پر شبہات کا جائزہ ہے اور دعوت واصلاح کے کام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

دوسرا مرکزی عنوان ''تاریخ، تذکرہ اور سفرنامے'' کا ہے، جس میں سیرت نبوی پر ایک اہم تحریر ہے، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، حرمین شریفین کی داستانِ زیارت کے علاوہ ملیشیا اور امریکہ کا سفرنامہ ہے اور مختلف اہم مضامین

اس مرکزی عنوان کے تحت شامل ہیں۔

تیسرا مرکزی عنوان ''کتابیات'' کا ہے، اس عنوان کے تحت مختلف کتابوں پر تنقید وتبصرہ یا کتاب سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہے، غرض کہ علمی اور دینی مضامین کا یہ ایک وقیع مجموعہ ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے لئے سعادت وخوش بختی کی بات ہے کہ وہ اکیڈمی کے نائب صدر، برصغیر کی ممتاز علمی شخصیت، علوم اسلامی کے غواص استاذ اور زبان وقلم کے شناور حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی کی اس تالیف کو اہل علم تک پہنچا رہی ہے، اُمید ہے کہ اصحابِ ذوق اسے شوق کے ہاتھوں لیں گے اور اس سے فائدہ اُٹھائیں گے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ عافیت کے ساتھ مصنف گرامی کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

واللہ ھو المستعان۔

۲۵/صفر ۱۴۳۳ھ **خالد سیف اللہ رحمانی**

۲۰/جنوری ۲۰۱۲ء (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

☆ ☆ ☆

متاعِ علم وفکر

عقل کے اندھوں کا شریعت پر الزام

عدالت کا فیصلہ شریعت پر حملہ نہیں بلکہ شریعت کی تائید ہے

اسلامی شریعت اور مسلمانوں کے خلاف ملکی پریس بالفاظ صحیح زرد صحافت میں مخالفانہ بلکہ معاندانہ پروپیگنڈہ کرکے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے کی کوششیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں، جن سے کوئی بھی واقف حال، خاص طور پر اخبار بیں طبقہ، انکار نہیں کرسکتا، اس پروپیگنڈے کی مثال کبھی تو ''حبہ کو قبہ'' یا ''سوئی کو پھاوڑا'' بنانے کی سی ہوتی ہے اور کبھی بغیر سوئی ہی کے پھاوڑا بنادیا جاتا ہے، آج کل اخبارات میں کورٹ کے ایک حالیہ فیصلہ کے بہانے سے اسلامی شریعت کے خلاف جو الزام تراشی اور گولہ باری ہورہی ہے وہ بغیر سوئی کے ہی پھاوڑا بنانے جیسی حرکت کا مصداق معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ زیر بحث فیصلہ میں مطلقہ عورت کے بچہ کے باپ پر، بچہ کے اخراجات کا بار ڈالنے کو ایسے انداز میں پیش کیا جارہا ہے جیسے کہ اسلامی قوانین کے خلاف یہ فیصلہ ہوا اور اس کے ذریعہ شریعت پر ضرب کاری لگادی گئی ہو، اسی سوچ کی وجہ سے مسلمان اور اسلام مخالف صحافت، خوب زور وشور کے ساتھ اسی طرح کا پروپیگنڈہ کررہی ہے اور شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع کررہی ہے؛ حالاں کہ اسلامی شریعت نے مطلقہ عورت کو بھی بعض شرطوں کے ساتھ، جن سے بچہ ہی کی رعایت مقصود ہے اپنے بچہ کی پرورش کا ایسا ہی حق دیا ہے جیسا کہ بچہ کے باپ کی بیوی (منکوحہ) ہونے کی شکل میں اور تمام اخراجات باپ پر ہی لازم کئے ہیں، بلکہ مطلقہ ہونے کی صورت میں کچھ زیادہ ہی مالی منفعت کی شکلیں بچہ کی ماں کے لئے رکھی ہیں، اگر وہ پرورش کی ذمہ داری قبول کرلے (بچہ کی پرورش کے تمام اخراجات تو باپ پر، شرعاً

لازم کئے گئے ہیں) بعید نہیں کہ عدالت کے تازہ فیصلہ کا یہ حصہ اسلامی قانون سے لیا گیا ہو ورنہ کم سے کم اسلامی قانون سے واقف ومتأثر ہونے کا نتیجہ ضرور معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ شاہ بانو کیس کے بعد، پارلیمنٹ میں مسلم عورتوں کے تحفظ کے بارے میں بنائے گئے قانون میں یہ صراحت موجود ہے کہ بچہ کے باپ پر ہی بچہ کے تمام اخراجات لازم ہوں گے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور اس بیوی سے اس کا چھوٹا بچہ ہے (یا کئی چھوٹے بچے ہیں) تو شریعت اسلامی کی رو سے یہ مطلقہ عورت، بچہ کے لڑکا ہونے کی صورت میں تقریباً سات سال کی عمر تک اور لڑکی ہونے کی صورت میں اس کے بالغ (جوان) ہونے تک، بچہ کی پرورش کرنے کی حقدار ہوگی، یعنی اگر وہ اس کے لئے تیار ہوتی ہے تو دوسری کوئی عورت یا مرد حتیٰ کہ بچہ کا باپ بھی، اس کا یہ حق جبراً نہیں لے سکتا۔

پھر لطف یہ ہے کہ نہ صرف بچے کی پرورش پر ہونے والے تمام اخراجات بچہ کے باپ پر لازم ہوں گے بلکہ ماں (جسے چاہے بچہ کے باپ نے طلاق دے دی ہو) کے اخراجات بھی باپ پر ہی ہوں گے، اگر وہ مطلقہ بچہ کی پرورش کے لئے اپنے کو فارغ رکھتی ہو (یعنی کسی دوسرے سے نکاح نہ کرلے) قانونِ شریعت یہ بھی ہے کہ لڑکے کے کمانے کے قابل (بالغ) ہونے تک اور لڑکی کا نکاح ہونے تک سارا خرچ باپ کے ذمہ ہے، شریعت کے یہ احکام اسلامی شریعت (فقہ) کی تمام قابل ذکر کتابوں میں ملتے ہیں، مثلاً دیکھئے: علامہ ابن عابدین شامی (م: ۱۲۵۲ھ) کی فقہ پر سب سے زیادہ مشہور اور معتمد کتاب ردالمحتار جلد ثانی (باب النفقہ)، بچوں کے اخراجات باپ پر لازم ہونے کی سب سے اہم دلیل قرآن مجید کی آیت ''**وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف**'' ہے۔ (البقرۃ: ۲۳۳)

چوتھی صدی ہجری کے ایک مایہ ناز محقق ومفسر وفقیہ عالم علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ (م: ۳۷۰ھ) نے تو قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ آیت: ۲۳۳ ''**والوالدات یرضعن**

اولادھن الخ'' کی تفسیر میں صراحت کی ہے کہ آیت کا اصل مقصد ومطلب، دودھ پلانے والی ماں کے اخراجات کا بچہ کے باپ پر لازم کرنا ہی ہے، خواہ بچہ کے باپ نے اسے طلاق دے دی ہو، (ظاہر ہے کہ بچہ کو دودھ پلانے والی عورت کے اخراجات کا باپ کے ذمہ لازم ہونا، بچہ کی پرورش کے اخراجات کی ہی کڑی ہے)۔

علامہ جصاصؒ فرماتے ہیں: شریعت اسلامی کے یہ قوانین کوئی ڈھکے چھپے نہیں ہیں؛ بلکہ قوانین شریعت سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والا بھی انھیں جانتا ہے، پھر معلوم نہیں کیوں اور کن اسباب و مصالح کی بناء پر عدالت کے موجودہ فیصلہ کو'' شریعت کی شکست'' اور'' یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی طرف ایک قدم'' قرار دیا جارہا ہے، ایسا کہنے یا سمجھنے والے اسلامی شریعت سے جہالت یا عداوت کا ثبوت دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ قوانین صرف فقہ کی عربی کتابوں میں ملتے ہوں، اُردو، ہندی یا مقامی اور علاقائی دیگر زبانوں میں نہ ہوں؛ کیوں کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے بعد سے تو اُردو ہندی میں بھی مختلف مسلم حلقوں واداروں، خاص طور سے بورڈ کی طرف سے مختلف زبانوں کے اندر بالخصوص شاہ بانو کیس کے بعد'' پرسنل لا'' (اسلام کے عائلی نظام) پر اتنا تعارفی لٹریچر شائع ہو چکا ہے کہ کم از کم کسی جویائے حقیقت کے لئے ناواقف رہنے کا کوئی معقول عذر باقی نہیں رہ گیا ہے، خود راقم کے قلم سے اس درمیان ایک مفصل کتاب '' معاشری مسائل'' (جس کے نصف درجن سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں) اور کئی کتابچے جن میں'' مسلم پرسنل لا اور عورت کے حقوق'' بھی ہے، نیز تقریباً نصف درجن مضامین، ملک کے مختلف موقر جرائد ورسائل میں اس موضوع پر شائع ہو چکے ہیں، جن میں لکھنؤ کا مشہور ومؤقر اخبار'' قومی آواز'' بھی شامل ہے، قومی آواز ۱۱، ۱۲؍جولائی ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں ایڈیٹوریل والے صفحہ پر راقم کا'' یونیفارم سول کوڈ اور مسلم پرسنل لا'' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون شائع ہو چکا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

شوہر سے علاحدگی کے بعد بھی، اگر وہ طلاق کے ذریعہ ہوئی ہے،

کچھ عرصہ تک (عدت کے دوران) نفقہ شوہر پر ہی رہتا ہے، اگر طلاق دینے والے شوہر سے مطلقہ کے بچے بھی ہیں تو جب تک وہ دودھ پینے یا پرورش ونگرانی کے لئے ماں کے محتاج رہیں گے اس وقت تک نہ صرف ان بچوں کا بلکہ انھیں دودھ پلانے (اورنگرانی کی غرض سے پابند رہنے) والی اس مطلقہ کا پورا خرچ بھی اسی (طلاق دینے والے) پر رہے گا، یہیں سے اس پروپیگنڈے کی تردید بھی نکل آتی ہے کہ'' مطلقہ عورت بچوں کو لئے ماری ماری پھرتی ہے، ہاں قانون شریعت سے ناواقفیت یا بےعملی کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوجائے تو اس میں قانون شریعت کوالزام دینا زیادتی ہوگی۔

☆ ☆ ☆

افغانستان کے واقعات سے
ذہنوں پر کیا کیا اثرات پڑے؟

قرآن مجید اور احادیث نبویہ نے پیش آنے والے واقعات، بالخصوص اہم واقعات سے عبرت حاصل کرنے کی طرف جگہ جگہ متوجہ کیا ہے، مثلاً یہود کی تباہی کے معجزانہ طور سے ظہور پذیر ہونے پر فرمایا گیا: ''**فاعتبروا یا اولی الابصار**'' اور ایسی احادیث نبویہ کا تو شمار بھی مشکل ہے جن میں اس پہلو کا ذکر آیا ہے، اس لئے یہ بات نہ صرف طبعی بلکہ شرعی بھی کہی جاسکتی ہے کہ واقعات، خواہ کہیں بھی اور کیسے بھی، پیش آئیں ان سے سبق لیا جائے اور فائدہ اٹھانے یا نقصانات سے بچنے کے لئے رہنمائی حاصل کی جائے، اس بارے میں ایک مؤمن کا نقطۂ نظر غیر مومن سے مختلف ہونا بھی فطری سی بات لگتی ہے (جس کے لئے قرآن وسنت سے ثبوت فراہم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ''عیاں راچہ بیاں'') لیکن بعض واقعات اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسے غیر معمولی قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ سوچنے کے انداز پر غیر معمولی اثرات ڈالتے ہیں، حتیٰ کہ پختہ سے پختہ مؤمن بھی ان سے شدید طور پر متاثر ہوجاتے ہیں، جس کی ایک مثال غزوۂ احزاب کی وہ تصویر ہے جو خود قرآن مجید نے پیش کی ہے (خاص طور پر یہ آیت: ''**وبلغت القلوب الحناجر وتظنون بالله الظنونا**'' اور سورۂ یوسف کی آخری آیت سے ایک آیت قبل ''**حتی اذا استیأس الرسل وظنوا أنهم قد كذبوا**'') اس تاریخی؛ بلکہ قرآنی حقیقت کی روشنی میں افغانستان کے واقعات سے ذہنوں پر اثرات مرتب ہونا اور ان سے سوچنے کے انداز پر فرق پڑنا نہ صرف مستبعد نہیں؛ بلکہ عین متوقع ہے۔

چوں کہ افغانستان کے واقعات کے دو رُخ ہیں (یا دو دور ہیں) اس لئے واقعات

کی اثر انگیزی کا بھی دو شکلوں میں نمایاں ہونا قرین قیاس اور ظاہر ہے، پہلے رُخ یا دور سے (جب کہ روس جیسی دنیا کی ''سپر پاور'' طاقت سپر سے گویا ''صِفر'' پر آگئی تھی) مؤمنانہ جذبات کو تقویت اور جہاد کی تاثیر کا یعنی عزت وبقاء کا ذریعہ ہونا جو مسلمانوں کے نزدیک پہلے ہی شک وشبہ سے بالاتر تھا، ''ترقی یافتہ'' اور ''روشن دماغی'' کے لئے شہرت یافتہ دنیا کے بھی بہت سے لوگوں نے تسلیم کرلیا (یا کم سے کم قابل اعتنا ہوگیا)۔

لیکن جب اس کے بالکل برخلاف نتائج افغانستان پر امریکی حملہ سے ظاہر ہوئے تو لگتا ہے کہ ذہنوں کا رُخ بھی بدل گیا اور سوچنے کا انداز بھی، رُخ کی یہ تبدیلی بعض ایسے لائق احترام اور قابل اعتماد شخصیتوں کی تحریروں سے بھی مترشح ہوتی معلوم ہوئی (یہ کہنا تو گستاخی ہوگی کہ واقعتاً رُخ بدل گیا) جنھوں نے اس سے قبل نازک مواقع پر اُمت کی راہنمائی کا نہایت ذہانت وجرأت اور مؤمنانہ بصیرت سے فریضہ انجام دیا کہ ڈگمگاتے قدم اور بھٹکتے ذہن سنبھل گئے اور فکر کی کجی سے بچ گئے۔

ذیل کے سطروں میں ایک ایسے ہی لائق وفائق شخص کی حال میں شائع ہونے والے کچھ مضامین (تحریروں) کا ایک سرسری جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے؛ تاکہ ان کی نہ صرف مفید بلکہ مفکرانہ تحریروں کے جو لوگ نہ صرف قائل بلکہ گویا ذہنی اسیر ہیں (جن میں راقم کا شمار بھی کیا جاسکتا ہے) ان کا ان ہی کی تازہ تحریروں سے جس فکری وعلمی خلجان کا شکار ہوجانے کا اندازہ ہوتا ہے ایک ہلکا سا عکس سامنے لے آیا جائے، پھر ہوسکتا ہے وہ خود اپنی رائے میں کچھ تبدیلی کرلیں یا خلجان دور کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

حال میں ''رُخ'' کی اس تبدیلی کا احساس پہلی بار موصوف کی اس تقریر سے ہوا جو انھوں نے اپنے وطن کے ایک دینی مدرسہ انجمن کی جامع مسجد میں کی، پھر وہ تحریری شکل میں مقرر کی نظر ثانی کے بعد ان کے تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی، جس سے یہ امکان نہیں رہا کہ تقریر کی رپورٹنگ غلط ہوئی یا اس میں فروگذاشتیں ہوگئیں۔

نوٹ: ''رُخ'' کی تبدیلی کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لئے سہولت کی خاطر الگ الگ عنوانات لگا کر بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

دُعاء کا استخفاف یا اس کی عدم اہمیت

یہ تقریر اس زمانہ میں ہوئی جب کہ بقولِ مقرر ’’افغانستان ایک مجنونانہ انداز کی بمباری سے خون میں نہا رہا تھا‘‘ رمضان کا زمانہ ظاہر ہے کہ دُعاؤں اور دیگر عبادات کے ذریعہ خدا سے قرب حاصل کرنے میں جو امتیاز رکھتا ہے وہ کسی مسلمان پر مخفی نہیں، مگر موصوف نے مسلمانوں کے اس محمود عمل کو جس پیرایہ میں بیان کیا ہے اس سے پسندیدگی نہیں؛ بلکہ ایک طرح کی ’’ناپسندیدگی‘‘ کا تاثر قاری لے سکتا ہے، موصوف کے الفاظ ہیں :

> مسجدیں البتہ دُعاؤں سے آباد تھیں اور انھیں میں فریادی جذبات کو بھی نکاسی کی راہ مل رہی تھی۔(۱)

’’نکاسی کی راہ مل رہی تھی‘‘ کی تعبیر کی اصل روح سے مقرر احقر سے یقیناً زیادہ واقف ہیں کہ اس میں نادانستہ سہی دُعاء کا احترام نکل رہا ہے یا بے احترامی؟

اس تعبیر سے بھی زیادہ دُعاء کی بے قیمتی یا بے وقتی کا اندازہ اسی تقریر کے ایک اور حصہ سے بھی ہوتا ہے جس میں بابری مسجد گرائے جانے کے سانحہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے ’’......اس کے سوا اگر ہم کچھ کر سکے تو یہ کر سکے کہ مسجدوں کی طرف پلٹ پڑے کہ اللہ سے فریاد کریں اور مدد مانگیں‘‘ (ص:۲۰) کیا مضمون نگار کا بڑا سے بڑا عقیدت مند بھی مذکورہ عبارت سے اس کے علاوہ اور کوئی تأثر لے سکتا ہے کہ مقرر کے نزدیک ’’مسلمانوں کا مسجد کی طرف پلٹ پڑنا اور اللہ سے فریاد کرنا اور مدد مانگنا‘‘ ایک غیر مفید بلکہ ناگوار اقدام ہے جس کے مسلمان مرتکب ہوئے (احقر یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ واقعتا مقرر کا نظریہ ہی یہ ہو گیا ہے، کہنا یہ ہے کہ الفاظ کیا بتا رہے ہیں؟) الفاظ سے ظاہر ہونے والا ذہن کیا کسی ایسے مومن کا ہو سکتا ہے جس نے قرآن مجید میں بار بار دُعاؤں کی اہمیت پر زور اور سب کچھ اللہ سے مانگنے کے حکم پر مبنی آیات پڑھی ہوں، نیز ہزار احادیث قولی وفعلی میں دُعاؤں کی اہمیت وضرورت کا تذکرہ پڑھا ہو اور ’’**لا حول ولا قوۃ الا باللہ**‘‘ پر جس کا ایمان ہو!

(۱) الفرقان: ۱۷، اشاعت فروری ۲۰۰۲ء۔

مسجد والے اعمال نیز علوم دینیہ کا استخفاف اور عصری علوم کی ان پر ترجیح

اسی تقریر میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ وہ ایک علوم دینیہ کے مدرسہ کی مسجد میں کی گئی، جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم عصریہ ہی گویا علوم ہیں؛ بلکہ علوم دینیہ کا ایک درجہ میں استخفاف بھی نکلتا محسوس ہو رہا ہے، (ذہن میں پھر یہ بات تازہ کر لیجئے کہ یہاں گفتگو تقریر کے الفاظ سے نکلنے والے مطلب کے بارے میں ہو رہی ہے، ویسے یہ بھی واقعہ ہے کہ مقرر اپنے حسن تعبیر اور قدرت قلم کے لئے حجت کا درجہ رکھتے ہیں) اور ستم بالائے ستم یہ کہ ایک دینی مدرسہ میں بیٹھ کر یہ سب کہا گیا، تعجب اس پر بھی ہے کہ کسی نے اگر بروقت نہیں ٹوکا تھا تو بعد میں بھی ادب کے ساتھ ہی سہی توجہ دلانے کی جرأت کیوں نہیں کی اور ایسے شخص کو جس کا عمر بھر نہ صرف یہ ’’قال‘‘ رہا، بلکہ ’’حال‘‘ بھی کہ نامناسب بات پر اکثر خاموش نہیں رہ سکا ہو متوجہ بھی نہیں کیا گیا، اس صراحت پر تو سر پیٹ لینے کا جی چاہا بلکہ ماتم کرنے کا، کہ ’’مسجد کے منتظم......کی فرمائش ہوئی کہ قلم بند (اس تقریر کو) کیا جائے اور اشاعت ہو۔ **(فیاللعجب!)**

ہاں تو ذکر دینی مدرسہ میں تقریر کا چل رہا ہے جس میں یہ بھی کہا گیا ’’آج کی دنیا میں جس قوت کی خاص طور پر حکمرانی ہے وہ علم ہے، ہمارے نوجوانوں نے اس موقعہ پر گولیاں کھانے کے لئے سینے تو بڑی تعداد میں کھول دیئے، مگر وہ کتنے تھے جنھوں نے اسکولوں کالجوں میں دوسروں سے آگے بڑھنے اور علم کے میدان میں کچھ بننے پر کمر باندھی ہے‘‘ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مقرر کی یہاں مراد ’’علم‘‘ سے وہی ہے جو اسکولوں وکالجوں میں حاصل ہوتا ہے۔

آگے مزید صراحت کے ساتھ کہتے ہیں ’’یہ جو دنیا میں اس وقت کچھ ملکوں نے وہ طاقت حاصل کر رکھی ہے...... یہ دنیاوی علوم کے بعض میدانوں میں ان کی محنت وسبقت کا نتیجہ ہے، کیسے افسوس کیا جائے کہ ہندولڑکے حکمراں اکثریت کے بیٹے ہونے کے باوجود حصول علم کی جدوجہد میں، ہمارے لڑکوں سے عموماً بہت آگے ہوتے ہیں......الغرض اس بے بسی سے نکلنا اگر مقصود ہے تو اللہ سے تعلق بڑھانے والے اعمال کے ساتھ ہمیں اس کی فکر کرنی

ہوگی کہ ہمارے بچے ضروری دنیاوی علوم کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔(ص:۲۱)

یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ باتیں جن کا اس تقریر میں مشورہ بلکہ کہئے کہ حکم دیا گیا ہے وہ فی نفسہ اہمیت کی حامل ہیں یا نہیں، کہنا یہ ہے کہ جس محل (مسجد و مدرسہ) میں کہی گئیں ہیں اس میں کہے جانے کا مطلب ایک عام وسادہ ذہن کا شخص اس کے سوا کیا لے گا کہ مسجد و مدرسہ والے اعمال سے بڑھ کر یہ باتیں ہیں، جن کا وہ مشورہ دیا جارہا ہے، اس طرز سے کیا مسجد و مدرسہ کے کاموں (عبادات و دینی تعلیم) کی بے وقعتی، کم قیمتی یا استخفاف کا تأثر سامع کا ذہن قبول کرلے تو کیا اسے بے جا ٹھہرایا جاسکے گا؟

حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ دنیاوی علوم کے حصول کی بات آج سے نہیں مدتوں سے، خاص طور سے سرسید کے زمانہ سے اس زور وقوت کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ اس کی اہمیت وافادیت سے کوئی جاہل بھی ناواقف نہیں، البتہ دینی علوم اور مسجد والے کاموں سے دوری بلکہ مہجوری اور ان کی بے وقعتی یا کم قیمتی کی سوچ برابر بڑھ رہی ہیں، اگرچہ غالباً برائے بیت خدا سے تعلق کی بات بھی تقریر میں آگئی ہے، مگر پوری تقریر کا رنگ وآہنگ جس کا پتہ دے رہا ہے، اس کی موجودگی میں یہ نصیحت (خدا سے تعلق کی) کسی دل میں جگہ کہاں کرسکی ہوگی؟

مسجد میں کی گئی اس تقریر کا ایک جز اور پڑھ لیجئے، ''افسوس کہ ہمیں جب دنیا کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور ناطاقتی کا کوئی سخت تجربہ ہوتا ہے تو بس اتنا کرتے ہیں کہ مسجد کی طرف دوڑ پڑیں اور سمجھتے ہیں کہ سب ٹھیک ہوجائے گا''۔(ص:۲۱)

ذرا جی کڑا کر کے ایک عبارت اور پڑھ لیجئے'' نماز، روزہ تو طہارت وتزکیۂ نفس اور روحانی قوت عطا کرنے والی چیزیں ہیں، اس سے مغفرت ہوگی، جنت ملے گی، مگر دنیا میں عزت وقوت دنیاوی اسباب اپنے حالات کے مطابق اختیار کئے بغیر نہیں مل سکتی''۔(ص:۲۱)

ان جملوں کے تیکھے پن پر جو غور کرے گا تو وہ کیا ان میں اور قرآنی آیات نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واقوال سے ثابت ہونے والے اسوۂ حسنہ (مثلاً: ''اذا

حزبه أمر صلي''(۱) '' انما اشكو بثي وحزني الى الله''(۲) نیز'' اللهم ألجأت ظهري اليك'' '' اشكو بثي وحزني اليك لا ملجأ ولا منجأ الا اليك استغفرك'' اور ان جیسی سینکڑوں احادیث) کے درمیان کھلا تضاد نہیں پائے گا۔

مادی اسباب پر ضرورت سے زیادہ تکیہ

اوپر جو اقتباسات پیش کئے گئے وہ ہند کے ایک دینی مدرسہ کی جامع مسجد کے اندر رمضان المبارک کے مقدس مہینہ اور روح کو پاکیزہ کردینے والا موسم گذرنے کے متصل بعد کئے گئے برجستہ خطاب کے تھے، آئندہ سطروں میں مادی چمک دمک سے خیرہ ہوجانے والی فضا کے اندر لکھے گئے مضمون سے نقل کئے جارہے ہیں، مسجد کے نورانی ماحول میں زبانی ارتجالی خطاب کا جب وہ رنگ ہے تو پھر تعجب نہ ہونا چاہئے اس کے بالکل معکوس، بالکل متضاد ماحول میں اطمینان سے لکھے گئے مضامین کا یہ آہنگ ہو:

> جب چچا ابوطالب انتقال فرماگئے......تب آپ صرف اس بات کے بھی طالب ہوئے کہ کوئی قبیلہ آپ کو اسی طرح کی اپنی حفاظت میں لے کر اپنے ساتھ لے جائے، جیسی حفاظت آپ کو خواجہ ابوطالب کی سرپرستی میں حاصل تھی......اللہ اکبر، اللہ کا محبوب نبی اللہ کے دین کی دعوت جاری رکھ سکنے کے لئے اسی طرح غیر اللہ کی حفاظت کا طلب گار بنایا جارہا ہے، جیسے کسی دنیاوی مشن کے لئے صاحب مشن کو اگر ضرورت ہوگی تو وہ یہ کرے گا۔(الفرقان:۵، جولائی ۲۰۰۲ء)

مذکورہ بالا عبارت غور کے ساتھ پڑھئے خاص طور سے'' اللہ اکبر'' کے بعد والی عبارت، اس موقعہ پر تو'' اللہ اکبر'' کا اس جگہ استعمال ایسا لگتا ہے کہ جیسے خود اللہ تعالیٰ کے

(۱) ترمذی، کتاب الدعوات:۳۳۹۔ (۲) ترمذی، کتاب الصلوٰة:۱۳۱۹۔

ساتھ استہزاء کرنے کے لئے کیا جارہا ہو؛ کیوں کہ بعد والی عبارت تو صاف بتارہی ہے کہ اللہ کی مدد دعوت دین کے لئے بھی کافی نہیں؛ بلکہ ''غیر اللہ کی حفاظت'' اس کے لئے بھی ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جس طرح کی دنیاوی مشن کے لئے حالاں کہ دعویٰ یا نعرہ تو اللہ کی بڑائی کا تھا، مگر ''دلیل'' بتارہی ہے کہ ''غیر اللہ'' بڑے ہیں، (تب ہی تو ان کی حفاظت کا طلب گار بنایا جارہا ہے) معلوم نہیں کہ مادی آسائش وآلات کی بہتات کے ماحول نے موصوف کو اپنی عبارت کے منطقی نتیجہ پر غور کرنے کا موقعہ دیا بھی یا نہیں؟

عبارت بالا پر اس سے زیادہ کچھ کہنے یا مزید تبصرہ کی ضرورت کسی صاحب نظر کے واسطے نہیں معلوم ہوتی، زیر نظر مضمون کی ''خشت اول'' ہی یوں رکھی گئی ہے، ''اس دنیا میں کامیابی یا ناکامی کے اُصول وقوانین ہر کسی کے لئے یکساں ہیں، مؤمنین کو کامیابی حاصل کرنا ہو تب اور غیر مؤمنین اس کے خواہاں ہوں تب، دونوں کو ان ہی قوانین کی راہ سے گذرنا ہوگا۔ (ص:۳)

جس دیوار کی خشت اول ہی ایسی ہو، غور کیجئے کہ وہ بلندی تک جاتے جاتے کس طرف جھکے گی اور کہاں پہنچے گی، آیت: ''**لیظھرہ علی الدین کلہ**'' نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں ''حضرت حق کا یہ مبارک ارادہ بھی ان تمام اسبابی مراحل سے گذر کر ہی تکمیل کو پہنچا جو اسباب اس دنیا میں انجام پانے والے کاموں کی تقدیر بنادیئے گئے ہیں''۔ (ص:۳)

(قرآن مجید واحادیث کے علاوہ) تاریخ اسلام بالخصوص ابتدائی دور (خیر القرون) کا ورق ورق اس دعوے کی تردید (بلکہ شاید ''تکذیب'' کہنا زیادہ صحیح ہو) کرتا ہے، اس مضمون میں بکثرت ایسی عبارتیں آئی ہیں جو مؤمنانہ جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور اسباب پر سارا دارومدار بتانے میں مذکور عبارتوں کے ہم معنی ہیں، ہم نے بغرض اختصار صرف ان دو پر اکتفاء کیا۔

خدا جانے موصوف کے ذہن سے وہ کثیر آیات اور بے شمار احادیث کیوں محو ہوگئیں (یا ذہول ہوگیا) جن میں بار بار سربلندی اور کامیابی کی شرط تقویٰ، خدا کا خوف،

معصیت سے گریز، مدد خداوندی اور پکا مؤمن ہونا بتایا گیا ہے، ان کے حوالے دینا، وہ بھی موصوف جیسے مطلع عالم کے لئے بالکل غیر ضروری بلکہ ''زائد'' سی بات لگتی ہے، بس نمونہ کے طور پر ایک آدھ کا ذکر شاید نامناسب نہ سمجھا جائے...... ''**اَنْتُمُ الأعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ**'' (آلِ عمران) دیکھئے سربلندی کی شرط ''مؤمن'' ہونا بتائی گئی نہ کہ ''اسبابی مراحل سے گذرنا'' اہل علم پر مخفی نہیں کہ یہ آیت غزوۂ اُحد کے موقع پر اس میں بعض شرکاء کی غلطی پر تنبیہ کے سیاق میں نازل ہوئی، اس کے بعد ہی ''**وتلک الایام نداولھا بین الناس**'' ہے، جس میں اگرچہ ایک واقعاتی حقیقت بتائی گئی ہے، کہ ہمیشہ سب کے دن یکساں نہیں رہتے کبھی فتح کبھی شکست، کبھی اچھے کبھی برے دنوں سے سابقہ رہتا ہے (گویا بتایا گیا کہ زبان خلق پر چڑھا ''کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں'' والا محاورہ سامنے رہے) اس لئے دل شکستہ اور حوصلے پست کرنے کی ضرورت نہیں، اس میں درحقیقت تسلی کا سامان وپیغام ہے، جیسا کہ ''اُحد'' کے شرکاء کے لئے بہت سی آیات میں ہے، مگر ہمارے محترم مضمون نگار کو اس میں بھی اسباب والے قانون کی ''یاددہانی'' اور تائید نکلتی نظر آئی، جو آج تک نہ کسی قابل ذکر مفسر، محدث وفقیہ، بلکہ مؤرخ کو بھی شاید نظر نہیں آسکی تھی، صحیح کہا گیا ہے کہ ذہن ودماغ میں جو کچھ بسا ہوتا ہے وہی خارج میں بھی دکھائی دینے لگتا ہے، جیسا کہ خاص رنگ کے شیشہ والی عینک لگالی جائے تو شیشہ کے رنگ ہی میں ہر چیز رنگی نظر آتی ہے، کیا وہ مشہور بات بھی موصوف کے حافظہ میں نہیں رہی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لشکر کو روانہ کرتے وقت جو ہدایات دیتے تھے۔

ان میں خاص ہدایت یہ ہوتی تھی کہ یہ معلوم ہے کہ دشمن تم سے ہر اعتبار (عِدہ اور عُدہ میں بڑھا ہوا ہے؛ البتہ صرف تمہارے پاس ایک ہتھیار ہے جو ان کے پاس نہیں، اسی سے تم جیت سکتے ہو وہ ''تقویٰ'' ہے اگر تم اس ہتھیار سے خالی ہوگئے تو نتیجہ معلوم (شکست یقینی) اسی طرح کا عمر بن عبدالعزیزؒ فوج کے سپہ سالار کو ہدایت فرمایا کرتے تھے اور تقویٰ کی تلقین کیا کرتے تھے، قرآن مجید میں متعدد جگہ دُعائے مغفرت (استغفار) کے ساتھ طلب فتح ونصرت

کو وابستہ کیا گیا ہے، (۱) نہ کہ ہتھیاروں کے ساتھ، یہ بھی قرینہ ہے فتح ونصرت خداوندی گناہوں کے ساتھ نہیں ملتی، یہ قانون مسلمانوں کے لئے تھے دوسروں کے لئے نہیں۔

خود ''اُحد'' کی اس صورتِ حال، جسے بعض نے شکست سے بھی تعبیر کیا ہے کے پیش آنے کی اصل وجہ قرآن کریم نے ''عصیتم'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی(۲) خواہ وہ دانستہ یا اجتہادی غلطی کے نتیجہ میں ہی سرزد ہوئی) قرار دی، (ہتھیاروں کی کمی یا جبل الرماۃ سے ہٹنا وغیرہ نہیں بتائی گئی، یہ صراحت خود ''فتح وشکست کا اسلامی اصلی ہتھیار'' کیا ہے، جاننے کے لئے کافی ہے؛ بلکہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور (خیر القرون میں) ہر جنگ کے اندر مسلمان مادی اسباب کے لحاظ سے بہر طور کمتر رہے، مگر اسی ایک ہتھیار، (تقویٰ اللہ) کی بنا پر کامیابیوں نے قدم چومے، اگر کبھی پیچھے ہٹنا بھی پڑا تو وقتی جنگی مصلحت (اسٹراٹیجی) کی بنیاد پر، نہ کہ بطور شکست، جیسا کہ موصوف نے اپنے اسی مضمون میں غزوۂ موتہ پر مختصر لکھے نوٹ سے تاثر دینے کی کوشش کی ہے (یا ان کے قلم سے نکلی عبارت سے مترشح ہورہا ہے) جس سے جانبازوں کے جذبۂ شہادت کا استخفاف بھی نکلتا ہے؛ حالاں کہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے موتہ کی طرف لشکر کی روانگی کے وقت ہی لشکر کے (یکے بعد دیگرے) سرداروں کی تعیین سے ان کی شہادت کی طرف اشارہ کردیا تھا؛ چنانچہ عام سیرت نگاروں کی تصریح کے مطابق جب لشکر واپس مدینہ پہنچا تو ان پر فرار (بھگوڑوں) کی پھبتی کسنے والوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تردید فرمائی، اس کے بجائے انھیں ''کرار'' (دوبارہ پلٹ کر حملہ کرنے والا) کا تعریفی لقب دیا۔

(۱) مثلاً سورہ بقرہ کی آخری آیت میں ہے: ''واعف عنا واغفرلنا ...... فانصرنا علی القوم الکافرین ......'' اور سورۂ آلِ عمران میں ہے: ''ربنا اغفرلنا ذنوبنا ...... وانصرنا ...... الخ''۔

(۲) یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ حکم کی خلاف ورزی کرنے سے پہلے یہی جماعت اپنی تعداد سے کہیں زیادہ بڑی

تعداد سے لیس قوم پر معمولی ہتھیاروں سے ہی خدا کی مدد سے غالب آچکی تھی، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ''اذتحسونهم باذنه'' سے کیا گیا ہے۔

بلکہ مشہور ابتدائی تذکرہ نگار ابن سعد نے تو یہ بیان کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید جب امیر لشکر بنے تو انھوں نے مسلمانوں کے باقی ماندہ لوگوں کو اکٹھا کرکے قوم (کفار) پر ایسا حملہ کیا کہ وہ (قوم کفار) بدترین شکست سے دوچار ہوئے۔

فأخذ خالد اللواء ثم حمل على القوم فهزمهم الله أسوأ هزيمة مارأيتها قط حتى وضع المسلمون أسيافهم حيث شاؤا ۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن رواحہ نے غزوۂ موتہ کے موقع پر جو تقریر کی وہ اسلامی ہدایات وتعلیمات کا آئینہ دار تھی، انھوں نے فرمایا:

يا قوم ما نقاتل الناس بعدد ولا قوة ولا كثرة ، ما نقاتلهم الا بهذا الدين الذى أكرمنا الله به ، فانطلقوا ، فانما هى احدى الحسنيين ، اما ظفر واما شهادة ، فمضى الناس ۔ (۲)

حالاں کہ مضمون نگار نے ان کی تقریر کے حوالہ سے صرف ''شهادة'' کی بات نقل کی ہے ''ظفر'' کی نہیں۔

اور یہ بات کہ مسلمان (خیر القرون میں اور اس کے بعد بھی جہاد کے مواقع پر) اسباب کے لحاظ سے فریق مخالف (کفار) کے مقابلہ میں ہمیشہ کمتر رہے، ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس کا اقرار دوست و دشمن سب کرتے ہیں، مولانا شبلیؒ جیسے روشن خیال اور جدید فکر کے مصنف نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الفاروق'' میں اسلامی فتوحات (بالخصوص فارس، جو اس وقت ایک بڑا امپائر تھا کی فتح) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اسلامی فتوحات کی بوالعجبی نے بھی اس خیال کو قوت دی، یہ واقعہ

(۱) السیرۃ النبویۃ من الطبقات الکبریٰ لابن سعد:۲/۱۳۰۔

(۲) زاد المعاد:۳/۳۸۲،ذکرغزوہ موتہ۔

> کہ چند صحرا نشینوں کے آگے بڑی بڑی قدیم اور پرزور قوموں کا قدم اکھڑ جاتا ہے خوش اعتقاد قوموں کے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے گروہ کے ساتھ تائید آسمانی شامل ہے، فارس کے معرکہ میں جب پارسیوں کا ایک مشہور بہادر بھاگ نکلا اور سردار فوج نے سزا دینی چاہی تو اس نے ایک بڑے پتھر کو تیر سے توڑ کر کہا یہ تیر بھی ان لوگوں پر اثر نہیں کرتے خدا ان کے ساتھ ہے اوران سے لڑنا بے کار ہے، عرب نے جب تیراندازی شروع کی تو ہم نے تیروں کو دیکھ کر کہا کہ ''تکلے'' ہیں۔(۱)

تعجب ہے کہ ایک مشہور عام غلط فہمی جو آیت ''**وأعدوا لهم ما استطعتم**'' سے ہوتی ہے اس کا شکار موصوف بھی ہو گئے معلوم ہوتے ہیں کہ آیت سے ''کفار کی برابری کی قوت وتیاری'' کا مفہوم لیتے ہیں؛ حالاں کہ ''**ما استطعتم**'' کا لفظ (جسے عربی کی تھوڑی بہت بھی شد بد ہے وہ جانتا ہے) آسانی کے ساتھ تیاری کیائے جانے والے اسباب کا پتہ دیتا ہے (''استطاع'' اور ''أطاق'' کا فرق اہل علم پر مخفی نہیں) ایسی تیاری عبادات کے لئے بھی مطلوب ہے، چنانچہ قرآن مجید میں حج کی فرضیت کے لئے ''**من استطاع الیہ سبیلا**'' بطور شرط کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ کون لیتا ہے کہ آخری درجہ کی تیاری؟ معمولی تیاری اور معمولی اسباب بھی بیت اللہ تک پہنچنے کے میسر ہوں تو حج فرض ہوجائے گا نہ کہ خوب آرام وآسائش کے اسباب مہیا ہونے پر۔

آخری بات

یوں تو زیر بحث مضمون میں بہت سی باتیں قابل نقد ونظر ہیں، ان سب پر کلام کیا جائے تو بہت طویل ہوجائے گی (جس کی نہ احقر کو فرصت نہ غالباً رسالہ کے صفحات میں

گنجائش) اگر ناگریز ہوگیا تو بقیہ پر بھی کلام کرنے کی گنجائش نکالی جاسکے، آخر میں صرف

(۱) الفاروق:۲/۹۹۔

ایک اور بات (گویا ''**بیت القصید**'' کا درجہ حاصل ہے) کی طرف متوجہ کرکے اپنی گذارشیں ختم کردینے کا ارادہ ہے، وہ ہے افغانستان پر حملہ کا سبب، جسے امریکہ اوراس کے ہم نواؤں نے اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' پر حملہ قرار دیا ہے، حالاں کہ اب یہ بات دوست ودشمن سب پر عیاں ہوچکی ہے کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا، اصل مقصد یا مقاصد، اس کے علاوہ ہے (جس پر سے بھی اب پردہ اُٹھ چکا ہے) مگر ہمارے محترم مضمون نگار صاحب غالباً امریکی الزام کو ہی درست باور کررہے ہیں یا باور کرنے کے مفروضہ پر ہی یہ مضمون لکھا ہے، مزید ستم یہ کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر افغانستان ''اسامہ'' کو پناہ نہ دیتا یا امریکہ کے مطالبہ پر اس کے حوالہ کردیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا! اگر افغانستان نے حوالہ نہیں کیا تھا تو اسامہ خود ہی جرأت کا ثبوت دے کر اسلامی تاریخ میں نام پالیتے (حالاں کہ دنیاوی نام ونمود کا خیال اسامہ اوران کی جماعت کے طرز سے میل نہیں کھاتا) اس پر کیا کہا جائے، البتہ (غالباً عمر میں پہلی مرتبہ) موصوف کے بارے میں ''سادہ مزاجی'' جیسے الفاظ استعمال کرنے کی جرأت کی ضرورت محسوس ہورہی ہے، ورنہ اس جیسے مواقع ہمیشہ ان کی تحریروں سے نہ صرف روشنی حاصل کی ہے؛ بلکہ رہنمائی بھی، مگر نہ جانے کیا اسباب بنے، موصوف سمجھ رہے ہیں (یا ظاہر کررہے ہیں) کہ ''اسامہ'' امریکہ کے حوالے کردیا جاتا تو یہ المیہ ٹل جاتا! ایسی بات جسے بچکانی ہی کہا جاسکتا ہے، موصوف سے اتنی بعید لگتی ہے جیسے زمین سے آسمان! بجز حیرت وافسوس کے اور کیا کیا جائے! اس پر مستزاد یہ کہ ''ابوجندل'' کے کردار کا حوالہ دے دیا گیا، جس سے کوئی ادنی درجہ کی بھی مماثلت ہی نہیں، ابوجندل کو ایک معاہدہ کی شرط کے بطور مکہ میں (ان کی شدید خواہش کے علی الرغم) رہنے دیا گیا تھا (جس کے لئے اللہ نے خلاصی کی ایک اور راہ ان کے اخلاص اور وفائے عہد کے

طفیل کھول دی تھی) یہاں نہ کوئی معاہدہ تھا نہ اس جیسی کوئی اور چیز ،جس کا تقاضہ وہ بس صرف ایک سپر پاور کی ضد تھی عراق کے مسئلہ سے یہ بات اور کھل گئی ، کیا ایسی صورت میں اسامہ کو تختہ مشق بنوانے کے لئے امریکہ کے سپرد کرنا ، حدیث نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) ’’المسلم اخو المسلم لایظلمه ولا یسلمه ‘‘(۱)وفی روایت ’’لا یخذله ولا یحقره ‘‘(۲) کی صریح خلاف ورزی نہ ہوتی اور حکم نبوی کے خلاف ورزی کرکے اور زیادہ مصیبتوں اور دینی ودنیاوی کا خطرہ مول نہ لے لیتے !

☆ ☆ ☆

(۱) بخاری ، کتاب المظالم،حدیث نمبر:۲۴۴۲،مسلم ، کتاب البر والصلة:۶۵۴۱۔

(۲) مشکوٰۃ :۲/ ۴۲۲، بحواله بخاری و مسلم۔

اصل مسئلہ نقشۂ کار کا نہیں افرادِ کار کا ہے

سوال:- حالیہ اجلاس پرسنل لا بورڈ کس حد تک کامیاب رہا اور اس قدر بڑے پیمانہ پر منعقدشدہ اجلاس کے اثرات مقامی طور پر کیا مرتب ہوئے؟

جواب:- مسلم پرسنل لا بورڈ کا حالیہ اجلاس احمد آباد منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۵ء فی الحقیقت انتخابی اجلاس تھا جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے تمام عہدیداروں (بشمول ۱/ صدر، ۴/ نائبین صدر، ۴/ سکریٹری، ۱/ خازن اور ۴۵ رکنی مجلس عاملہ نیز ۴۹ میقاتی ممبران) کی مدت عہدہ ختم ہوچکنے کے بعد نئے سرے سے تمام عہدیداران کا انتخاب کرنا اصل کام تھا ، یہ کام نہایت نازک اور اہم تھا ، مگر خدا کے فضل وکرم اور اس کی مدد سے نہایت خوش اُسلوبی اور بغیر کسی خاص اختلاف کے انجام پا گیا (فالحمد للہ علی ذلک) حالاں کہ ان جیسے مناصب کے لئے بسا اوقات تنظیموں اور جماعتوں میں نزاعات واختلافات ہونے اور بعض دفعہ جدال وقتال کی نوبت آجانے کے واقعات بھی نادر نہیں ہیں، اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ اجلاس سابقہ اجلاسوں کی طرح بلکہ بعض اعتبار سے ان سے بھی بڑھ کر بہت کامیاب رہا ، اجلاس اور بورڈ کی سب سے بڑی خوش نصیبی اور کامیابی یہ ہے کہ اس بار بھی اسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی صدارت وقیادت کا شرف حاصل رہا، حالاں کہ اس بار مولانا مدظلہ نے صحت ومشاغل نیز ضعف کی بنیاد پر معذرت فرمانے کا ارادہ

کیا تھا، مگر ہم خوردوں کی درخواست قبول فرما کر بورڈ کی صدارت قبول کرنا منظور فرمالیا، علاوہ ازیں شرکاء کی تعداد اور مسلمانوں کے مختلف الافکار والعقائد نمایاں افراد کی شرکت ونمائندگی اگر کسی اجلاس کے لئے معیار کامیابی ہوسکتی ہے تو اس معیار سے بھی یہ اجلاس بے حد کامیاب رہا کیوں کہ ایسی کامیابی شاید ہی کسی اور تنظیم یا جماعت کے اجلاس کے حصہ میں آئی ہو یا آتی ہو! پھر ایسے مختلف بلکہ متضاد، افکار کے حامل لوگوں کا متفقہ طور پر (یا قریب باتفاق کے درجہ میں) نتائج اور فیصلوں تک پہنچنا اجلاس کی نمایاں کامیابی کی مزید علامت ہے۔

اجلاس کے بہت سے اچھے اثرات ملکی اور مقامی طور پر صاف محسوس کئے گئے، مثلاً ایسے صوبہ میں کہ جہاں مسلم دشمن پارٹی (بی جے پی) کی حکومت ہو اور جس جگہ کے مسلمان آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے شکار بن کر جان و مال کی تباہیوں سے دوچار ہوتے رہتے ہوں، وہاں ان کا مزید حوصلہ بلند ہوا، ان کے اندر سے احساس کمتری اگر تھا تو نکل گیا اور خود اعتمادی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس سے آئندہ ایسے مفید و جرأت مندانہ اقدامات کرنے کے لئے ان میں مزید حوصلہ پیدا ہونے کی قوی اُمید ہے، جو پہلے ہی سے دینی جذبات وخدمات میں ممتاز رہے ہیں، جس کا اظہار اس اجلاس کے موقعہ پر بھی ہوا۔

سوال:- اجلاس احمد آباد میں کونسے اہم اور قابل ذکر فیصلے کئے گئے؟

جواب:- جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، قابل ذکر اور اہم فیصلوں میں بورڈ کے ذمہ دارانہ عہدوں کے لئے صحیح اور اہل افراد کے انتخاب کا فیصلہ ہے، نیز ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منانے کا بھی فیصلہ — اس کے تفصیلی نقشہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''اہم فیصلہ'' کہے جانے کا مستحق ہے۔

سوال:- ایک خیال یہ بھی ہے کہ یکساں سیول کوڈ کی بات کرنے والوں کے سامنے مسلم پرسنل لا کی نافعیت اور افادیت کو پیش کیا جائے تا کہ اس طرح یونیفارم سیول کوڈ میں ان

اسلامی قوانین کو بھی شامل کر لینے کی ایک صورت پیدا ہو جائے، اس نظریہ کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب:- اس سوال کے پہلے حصہ کا جواب اب سے تقریباً بیس سال قبل یعنی بورڈ کے قیام سے کوئی دو سال بعد ہی راقم الحروف نے اپنی کتاب ''معاشرتی مسائل'' کے مقدمہ میں دے دیا ہے؛ بلکہ یہ پوری کتاب ہی اس سوال کا گویا علمی یا قلمی جواب ہے (تفصیل تو اس کتاب میں دیکھنی چاہئے) مختصر یہ کہ یہ کام نہایت ضروری اور بورڈ کے قیام کے بنیادی اغراض و مقاصد میں شامل رہا ہے کہ شرعی قوانین (بالخصوص وہ عائلی قوانین جنھیں سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے) کو اپنی اصل شکل میں ایسے اُسلوب کے اندر جس میں موجودہ ذہنوں کی رعایت ہو، پیش کیا جائے تو منصف مزاج اور حقیقت پسند تمام لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، انشاء اللہ — بحمد للہ مذکورہ کتاب اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہی اور اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ مختصر عرصہ میں ہندوپاک کے اندر اس کے نصف درجن ایڈیشن (جن میں تین چار ایڈیشن ''مجلس تحقیقاتِ شرعیہ'' ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں) کا شائع ہو جانا معلوم ہے (غیر معلوم کتنے ہیں ان کی تعداد اللہ علیم ہی جانتا ہے)۔

اس سوال کے دوسرے حصہ (اسلامی قوانین کا ''یونیفارم سیول کوڈ'' میں شامل کیا جانا) کے بارے میں میرا جواب یہ ہے کہ اس کا یہاں مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں؛ کیوں کہ ''یکساں سیول کوڈ'' کے نفاذ کا مسئلہ کسی ضرورت یا عملی تقاضہ کی بناء پر نہیں اٹھایا گیا بلکہ وہ — درحقیقت — اس متعصّبانہ اور تنگدلانہ ذہنیت کی پیداوار ہے جو پورے ہندوستان کو ایک ہی رنگ (بھگوے رنگ) میں ڈوبا دیکھنا چاہتی ہے، اس محرک کے ہوتے ہوئے اکثریت کا اسلامی قوانین کو اپنانے کا خیال خوش فہمی یا ناواقفیت پر مبنی ہونے کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

سوال:- مہاراشٹر اسمبلی میں ایک سے زائد شادی پر پابندی

اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو چھ ماہ کی قید جیسے قوانین
اور متبنٰی کے تعلق سے قوانین کے نفاذ کی جو بات کہی جارہی ہے
ان پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

جواب:- جو ردعمل ہر حساس اور باحمیت مسلمان کا ہونا چاہئے —— جس کا اظہار بہت سے لوگوں نے پریس و دیگر ذرائع ابلاغ سے کر بھی دیا ہے —— وہی احقر کا بھی ہے جسے مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ 'مداخلت فی الدین' اور آئین میں دلائی گئی یقین دہانیوں کی روح ومنشاء کے سراسر خلاف ہے۔

سوال:- بورڈ کے پیش نظر وہ کونسے نتائج وعواقب ہیں جو متبنٰی
بل کے باعث پیدا ہوں گے؟

جواب:- تقریباً دس سال پہلے یہ مسئلہ اس سے زیادہ پرزور و پرشور طریقہ سے اُٹھایا جاچکا ہے اس وقت اس کو اٹھانے والی خود مرکزی (کانگریسی) حکومت تھی، اس وقت پرسنل لا بوڈر نے اس کے خلاف دلائل و براہین کے ذریعہ حکومت کو قائل کر کے اس تجویز کو واپس لینے پر مجبور، یا آمادہ کردیا تھا، اس قانون (متبنٰی قانون) سے شریعت کے ایک نہیں ،بہت سے قوانین متاثر بلکہ مسخ ہوجائیں گے مثلاً وراثت، محرمیت، حجاب، ولایت کے قوانین ، بالفاظ دیگر اس سے بہت سے حرام حلال اور حلال حرام ہوجائیں گے، ظاہر ہے کہ یہ اتنی سنگین بات اور شریعت میں ایسی مداخلت ہے جس کا حق کسی بھی انسان کو نہیں، حتیٰ کہ علماء مجتہدین اور اجماع اُمت کو بھی نہیں چہ جائے کہ غیر مسلموں کو۔

سوال:- بورڈ کے کئے گئے سابقہ فیصلوں میں ایک اہم فیصلہ
دارالقضاء کے قیام کا بھی تھا اس پر پریس نے حسب توقع کافی
واویلا بھی مچایا، اس سمت میں عملی طور پر کس حد تک کامیابی ہوئی
،کیا آپ اعداد وشمار کی روشنی میں بتانا پسند فرمائیں گے کہ

ملک کے طول وعرض میں کتنے دارالقضاء قائم ہیں اور ان میں
کتنے مقدمات فیصل ہوئے؟

جواب:- میرے پاس پورے ملک کے صحیح اعداد وشمار نہیں؛ البتہ جہاں جہاں دارالقضاء قائم ہوئے (ان میں لکھنؤ کا مرکزی دارالقضاء بھی ہے) وہاں بالعموم ان کا استقبال کیا گیا اور اسے پسندیدہ قدم قرار دیا گیا، اگرچہ علماء کے ایک حلقہ کو ایسے دارالقضاء کے قاضیوں کے اختیار فسخ نکاح میں فقہی وشرعی اشکالات بھی ہیں، جنھیں پوری طرح رفع نہیں کیا جاسکا ہے، پھر جس درجہ کے علماء کی قاضی کے اہم منصب کے لئے ضرورت ہے ان کی کمی بھی اس راہ میں مانع بن رہی ہے، شاید ان ہی اسباب سے اتنے دارالقضاء ابھی تک قائم نہیں ہوسکے ہیں جتنے کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں دارالقضاء سے صادر شدہ بعض فیصلوں کو سرکاری عدالتوں میں چیلنج کیا جانا بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کا سامنا بعض قاضیوں کو کرنا پڑتا ہے، اس کے حل کی تدابیر بھی کی جانا صروری ہیں۔

سوال:- کیا بورڈ کا کوئی مرکزی دفتر بھی ہے، جہاں سے اس
پورے نظام پر قابو پایا جاسکے اور اگر ہے تو کیا وہ متحرک اور فعال
ہے، کیا ایسے افراد کی ٹیم بورڈ کے پاس موجود ہے جو خالصتاً بورڈ
کے کاموں کی نگرانی کریں؟

جواب:- بورڈ کے قیام کی ابتداء سے ہی اس کے ''جنرل سکریٹری'' کی قیام گاہ ہی ''بورڈ کا مرکزی دفتر'' رہی ہے، چنانچہ آج بھی ایسا ہی ہے؛ لیکن انتخابات ضرور ہے کہ ''بورڈ'' کی اہمیت اور اس کے مقاصد کی گیرائی و گہرائی کو دیکھتے ہوئے دفتری عملہ ناکافی ہے اور ایسے اہل افراد کار جو ہمہ وقتی خدمات انجام دے سکیں بہت کم اسے حاصل ہیں —— اس کا ایک سبب مادی وسائل کی کمی بھی ہوسکتا ہے۔

سوال:- پرسنل لا بورڈ کا جب قیام عمل میں آیا تھا تو ایک عام
مسلمان کو مختلف مکاتب فکر کے علماء کے مابین اتحاد اور ان کے

ساتھ ساتھ دانشوروں کے اجتماع پر بڑی مسرت ہوئی تھی اس لحاظ سے بورڈ ملت کی آرزؤں پر کس حد تک پورا اتر رہا ہے اور مستقبل قریب میں اس کے کیا آثار ہیں؟

جواب:- فی الجملہ یہ صورتِ حال بورڈ کے قیام سے لے کر اب تک بحمد اللہ قائم ہے جو اُمتِ مسلمہ کی موجودہ روش کو دیکھتے ہوئے (کہ قدم قدم پر اختلاف وٹکراؤ کی فضا ہے) بجائے خود ایک اہم کامیابی ہے، مستقبل کا حال اللہ عالم الغیب کے سوا اور کسے معلوم ہوسکتا ہے؛ البتہ توقع اور دُعاء یہی ہے کہ یہ صورتِ حال برقرار رہے۔

سوال:- پرسنل لا بورڈ کی تشکیل غالباً ۱۹۷۲ء میں عمل میں آئی ،آج اس کے قیام کو تقریباً ۲۳ برس ہو رہے ہیں ان ۲۳ برسوں میں، پرسنل لا بورڈ کو (کہ جن مقاصد کے تحت وجود میں آیا تھا) کس حد تک کامیابی ہوئی ہے، دفاعی کوششوں کے علاوہ کیا بورڈ کے پاس ایسا لائحہ عمل بھی ہے جسے اقدامی کوششیں کہا جاسکے اور ایسی ٹھوس کوششیں ہوسکیں جن سے ان مذموم کوششوں کا قلع قمع ممکن ہو۔

جواب:- بورڈ کے قیام (۱۹۷۳ء نہ کہ ۱۹۷۲ء) سے اب تک کی کامیابیوں میں ،حکومتی سطح پر بعض اہم باتیں منوانا، مثلاً متبنی قانون سے مسلمانوں کا استثناء، نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں ایک دفعہ کے اندر جزوی تبدیلی، پھر سپریم کورٹ کا اس بارے میں فیصلہ آجانے کے بعد اس کے اثرات کم یا ختم کرنے کے لئے ''بل'' کا پارلیمنٹ میں منظور ہوجانا شامل ہیں۔

ایجابی کامیابیوں میں اسلام کے عائلی قانون پر ایسا لٹریچر وجود میں آجانا بھی ہے جس سے بڑی حد تک غلط فہمیاں دور ہوجائیں اور ہر منصف مزاج کے لئے اسلامی قوانین کا سب سے زیادہ بہتر ہونے کو تسلیم کرلینا آسان ہوجائے، اس بارے میں راقم الحروف کی

مذکورہ کتاب (جو بورڈ کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اسی کی تحریک پر لکھی گئی تھی) کے علاوہ خود بورڈ کے سکریٹریٹ کی طرف سے متعدد چھوٹے بڑے کتابچے (متعدد زبانوں میں) شائع ہوئے اور دوسرے علماء اور وکلاء وفضلاء نے مضامین اور کتابچے لکھ کر شائع کئے؛ لیکن ظاہر ہے کہ ان کوششوں کی افادیت کے باوجود ان سے ''مسلم پرسنل لا'' کے خلاف ہونے والی مذموم کوششوں کا قلع قمع نہیں ہوسکا، غالباً یہاں ہو بھی نہیں سکتا؛ کیوں کہ یہ کوششیں کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کم، عناد پر زیادہ مبنی ہیں۔

سوال:- جے پور اجلاس کے اہم فیصلوں میں ویمن سیل اور میڈیا واچ کمپنی کا قیام تھا، اس سلسلہ میں کیا پیش رفت ہوئی؟ کیا اس پر آپ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

جواب:- میرے علم میں اس کی تفصیلات نہیں۔

سوال:- فقہ اسلامی کی تدوین کے فیصلہ کے سلسلہ میں کیا پیش رفت ہوئی؟

جواب:- فقہ اسلامی کی تدوین — بالفاظ صحیح — ''مسلم پرسنل لا کے دائرہ میں آنے والے شرعی قوانین کی دفعہ وار تدوین'' کا کام بحمد اللہ مکمل ہوچکا ہے، جس پر راقم الحروف سمیت متعدد علماء کی کئی سال تک محنت وصلاحیت خرچ ہوئی ہے، اب اس کی اشاعت کا کام باقی ہے جو کثیر اخراجات (تقریباً ڈھائی لاکھ روپے) کا متقاضی ہے نیز اس کے مختلف زبانوں — خاص طور پر انگریزی میں ترجمہ کا اہم اور ضروری کام ہونا رہ گیا ہے۔

سوال:- مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلم سماج اسلامی معاشرتی قوانین پر عمل پیرا ہوجائے، اس مقصد کے پیش نظر اصلاحِ معاشرہ کی مہم بھی چلائی گئی، اس سلسلہ میں کس حد تک کامیابی ہوئی اور اسے مزید مؤثر بنانے کے لئے بورڈ کے سامنے کیا لائحہ عمل ہے؟

جواب:- افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عملاً سب سے کم کامیابی (جو تقریباً نفی کے برابر ہے) اسی مقصد میں ہوئی، بورڈ کے سامنے متعدد طریقے ہیں، جن میں سے ایک ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منانے جیسے اقدامات ہیں۔

سوال:- نازک گھڑیوں میں بورڈ کی طرف ملت اسلامیہ ہند بڑی اُمید کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، بابری مسجد کی بازیابی کی کوششوں کے موقع پر مسلمانوں نے بڑی اُمیدیں وابستہ کیں؛ لیکن خود لیڈروں کی صفوں میں جو شرمناک انتشار ہوا، بابری مسجد کا المناک سانحہ پیش آیا اور پھر مسلمانوں پر فسادات کی صورت قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی، ان سب مواقع پر بورڈ کی حکمت عملی اور سرگرمیاں کیا رہیں؟

جواب:- بابری مسجد کا مسئلہ ابتداءً مسلم پرسنل لا بورڈ کے دائرہ میں نہیں تھا؛ لیکن اس مسجد کے شہید کیے جانے کے معاً بعد مسلمانانِ ہند جس صورتِ حال سے دوچار ہوئے (کہ اس موضوع کو اُٹھانے والی تحریکیں اور جماعتیں احساس شکست سے دوچار ہوکر میدان میں آنے سے کتراتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں اور مسلمانانِ ہند اپنے کو بے یار و مددگار خیال کررہے تھے) تو مجبوراً بورڈ نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا ممبر احقر بھی تھا، جو بورڈ کے مزاج اور طریق کار کے مطابق، یعنی غیر جذباتی انداز میں (آج کی سیاسی تحریکوں کے طریقہ کے برخلاف) اقدامات کرے؛ چنانچہ فی الجملہ اسی نہج پر کمیٹی نے کام کیا اس نے قانونی لڑائی لڑنے پر دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں زیادہ توجہ دی؛ چنانچہ اس کے مثبت اثرات ظاہر ہوئے مثلاً مسجد اور اس کے اطراف کی زمین کی ملکیت سے متعلق مقدمات جو پہلے سوخت کردیئے گئے تھے وہ بحال ہوگئے اور (دفعہ ۱۴۳، اے کے تحت) حکومت نے سپریم کورٹ سے رائے مانگنے کی جو درخواست کی تھی وہ خارج کردی گئی، اسے بورڈ کی (یا مسلمانوں کی) کامیابی کہا جاسکتا ہے؛ بلکہ واقف کار حلقوں

نے یہی کہا بھی ہے۔

سوال:- بابری مسجد کی شہادت کی بات چل پڑی ہے تو دو باتیں آپ سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے، جن کے سرے بورڈ سے ملتے ہیں، ایک تو یہ تاثر ہے کہ شاہ بانو کیس میں مسلمانوں کی تحریک کی کامیابی کے ردعمل میں مخالفین کی منھ بھرائی کے لئے مسجد کا تالا کھولا گیا، اس تاثر کے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے اور اس تعلق سے دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ بابری مسجد کی بازیابی کے تعلق سے ایک عام مسلمان کوئی زیادہ پراُمید نہیں دکھائی پڑتا اس حساس اور نازک مسئلہ میں مسلم لیڈروں کے جو بیانات آتے ہیں ان کی حیثیت فاتحہ خوانی سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی، اس کے متعلق ملت سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب:- پہلا تاثر بالکل غلط اور بورڈ کے مخالفوں کی طرف سے پھیلایا گیا ہے، دوسرے تاثر کو فی الجملہ —— بحالت موجودہ —— حقیقت پسندی کہا جائے تو شاید بے جا نہیں ہوگا۔

سوال:- ایک بات بار بار دہرائی جاتی ہے یہاں تک کہ عوام کا بھی یہ ذہن بن گیا ہے کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے، اس عوامی تاثر پر آپ عوام سے کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب:- اجتماعی قیادت (جو مسلم پرسنل لا کی شکل میں مسلمانانِ ہند کو حاصل ہے) کو اگر قیادت کا نام دیا جائے تو یہ عوامی تاثر غلط ہے، ہاں اگر کسی شخص واحد کی قیادت کی نفی مراد ہو تو اس میں فی الجملہ صداقت کا پہلو ہے، یعنی اسے کلیتاً غلط نہیں کہا جاسکتا۔

سوال:- ایک تاثر یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کے اکابرین وعمائدین کی پہلی صف تو موجود ہے، مگر (Second Line)

نہیں ہے کیا اس میں واقعیت بھی ہے یا اسے محض ملت کی
یاسیت قرار دیا جائے اور اگر یہ امر واقعہ ہے تو اس کے لئے کیا
کیا جانا چاہئے؟

جواب:- ''پہلی صف'' کی موجودگی کا مطلب اگر ایسے دو ایک افراد (مثلاً حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی) کی موجودگی ہو، جن پر اُمتِ مسلمہ ہند کا معتد بہ درجہ میں اعتماد ہو (اور ایک دو فرد کو ہی ''صف'' کا نام دے دیا گیا ہو) تب تو پہلی صف کی موجودگی کی بات صحیح ہے ورنہ اس کی صحت میں بھی کلام ہے، دوسری صف کی عدم موجودگی کی بات مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ بحمد اللہ مختلف ملی میدانوں میں افراد کار لگے ہوئے ہیں اور مفید ثابت ہو رہے ہیں جنھیں ''صف اول'' کے لائق اگر نہ بھی سمجھا جائے تو ''صف ثانی'' سے بھی انھیں باہر کھڑا ہوا سمجھنا شاید ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

سوال:- مسلم پرسنل لا ہی نہیں بلکہ اسلام پر اعتراضات کے
لئے میڈیا جس انداز سے سرگرم عمل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اس
لحاظ سے بورڈ کے پاس کوئی ٹھوس لائحہ عمل ہے، جس سے منظّم مہم کا
مقابلہ کیا جا سکے، اس لئے آپ کے اپنے ذہن میں کیا خاکہ ہے؟

جواب:- بورڈ نے اپنے قیام کے ابتدائی دور میں ہی اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس میں علماء، وکلاء، فضلاء، مبصرین اور سیاسی حضرات شامل تھے؛ لیکن افراد کار کے اوقات کما حقہ نہ مل سکنے کی بنا پر اس مقصد میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، وہی کمیٹی یا اس طرح کی کوئی دوسری کمیٹی —— ضرورت کے مطابق اوقات و محنت لگا کر کام کرے تو اس میں کامیابی کی خدا کی تائید سے، اُمید ہے۔

سوال:- تحفظ شریعت ہفتہ منانے کا جو اعلان کیا گیا ہے اس
کی کامیابی کے تعلق سے آپ کس حد تک پر اُمید ہیں؟ اس سے

بورڈ کے قیام کے مقاصد کو کس حد تک تقویت ملے گی؟

جواب:- اصل مسئلہ نقشۂ کار کا نہیں افرادِ کار کا ہے، اگر وہ میسر آجائیں اور بقدر کفایت محنت و لگن سے کام کریں تو انشاء اللہ کامیابی قدم چومے گی اور پھر اس سے بورڈ کے مقاصد کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوگی؛ کیوں کہ ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منانے کے لئے جو نقشۂ کار مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے ان میں سے بہت سی باتیں بورڈ کے مقاصد میں شامل ہیں۔

☆ ☆ ☆

سیول کوڈ اور اسلامی قوانین

ہندوستان میں رائج قوانین کی دو اہم قسمیں ہیں سول کوڈ (Civil Code) اور کریمنل کوڈ (Criminal Code) کہلاتی ہیں، کریمنل کوڈ (ضابطۂ فوجداری) کے اندر جرائم کی سزائیں اور انتظامی قوانین وغیرہ نظر آتے ہیں اور سول کوڈ (ضابطۂ دیوانی) کے دائرہ میں نکاح، طلاق، خرید و فروخت اور دوسرے اسی قسم کے (تمدنی) قوانین شامل ہیں، سول کوڈ کے ہی ایک حصہ کو ''پرسنل لا'' کہا جاتا ہے، اسی میں ملک کی اقلیتوں کو (جن میں مسلمان بھی شامل ہیں) ان کے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کا قانونی اختیار —— دستور ہند کے اندر —— دیا گیا ہے؛ چنانچہ مسلمانوں کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ نکاح، مہر، نسب، رضاعت (دودھ پلانے کا حق) حضانت (پرورش کا حق) ولایت (ولی کون ہو) طلاق فسخ نکاح (اس کی مختلف صورتیں) عدت، نفقہ، وراثت، وصیت، وقف وغیرہ سے متعلق مقدمات اگر سرکاری عدالتوں میں لے جائے جائیں اور دونوں فریق مسلمان ہوں تو سرکاری عدالتیں بھی ان مقدمات کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہی مذکورہ مقدمات میں

کریں گی، ان ہی قوانین کا مجموعہ ''مسلم پرسنل لا'' کہلاتا ہے اور اسی حق کو ''مسلم پرسنل لا'' کی آزادی کا حق کہا جاتا ہے، اب اسی محدود حق کو جو اسلامی شریعت کے ہزاروں قوانین میں سے صرف چند قوانین میں ہی دیا گیا ہے، چھین لینے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور اسے چھین لینے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کی جارہی ہیں، ان میں یہ پروپیگنڈہ بھی ہے کہ اسلامی قوانین (العیاذ باللہ) ظالمانہ ہیں، ان کے اندر عورتوں پر ظلم کیا گیا ہے، اسی پروپیگنڈہ کے اثر سے بہت سے بھولے بھالے ناواقف مسلمان بھی ایسا ہی سمجھنے اور کہنے لگے ہیں؛ حالاں کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور اسلامی قوانین سے ناواقفیت کی دلیل ہے، آگے اس کی کچھ تفصیل آرہی ہے۔

حالاں کہ اسلامی شریعت کے یہ قوانین قرآن مجید اور صحیح احادیث میں صاف صاف بیان کئے گئے ہیں، کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں، مثلاً نکاح وطلاق سے متعلق قرآن مجید کی پانچ سورتوں ـــــ بقرہ، نساء، نور، احزاب، طلاق میں تقریباً تیس (۳۰) آیتوں کے اندر احکام دیئے گئے ہیں، اسی طرح وراثت کے بارے میں بھی تفصیلی قوانین قرآن مجید کی سورہ نساء کے پورے ایک رُکوع میں یکجا بیان ہوئے ہیں، اس کے علاوہ بھی مواقع پر، مثلاً سورۂ نساء کے آخر میں بتائے گئے ہیں کہ زوجین کے حقوق وفرائض کی تفصیلات بھی متعدد سورتوں (بقرہ، نساء، احزاب، طلاق وغیرہ) میں مذکور ہیں اور ایسی احادیث کا تو شمار ہی مشکل ہے جن میں مذکورہ بالا مسائل بیان ہوئے ہیں، تو اب خدانہ کردہ یونیفارم سول کوڈ نافذ کیا جاتا ہے اور ''مسلم پرسنل لا'' جزواً یا کلاً ختم کیا جاتا ہے تو اس اقدام سے قرآن مجید کی چالیس سے زیادہ آیتوں اور سینکڑوں احادیث کو عملاً معطل ومنسوخ کرنے اور ان سب پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو جبراً محروم کرنے کا خطرہ لاحق ہوجائے گا، کیا کوئی بھی غیرت دار اور سچا مسلمان یہ جبر وظلم گوارہ کرنے پر آمادہ ہوگا اور اگر بالفرض کوئی مسلمان اسے گوارہ نہیں کرتا ہے تو مسلمان رہ سکے گا! ظاہر ہے کہ ـــــ قرآن مجید کی آیات کی اتنی بڑی تعداد اور بکثرت احادیث کی منسوخی معطّلی کو خوش دلی سے برداشت کرلینے والا

مسلمان نہیں رہ سکتا۔

اور یہ بات کسی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے سے بھی مخفی نہیں ہوگی کہ ملکی قوانین پر عمل کرنے سے مسلمانوں کا امتیاز باقی نہیں رہے گا، مسلمان، مسلمان کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتا ہے یعنی اگر یہ امتیاز ختم ہوگیا تو مسلمان یہاں بحیثیت مسلمان کے ختم ہوجائیں گے، چاہے نام مسلمانوں جیسا رہے، پھر آگے چل کر نام، بھی مسلمان نہیں رہ جائیں گے، جیسا کہ اسپین وغیرہ میں یہ صورت سامنے آچکی ہے۔ لا قدر اللہ ۔

رہا یہ پروپیگنڈہ کہ ''اسلامی قوانین غیر منصفانہ ہیں اور ان میں عورت کو نظر انداز کیا گیا ہے'' سراسر بے بنیاد ہے، اسلام نے عورتوں کو اتنے حقوق دیئے ہیں کہ کسی بھی مذہب یا قانون نے نہیں دیئے، اس اعتراف کا منصف مزاج بہت سے واقف غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، مثلاً اسلام نے عورت کو ماں، باپ، بھائی، بہن، اولاد، شوہر وغیرہ کے ترکہ میں حصہ دار قرار دیا؛ حالاں کہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں اور بہت سے مذاہب میں عورت کو سرے سے وارث ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، آج بھی یوپی کے قانون آراضی میں عورت کو کچھ نہیں دیا گیا، حتیٰ کہ بیوی کو اور بیٹی کو بھی محروم رکھا، اسلام نے عورت کو نکاح کی صورت میں شوہر سے مہر کا حق دلوایا؛ حالاں کہ دوسرے مذاہب میں (مثلاً ہندو مذہب میں) الٹے عورت پر شادی کے موقع پر مال کی بڑی مقدار، تلک، جہیز وغیرہ کے نام سے شوہر کو دینا لازمی ہوتا ہے، اس کے بغیر شادی ہو ہی نہیں سکتی (بدقسمتی سے آج کل مسلمانوں میں بھی یہ وبا برادرانِ وطن کے اثر سے پھیل رہی ہے، جن کا تدارک ضروری ہے) اور پھر شادی کے بعد کے تمام اخراجات اس کے شوہر کے ذمہ لازم ہوتے ہیں (بلکہ طلاق کے بعد بھی عدت کے درمیان) چاہے عورت دولت مند ہو اور اگر اولاد بھی ہو اور مطلقہ عورت اولاد کی پرورش میں لگی رہے، کہیں نکاح نہ کرے تو عدت کے بعد بھی جب تک اولاد پرورش کی محتاج ہو (لڑکا سات سال تک اور لڑکی بالغ ہونے تک) تو اولاد کے اخراجات نیز اولاد کی پرورش کرنے والی بچوں کی ماں کے اخراجات بچوں کے باپ کے ہی ذمہ شرعاً لازم ہیں۔

پھر عورت کے اخراجات شادی سے پہلے اس کے والد، بھائی پر، شادی کے بعد شوہر پر شوہر کے مرجانے یا طلاق دینے کے بعد نادار کے اخراجات پھر اس کے والدین، بھائی وغیرہ پر اور اگر اس لائق ہوتو ان پر اور اگر کوئی نہ ہوتو حکومت اسلامیہ پر عائد ہوتے ہیں، غرضیکہ نادار عورت کو ہر قسم کے اخراجات سے شریعت نے عام حالات میں بےفکر بنایا ہے، اسی لئے اس کا حصہ باپ کے ترکہ میں لڑکے سے آدھا رکھا ہے؛ کیوں کہ لڑکے پر عموماً تمام اخراجات، بالغ ہونے کے بعد، عائد ہوجاتے ہیں برخلاف لڑکی کے کہ اس پر کوئی خرچ لازم نہیں ہوتا، اسی سے یہ سمجھنا بھی آسان ہوجاتا ہے کہ مرد کو طلاق کا حق کیوں دیا گیا ہے، کہ طلاق کے نتیجہ میں مرد ہی پر سارا مالی بار پڑتا ہے، عورت پر کچھ نہیں (اور صحیح اسلامی معاشرہ میں مطلقہ عورت کی شادی دشوار نہیں ہوتی) دراصل خرابی مسلمانوں میں آگئی ہے کہ وہ اسلامی وشرعی قوانین نہیں اپناتے اس طرح وہ دنیا کو اسلام کے خلاف غلط فہمی پیدا کرنے اور پروپیگنڈہ کرنے کا بھرپور موقع دیتے ہیں، اس لئے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے خطرہ سے بچنے کا بھی سب سے کامیاب طریقہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان تمام شرعی قوانین، بالخصوص معاشرتی قوانین اپنالیں۔

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات!

☆ ☆ ☆

سپریم کورٹ میں دائر 'لے پالک' کے بارے میں ایک رٹ کا جواب

مکرم ومحترم جناب عبدالرحیم قریشی صاحب زید کرمکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! آپ کا مکتوب مسٹر شبنم ہاشمی کی رٹ کے ترجمہ کے ساتھ اگست ۲۰۰۶ء کے شروع میں ملا، قبل اس کے کہ اس کا جواب دیا جائے چند باتیں عرض کرنا ضروری نظر آتا ہے۔

۱- مذکورہ مکتوب میں آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے قیام کا محرک ''تبنیت'' کے بل کو بتایا گیا ہے، یہ محتاجِ نظر ہے؛ کیوں کہ بورڈ کے قیام کا اصل محرک مہاراشٹر اسمبلی میں پیش کئے جانے والا یا متوقع بل بنا ہے، جس سے پورا ''مسلم پرسنل لا'' زد میں آرہا تھا، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند (جہاں سے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک پروان چڑھی) کی

روداد میں، نیز راقم کی اس موضوع پر لکھی کتابوں میں مذکور ہے، راقم کی ان کتابوں پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے مقدمے ہیں، جن سے گویا اس کے مندرجات کی توثیق ہوتی ہے؛ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ بورڈ کے قیام کے بعد سب سے پہلا مسئلہ ''تبنیت'' کا پیش آیا جس سے بورڈ کو نبرد آزما ہونا پڑا اور بحمد اللہ کامیابی ملی۔

۲- آپ کے مکتوب میں چند مسلم ممالک کے مطالعہ پر اقوام متحدہ کی طرف سے نظام کفالت کا ذکر موجود ہے، مگر زیر نظر تحریر (مسٹر شبنم ہاشمی کی رٹ کے ترجمہ) میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔

ان ضروری دو باتوں کے بعد اسلام کے قانونِ نفقہ (جیسے: نظام کفالہ، کہنا شاید پوری طرح صحیح نہ ہو) کے سلسلہ میں اپنی تیس سال پہلے سے مسلسل شائع ہونے والی کتاب معاشرتی مسائل کے (ص: ۱۰۷ تا ۱۷۸) اس حصہ کا فوٹو بھیج رہا ہوں، جس میں یتیم کی پرورش کے اسلامی نظم کی تقریباً پوری تفصیل آ گئی ہے، (پس منظر سمجھنے کے لئے پہلے کے چند صفحات کا فوٹو بھی شامل کیا گیا ہے) جسے پڑھ کر کوئی بھی منصف مزاج، اسلام پر یتیم کو نظر انداز کرنے یا اسے یوں ہی بے یار و مددگار چھوڑنے کا الزام نہیں لگا سکتا، اس سے پھر خود بخود 'تبنیت' کی افادیت وضرورت پر زور دینے والوں کے دلائل کا بے اثر ہونا ثابت ہوجائے گا۔ (ان شاءاللہ)

دراصل ہندوؤں یا ان جیسے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے یہاں سماجی یا معاشی حل کے لئے گود نہیں لیا جاتا؛ بلکہ خالص ایک مذہبی خیال وعقیدہ کے تحت لیا جاتا ہے (انسانی ہمدردی وغیرہ کا تو صرف لیبل لگا دیا جاتا ہے، غالباً مغالطہ دینے کے لئے) ہندوؤں کے عقیدہ کی کچھ وضاحت مولانا عبدالماجدؒ کی تفسیر ماجدی (سورۃ آلِ عمران: ۱۱۶) ''**إن الذين كفروا لن تغني عنهم أموالهم ولا أولادهم من الله شيئا**'' کی تفسیر کے تحت مکتوب نوٹ سے ہوجاتی ہے، مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

ہندوؤں اور جینیوں میں یہ گمراہی خاص طور پر بڑھی ہوئی ہے،

اولادِ نرینہ کی اہمیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ لڑکا ہی مرے ہوئے باپ کو پانی دے دے کر عذاب سے چھڑا لیتا ہے، منو جی کا یہ قول کتابوں میں نظر سے گذرا ہے کہ بیٹے کو سنسکرت میں ''پتر'' کہتے اس لئے ہیں کہ وہ باپ کو ''پت'' (دوزخ) سے چھڑا لاتا ہے، بعید نہیں کہ اصلی بیٹا نہ ہونے کی صورت میں یہ ''لے پالک'' کو اصلی کے قائم مقام قرار دے لیتے ہوں۔

اس سلسلہ کی ایک اور ضروری بات بھی آپ کے علم میں یقیناً ہوگی، یہاں صرف یاددہانی کے طور پر لکھی جا رہی ہے وہ یہ کہ ''لے پالک'' کے قانون کو اختیاری قرار دینا محض مغالطہ ہے؛ کیوں کہ جو شخص لے پالک بنائے گا اس کے لحاظ سے چاہے یہ عمل اختیاری ہو، مگر اس کے اثرات جن پر پڑیں گے وہ غیر اختیاری بلکہ جبری ہوں گے، مثلاً ایک شخص نے کسی اجنبی کو لے پالک بنایا اب وہ قانون کی رو سے لڑکا قرار پایا؛ لیکن جب لے پالک بنانے والا انتقال کر لے گا تو وہ قانون کی رو سے لڑکے کی طرح ترکہ پانے کا مستحق قرار پائے گا، اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوگا کہ ترکہ کتنا پائے گا؟ کیوں کہ از روئے شریعت اسلامی تو وہ بالکل ترکہ پانے کا مستحق نہیں ہے تو پھر کس قانون کی رو سے وہ ترکہ پائے گا؟ اگر مثلاً ہندو لاء کی رو سے تو پھر وہ کل مال کا (بڑا لڑکا ہونے کی بنا پر) مستحق ہوجائے گا، اس طرح اس مرنے والے (لے پالک بنانے والے) شخص کے تمام اصلی ورثہ جبراً محروم کردیئے جائیں گے اور اگر اسے شرعی لحاظ سے دوسرے اصلی لڑکی، لڑکے کی طرح، ترکہ دیا جائے گا تو اولاً تو شرعی لحاظ سے دینا ہی صحیح نہ ہوگا، اگر دیا جائے گا تو اصل مستحقین (اصل لڑکے، لڑکیوں) کا حصہ جبراً گھٹایا جائے گا تو پھر اختیاری کہاں رہ گیا؟ جبر ہی ہو گیا، بنابریں اختیاری کہہ کر محض مغالطہ دیا جا رہا ہے، اختیاری حقیقتاً نہیں رہے گا۔

پھر گود لے لینے کی وجہ سے نکاحی رشتوں میں پیچیدگیاں ہوں گی؛ کیوں کہ از روئے شرع تو یہ شخص غیر محرم اور اجنبی ہے، مگر قانوناً بھائی (یا بہن) قرار دینے کی صورت

میں وہ گویا 'محرم' بن گیا (اس طرح شرعاً نکاح درست ہونے کے باوجود از روئے قانون، اس سے نکاح نہیں ہوسکتا، اس طرح بعض صورتوں میں معکوس قسم کی خرابی لازم آئے گی، یعنی مختصر لفظوں میں، تحریم حلال، یا تحلیل حرام، کا مرتکب ہونا پڑے گا، شرعاً اس کی سنگینی محتاج بیان نہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید (سورۂ احزاب کی) متعدد آیتوں میں صراحتاً تبنیت کی شدید ممانعت آئی؛ بلکہ اس کو لفظی طور پر بھی ابن (بیٹا) کہنے سے منع کیا گیا ہے: ''**ماجعل أدعياء كم ابنا ء كم**'' (آیت:۴) اور ''**أدعوهم لآبائهم هو أقسط عندالله فإن لم تعلموا آبائهم فإخوانكم فى الدين ومواليكم**''۔ (آیت:۵)

علاوہ ازیں ''تبنیت'' لاوارث بچوں کی دشواری کا پورا حل بھی نہیں، خود شبنم ہاشمی کے عرضی دعوی میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس کا اعتراف کیا گیا ہے، مثلاً کہا گیا ہے: ''ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بچہ کی بہترین جذباتی، جسمانی، ذہنی متوازن نشو ونما اس کے خاندان میں ہی ہوسکتی ہے، جو یتیم ہیں، لاوارث، محروم اور استحصال کا شکار ہیں انھیں تحفظ اور توجہ دینا خاندان کی ذمہ داری ہے۔ (ص:۱۴، ۲۶ کا آخری پیراگراف)

اس سے معلوم ہوا کہ اجنبی (غیر خاندان) کا لے پالک بنانا بچے کی نشو ونما پر اثر انداز ہوتا ہے، انسان کی ضرورت روٹی، کپڑا ہی نہیں ہے (جیسا کہ جانوروں کی صرف کھانا پینا ہی ہے) بلکہ اور بھی چیزیں ہیں جن کا اجنبی ماحول میں فراہم ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہوجاتا، اس میں اگلے پیراگراف میں چند سوالوں کے بعد تقریباً یہی بات دھرائی گئی ہے، آگے صفحہ ۱۷ پر مزید یہ کہا گیا ہے، حال میں ۲۰۰۴ء میں حکومت ہند نے بچوں کے لئے ایک قومی چارٹر منظور کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ کو خاندان کے ساتھ رہنے کا حق حاصل ہے۔ (ص:۱۷
)

نیز یہ کہ اس عرضی دعوے میں ''تبنیت'' کے لئے جو دلائل دیئے گئے ہیں وہ بہت کمزور ہیں، اکثر جذباتی باتیں ہیں، انھیں دلائل کہنا بھی غالباً صحیح نہیں ہوگا، اس میں جگہ

جگہ تضادات بھی ہیں، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''اگر کسی لڑکے کو گود لیا جائے تو گود لینے والے باپ کے کوئی ہندو بیٹا، پوتا، یا پڑپوتا نہیں ہونا چاہئے'' (ص:٦، دفعہ:۱) لیکن آگے (ص:۱۰، دفعہ:٦ کی مشق:۲) لکھا ہے :

جن کو گود لینے کی اجازت ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے ان والدین کو کسی بچہ کو جنس کی بنیاد پر گود لینا چاہتے ہوں اگر چہ ان کی حقیقی اولاد بھی موجود ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو قانون تبنیت میں تضادات ہیں یا پیش کرنے والے سے چوک ہوئی، قانون تبنیت کا اس عرضی دعوی میں جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اس میں مذکورہ بالا اُمور کے علاوہ اور بھی جھول نظر آتے ہیں، مثلاً اس میں بیان ہوا ہے کہ: ''اگر کوئی مرد کسی لڑکی کو گود لیتا ہے تو گود لینے والے کی عمر، گود لی جانے والی لڑکی سے کم از کم اکیس سال زیادہ ہو (ص:۷، پیرا:۴، مشق:۳) اسی طرح اگلی مشق میں عورت گود لینے والی ہو اور گود لیا جانے والا لڑکا ہو تو عمر میں یہی فرق ضروری بتایا گیا ہے۔ (ص:۷، مشق:۴)

غالباً عمر میں یہ فرق اس لئے رکھا گیا ہے کہ ایک دوسرے کا جنسی استحصال نہ کر سکیں، مگر قابل غور یہ ہے کہ ۱۴ سال کی لڑکی کو ۳۵ سال کا مرد گود لے سکتا ہے تو اس عمر میں پورا امکان ہے کہ جنسی استحصال کیا جا سکے؛ لہٰذا یہ فرق اس مصلحت کے لئے ناکافی ہے، عمر میں کم از کم ۴۰ سال کا فرق ہونا چاہئے۔

اب اس کے بعد اسلامی شریعت میں نفقہ و کفالت کے قوانین کا نیز چند قرآن مجید کی آیات و احادیث مبارکہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، جن میں ناداروں، بالخصوص یتیموں کی پرورش کا نظم و اہتمام ملتا ہے۔

وہ آیات جن میں یتیموں، ناداروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے

۱- **ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيراً**۔ (۱)

کھانا کھلاتے ہیں خدا کی محبت میں غریب کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔

۲- وآتی المال علی حبه ذوی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل ۔ (۲)

(بڑا نیک وہ ہے) جو دے مال اللہ کی محبت میں، رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو۔

۳- قل ما انفقتم من خیر فللو الدین والأقربین والیتمی والمساکین وابن السبیل ۔ (۳)

کہہ دو کہ جو کچھ مال تم خرچ کرو وہ حق ہے، ماں باپ کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔

(۱) الدہر:۸۔ (۲) البقرۃ:۱۷۷۔ (۳) البقرۃ:۲۱۵۔

۴- وأن تقوموا للیتمی بالقسط ۔ (النساء:۱۲۷)

(اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے) کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف پر۔

۵- واعلموا أنما غنمتم من شیئ فأن للہ خمسه وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین ۔ (۱)

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو مالِ غنیمت میں ملے کسی بھی قسم کا، سو وہ اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور ایک حصہ رسول کے واسطے اور ایک حصہ اس کے قرابت والوں کے واسطے اور ایک حصہ یتیموں کے، ایک حصہ محتاجوں کے اور ایک حصہ مسافروں کے واسطے۔

۶- ما أفاء اللہ علی رسوله من اهل القری فللّٰه وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل ۔ (الحشر:۷)

جو مال دلوایا اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے سو وہ بھی

اصلاً تو اللہ کا حق ہے (اور اس کے حکم سے اس مال میں) رسول کا حق ہے اور رسول کے قرابت والوں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا حق۔

وہ احادیث جس میں یتیموں، محتاجوں وغیرہ کے حقوق بتائے گئے ہیں

من قبض یتیماً من بین المسلمین إلی طعامه وشرابه أدخله اللہ الجنة البتة ۔ (۲)

جس کسی نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچے کو اپنے کھانے پینے میں شامل کیا، اللہ تعالیٰ اس کو ضرور جنت میں داخل فرمائے گا۔

(۱) الأنفال:۴۱۔ (۲) ترمذی:۲/۱۴، کتاب البر والصلة، حدیث نمبر:۱۹۱۷۔

أنا وکافل الیتیم کهاتین وأشار باصبعیه ۔ (۱)

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح قریب قریب ہوں گے جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی کلمہ کی اور اس کے برابر کی) انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا۔

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا ۔ (۲)

وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عزت نہ کرے۔

من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامة ، أنا وهو هکذا ، ضم أصابعه ۔ (۳)

جس شخص نے دو نابالغ لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں تو وہ شخص قیامت میں جب آئے گا تو میں اور وہ اس طرح قریب ہوں گے، جس طرح برابر کی انگلیاں اور آپ نے

اپنی انگلیوں کوملایا۔

من أحسن إلى يتيمه (أويتيم عنده) كنت أنا وهو في الجنة كهاتين ۔ (۴)

جس شخص نے اپنے عزیز یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا تو میں اوروہ جنت میں اس طرح سے قریب ہوں گے،جس طرح دو انگلیاں ہوتی ہیں۔

(۱) ترمذی:۲/ ۱۴،کتاب البر والصلۃ،حدیث نمبر:۱۹۱۷،کتاب الادب،باب:۲۴،حدیث نمبر:۶۰۰۵،مسلم کتاب الزہد،حدیث نمبر:۷۴۶۹۔ (۲) ترمذی،کتاب البر والصلۃ،حدیث نمبر:۱۹۱۹۔

(۳) مسلم:۲۱/۴،کتاب البر،حدیث نمبر:۶۶۹۵۔ (۴) مسند احمد وترمذی،بحوالہ مشکوٰۃ: ۴۲۳،کتاب البر والصلۃ،حدیث نمبر:۱۳-۱۹۱۲،الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہ روایت بخاری ومسلم میں بھی موجود ہے۔

من آوىٰ يتيما إلى طعامه وشرابه أوجب الله له الجنة ۔(۱)

جس شخص نے کسی یتیم کواپنے کھانے پینے میں شریک کیااللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت کوواجب کردیا۔

من عال ثلاث بنات أو أخوات فأدبهن ورحمهن حتى يغنيهن الله أو جب الله له الجنة ...... واثنتين وواحدة ۔ (۲)

جس نے تین بیٹیوں کی یا تین بہنوں کی پرورش کی اوران کو ادب سکھایااوران پررحم کیاحتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے نیاز ومستغنی کردیااس کے لئے بھی جنت واجب ہے،جودولڑکیوں کی پرورش کرے اس کے بارے میں بھی یہی بشارت ہے اورایک کی پرورش پربھی یہی ہے۔

من كانت له أنثى فلم يئدها ولم ينها ولم يؤثر ولده عليها يعني الذكور أدخله الله الجنة ۔ (۳)

جس کے پاس کوئی لڑکی ہو(خواہ اپنی یا دوسرے کی وہ اس کی پرورش کررہاہو)اوروہ نہ اسے زندہ درگور کرے نہ اس کی توہین کرے اور نہ اپنے بیٹوں کواس پرترجیح دے،اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

فنعم صاحب المسلم ما أعطى منه المسكين واليتيم وابن السبيل ۔ (۴)

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی،بحوالہ طبرانی فی الاوسط ردیف ومن (باختلاف الفاظ)۔

(۲) شرح السنہ بحوالہ مشکوٰۃ:۴۲۳۔

(۳) ابوداؤد،بحوالہ:مشکوٰۃ:۴۲۳،کتاب الادب،حدیث نمبر:۵۱۴۶۔

(۴) بخاری:۱/ ۱۹۸،کتاب الزکوٰۃ،حدیث نمبر:۱۴۱۵،باب:۴۷۔

مسلمان کا بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے مال سے غریب کو اوریتیم کواورمسافرکودیتاہو۔

من عال ثلاثه من الأيتام كان كمن قام ليله وصام نهاره ۔(۱)

جس شخص نے تین یتیموں کی پرورش کی وہ اس آدمی کی طرح ہے جو پوری رات عبادت کرتاہواور ہردن روزہ رکھتاہو۔

إن عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم كانت تلي بنات أختيها يتامى في حجرها ۔ (۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی یتیم بھتیجیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی تھیں۔

عن القاسم (بن محمد) أنه قال : كانت عائشة تلينى وأخالي يتيمين في حجرها ۔ (۳)

قاسم بن محمد بن ابی بکرصدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا میری اور میرے ایک بھائی کی جب کہ ہم دونوں یتیم تھے، کفالت کرتی تھیں، ہم دونوں آپ کی گود میں پرورش پاتے تھے۔

خير بيت فيه يتيم بحسن إليه وشر بيت فيه يتيم يساء إليه ۔ (۴)

بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو۔

☆ ☆ ☆

(۱) ابن ماجہ: ۲۷۰، ابواب الادب، حدیث نمبر: ۳۶۸۰۔ (۲) مؤطا: ۱۱۱۔
(۳) مؤطا: ۱۱۲، مکتبہ رحیمیہ دیوبند۔ (۴) ابن ماجہ : ۲۷۰ ، ابواب الادب ، حدیث نمبر : ۳۶۷۹۔

تغیر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں

اجتہاد کا حصہ — ایک تاریخی جائزہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين سيدنا محمد وآله واصحابه أجمعين ۔

سب سے پہلے میں اسلامک اسٹڈیز کے منتظمین اور داعیوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے ایسے پروقار اجتماع اور اہل علم کے مجمع میں اپنی معروضات

پیش کرنے نیز اصحابِ علم وارباب فکر ونظر کے گرانقدر خیالات سننے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔

سیمینار جو ''اسلام تغیر پذیر دنیا میں'' کے اہم اور نازک موضوع پر ہو رہا ہے، خدا کرے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو اور اسلام کے بارے میں عصر حاضر کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کے ازالہ اور اس کے ''دین خالد'' ہونے کی حقیقت پر جدید ذہن کو مطمئن کرنے اور نئی نسل جو مغربی تہذیب وافکار سے سائنس اور ٹکنالوجی کی حیران کن ترقیوں سے مرعوبیت کی حد تک متاثر ہے، کی ذہنی خلش دور کرنے کا اہم وسیلہ ثابت ہو ''**وما ذلک علی اللہ بعزیز**''۔

میں نے مجوزہ عنوانات میں سے اپنے مقالے کے لئے ''تغیر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں اجتہاد کا حصہ'' منتخب کیا ہے جو میرے ذوق سے قریب تر اور معمولات سے موزوں تر ہونے کے علاوہ سیمینار کے عام موضوع سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے؛ بلکہ غالباً مبالغہ پر محمول نہ ہوگا کہ عام موضوع سے وابستگی میں شاید ہی کوئی دوسرا ذیلی عنوان اس کا ہمسر ہو۔

یہ حقیقت کہ اسلام ''دین خالد'' (۱) اور قیامت تک کے واسطے پوری انسانیت کے لئے راہنما ہے، دراصل بڑی حد تک اجتہاد کی ہی مشعل سے روشن، نیز اسی کے ذریعہ عملاً اس کا ظہور ہے؛ کیوں کہ تغیر پذیر حالاتِ زمانہ، جسے کسی لمحہ قرار نہیں اور نہ ''بے قراری'' جس کی آج ہی نہیں ہمیشہ سے اس کا ''حال'' رہی ہے، سے دوچار انسانیت اور ایسے انسانی معاشرہ کے لئے تفصیلی ہدایات اور صریحی جزئیات چاہے تعداد میں لاکھوں یا اس سے بھی زائد ہوں، ظاہر ہے، کافی نہیں ہوسکتیں کہ بہرحال وہ کثیر ہونے کے باوجود، محدود ہی ہوتیں یا ہوسکتی ہیں؛ حالاں کہ واقعات اور پیش آمدہ حالات کے پیدا کردہ مسائل لامحدود اور مقتضیات زمانہ بے شمار ہیں، یہیں سے یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ ''دین خالد'' ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس میں ہر دور کے پیدا کردہ تمام مسائل کا حل اوران کا شرعی حکم صریحی انداز میں اس طرح پیش کردیا گیا اور بتادیا گیا ہے کہ جو بھی نیا واقعہ سامنے آئے اس کے

لئے صاف اور صریح نص، قرآن یا حدیث میں موجود ملے؛ بلکہ اس کے دوامی اور عمومی ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ شارع کی طرف سے ایسے جامع اُصول اور کلی قواعد بتا دیئے گئے ہیں جن کی روشنی میں آئندہ پیش آنے والے، ہر دور کے تمام مسائل اور واقعات کا شرعی حکم دریافت کیا جا سکتا ہے، ان ہی اُصول اور قواعد کو صحیح اور مکمل طور پر جان لینے اور پھر ٹھیک ان ہی کی روشنی میں جزئی واقعات اور رونما ہونے والے حالات کے لئے شرعی احکام دریافت کرنے کی خاطر اپنی تمام علمی صلاحیتوں وقوتوں سے کام لینے بلکہ اسی راہ میں انھیں خرچ کر ڈالنے کا نام ''اجتہاد'' ہے، گویا اجتہاد ہی وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ غیر منصوص مسائل کے بارے میں

(۱) اسلام کا قیامت تک کے لئے پوری انسانیت کا دین ہونا قرآن مجید کی آیتوں: ''ان الدین عند اللّٰہ الاسلام ''اور'' من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه''نیز'' وما ارسلناک الا کافة للناس'' اور'' قل یا ایها الناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعا''وغیرہ آیات سے ثابت ہے،ان آیات کے علاوہ احادیث نبویہ بھی بکثرت اس پر دلالت کرتی ہیں،مثلاً:'' قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کان النبی یبعث الی قومه خاصة وبعث الی الناس عامة''(مسلم کتاب المساجد،حدیث نمبر:۱۱۶۳)ایک روایت میں یہ ہے:''ارسلت إلی الخلق کافة''۔(ترمذی،حدیث نمبر:۱۵۵۳،مسلم:۱/۱۱۶۸،کتاب المساجد)

شرعی حکم دریافت کیا جا سکتا ہے اسی وجہ سے ہر زمانہ میں نئے مسائل کا شرعی حکم معلوم کرنے کا سہ رشتہ گویا مجتہد یا فقیہ کے ہاتھ میں ہی رہتا ہے انداز تفصیل سے، اجتہاد نیز فقیہ ومجتہد کی ہر دور میں اہمیت وضرورت کا بھی اندازہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی شریعت کی روشنی میں چلانا ممکن ہی نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اجتہاد اسی طرح مجتہد کے بہت سے مدارج ہیں اور اسی فرق مراتب کے لحاظ سے ان کی اہمیت وافادیت میں بھی تفاوت ہے، جس پر کچھ آئندہ سطروں میں روشنی ڈالی جائے گی۔

اجتہاد کی اس اجمالی تعریف کے بعد علماءِ اُمت کے اقوال وآراء کی روشنی میں تھوڑی سی تفصیل پیش کر دینا بھی شاید بے محل نہ ہوگا اس سے یہ بھی وضاحت کے ساتھ سامنے

آجائے گا کہ علماءِ حق اجتہاد سے کیا حقیقت مراد لیتے ہیں اور ان کے نزدیک اس لفظ کی اہمیت کیا ہے، اسی سے کچھ اجتہاد کی عظمت ووسعت، گہرائی ودقت کا بھی اندازہ ہو سکے گا، پھر اجتہاد کے نام پر ہونے والی طفلانہ کوششوں اور حقیقی اجتہاد کے درمیان فرق کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔

''اجتہاد'' عربی لغت کے کثیر الاستعمال مادہ ''جہد'' سے ماخوذ ہے جس کے مشتقات کا استعمال اہل عرب عموماً ایسے افعال کے لئے کرتے ہیں، جن میں عادت سے زیادہ قوت وطاقت خرچ کی جاتی ہو یا ایسی حالت پر کہ جس کا تحمل دشوار ہو، مثلاً ''**جهد دابته وأجهدها**'' اس وقت مستعمل ہوگا، جب کہ جانور کو طاقت سے زیادہ چلنے پر مجبور کیا جائے، اسی طرح ''اجهد ماله'' اس وقت کہا جاتا ہے جب تمام مال تقسیم کر کے ختم کر دیا جائے، (**القاموس ومختار الصحاح**) لفظ اجتہاد کے اندر ''جہد'' میں ''ت'' کا اضافہ بھی ہے جس سے مزید کام کی طرف توجہ اور اس میں ہمہ تن انہماک کا مفہوم مستزاد ہو گیا، اسی بناء پر علماءِ اُصول نے ''اجتہاد'' کی جو تعریفیں کی ہیں ان سب سے قدر مشترک کے طور پر ''غایت درجہ کی کوشش یعنی تمام علمی وعملی صلاحیتیں خرچ کر کے حکم شرعی دریافت کرنے کے لئے کوشش کرنا'' مفہوم نکلتا ہے؛ چنانچہ ممتاز ترین مجتہد حضرت امام شافعیؒ جنھیں اُصول فقہ کا مؤسس کہا جاتا ہے کا مشہور مقولہ ہے :

إن المجتهد لا یقول فی المسئلة لا أعلم حتی یجهد نفسه فی النظر فیها ولم یقف کما انه لا یقول أعلم ویذکر ماعلمه حتی یجهد نفسه ویعلم ۔ (۱)

امام مذکور کے علاوہ دیگر علماء کے اقوال کا ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا اس لئے یہاں بعض ممتاز اُصولی علماء کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں :

۱- امام غزالیؒ: ''**بذل المجتهد وسعیه فی طلب العلم بأحکام الشریعة**''۔(۲)

۲- امام فخرالدین رازیؒ: ''استفراغ الوسع فی النظر''۔ (۳)

۳- محبّ اللہ البہاری: ''بذل الطاقة من الفقيه في تحصيل حكم شرعي''۔ (۴)

۴- علامہ زرکشی: ''بذل الواسع لنيل حكم شرعي''۔ (۵)

۵- عبدالعزیز بن احمد البخاری: '' بذل الجهد في استخراج الاحكام''۔ (۶)

۶- بیضاوی: ''استفراغ الجهد في درك الاحكام''۔ (۷)

۷- ملاخسرو: ''استفراغ المجهود في استنباط الحكم الشرعي''۔ (۸)

(۱) بحوالہ الاجتہاد: ۹۹، از: ڈاکٹر محمد موسیٰ توانا۔ (۲) المستصفیٰ: ۲/ ۳۵۔
(۳) المحصول: ۲/ ۶۹۴۔ (۴) مسلم الثبوت مع الشرح: ۲/ ۳۶۲۔
(۵) البحر المحيط: ۳/ ۱۲۸۱۔ (۶) کشف الاسرار: ۴/ ۱۱۳۴۔
(۷) المنہاج: ۳/ ۱۹۱۔ (۸) مرقاۃ الوصول: ۲/ ۴۶۴۔

۸- ابن السبکی: ''استفراغ الوسع لتحصيل ظن بحكم''۔ (۱)

علماء کے مذکورہ اقوال میں ''بذل الجهد ، استفراغ الوسع ، بذل الطاقة'' اوراس جیسے کلمات اسی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے کہ مجتہد کا اپنی تمام علمی صلاحیتیں اور عملی قوتیں، شرعی حکم کے دریافت کرنے میں خرچ کردینے کا نام اجتہاد ہے، اس کے بغیر کوئی مجتہد نہیں بن سکتا۔

امام شافعیؒ کے کلام میں تو یہ حقیقت بہت ہی صاف انداز میں موجود ہے، وہ تو یہاں

تک فرماتے ہیں کہ مجتہد کے لئے کسی مسئلہ سے لاعلمی کا اظہار کرنا بھی اس وقت تک درست نہیں جب تک وہ اپنی پوری کوشش نہ کرے (حکم دریافت کرنے میں) اسی طرح کسی حکم سے واقف ہونے کا اظہار بھی جہد بلیغ کے بغیر اس کے لئے روا نہیں۔

مجتہد کے لئے جو علوم ضروری ہیں ان کی تعداد بھی خاصی ہے، یہاں چند اہم ترین علوم کے ذکر پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

۱- لغت عربیہ کا ماہر ہونا جس میں صرف نحو، بلاغت، مفردات وتراکیب لغت اور مختلف اسالیب سے واقف ہونا داخل ہیں، بقول علامہ شاطبی مجتہد کے لئے ان علوم کے کم از کم اتنے حصے کا جاننا ضروری ہے، جس سے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں مدد لینا ضروری ہو، اس مقدار علم کے بغیر کوئی مجتہد نہیں ہوسکتا۔ (۲)

۲- علم اُصولِ فقہ جاننا بھی ضروری ہے؛ بلکہ اس کی اہمیت ایک اعتبار سے تمام علوم سے بڑھی ہوئی ہے (مجتہدین اولین کے زمانے میں اگرچہ یہ علم دیگر بہت سے علوم کی طرح مدون نہ تھا؛ لیکن بہرحال یہ اُصول موجود تھے، جنھیں بعد میں ترتیب دے دیا گیا۔

۳- امام غزالیؒ وامام رازیؒ اور ان کے اتباع میں دیگر علماء اُصول نے بھی (مثلاً بیضاوی، اسنوی اور بدخشی نے) علم منطق کا جاننا بھی مجتہد کے لئے ضروری بتایا ہے؛ کیوں کہ

(۱) جمع الجوامع: ۲/ ۳۸۹، بحوالہ الاجتہاد، از: ڈاکٹر سید محمد توانا۔ (۲) الموافقات: ۴/ ۱۰۸۔

اس سے تجزیہ واستدلال کی قوت میں جلا پیدا ہوتی ہے اور دلیل کی صحت وغلطی کا پتہ چلتا ہے۔

۴- قرآن کی کامل معرفت بھی مجتہد کے لئے ضروری ہے اور یہ موقوف ہے بہت سے اُمور پر مثلاً مقصد شارع سے واقف ہونا، لغوی معنی جاننے کے علاوہ اسالیب کلام، احکام کی علت جاننا نیز لفظی ومعنوی اعتبار سے جو مختلف اقسام ہیں، مثلاً اشارۃ النص، دلالۃ النص، منطوق، مفہوم، فحویٰ، ظاہر، نص، مفسر، محکم، عام، خاص، مطلق، مقید، مشکل، مجمل، مشترک اور حقیقت ومجاز، پھر حقیقت کی مختلف قسمیں مہجورہ، متعذرہ، مستعملہ اور مجاز کے اقسام متعارف وغیرہ متعارف ان سب کے علم کے ساتھ یہ بھی جاننا کہ ان میں سے کس قسم

سے قطعی حکم مستفاد ہوتا ہے اور کس سے ظنی، پھر یہ کہ تعارض کی شکل میں ان میں سے کس کو کس پر ترجیح دی جائے گی اور کون مرجوح قرار دی جائے گی۔

عام طور پر یہ جو مشہور ہے کہ صرف پانچ سو آیتیں احکام پر مشتمل ہیں، بقیہ دوسرے مضامین پر، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ براہِ راست احکام پر دلالت کرنے والی پانچ سو آیات ہیں ورنہ علامہ طوفی کے قول کے مطابق (۱) شاید ہی کوئی آیت ایسی ہو جس سے کوئی نہ کوئی حکم مستفاد نہ ہوتا ہو، یعنی تقریباً تمام آیات سے کسی نہ کسی طرح کوئی حکم نکلتا ہے، غالباً اسی لئے امام شافعی وغیرہ نے مجتہد کے لئے پورے قرآن مجید کا حافظ ہونا بھی شرط قرار دیا ہے اور مشہور شافعی فقیہ اور اُصولی عالم علامہ شاطبی نے قرآن فہمی کے لئے عربوں کی عادات اور ان کے جاہل اعتقادات وغیرہ کا جاننا بھی ناگزیر بتایا ہے کہ اس کے بغیر قرآن مجید کے بہت سے مقامات کا سمجھنا ناممکن ہے۔(۲)

۵- قرآن مجید اور اس کے متعلقات سے کامل واقفیت کے علاوہ حدیث اور اس کے متعلقات (جو قرآنی علوم سے کیفیت اور کمیت دونوں میں زیادہ ہیں) کا جاننا بھی ضروری ہے، یعنی ان کے معنوی و لفظی اقسام کے علاوہ کہ جن کا ذکر قرآن مجید کے ذیل میں ہو چکا ہے، حدیث کی سند، رجالِ حدیث، اس کے مرتبہ، صحیح و ضعیف پھر صحیح کے مدارج

(۱) بحوالہ الاجتہاد:۸۰۔ (۲) الموافقات:۳/۳۵۱-۳۵۲۔

مثلاً تواتر، مشہور، مستفیض، عزیز، غریب وغیرہا اسی طرح ضعف کی قسمیں اور اس کے مدارج مثلاً ارسال، انقطاع، جہالتِ راوی، تفرد، نکارت، اضطراب، ادراج، شذوذ، علت خفیہ، وضع، وغیرہا کا جاننا بھی از بس ضروری ہے، یہ اور اس کے علاوہ دیگر تفصیلات جانے بغیر اور یہ ہفتخوان طے کئے بنا کوئی شخص مجتہد نہیں بن سکتا اور ان سب کے ساتھ احادیث احکام کا علم بھی ضروری ہے؛ اگرچہ ان کی تعداد میں علماء کے مختلف اقوال ہیں؛ لیکن امام احمد نے چار لاکھ اور ایک روایت ہے کہ پانچ لاکھ روایات کے حفظ پر —— مجتہد کے لئے ——

اطمینان ظاہر کیا، (۱) یعنی اس تعداد کے حفظ کے بغیر امام احمد کے نزدیک کوئی قابل اطمنان مجتہد نہیں بن سکتا، ان کے علاوہ اور بھی بعض علوم وفنون سے مناسبت ہونی چاہئے، یہاں ان سب کا نہ استیعاب مقصود ہے، نہ اس کی چنداں ضرورت، بہر حال مقصود ہے نہ اس کی چنداں ضرورت بہر حال مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ مجتہد کا رتبہ بلند ہر کس و ناکس کو نہیں مل سکتا، اس کے حصوں کے لئے وہبی صلاحیتوں کے علاوہ کسبی علوم کے لئے محنت شاقہ، ژرف نگاہی اور بلند حوصلگی ناگزیر ہے، ایک شخص میں ان سب کا اجتماع قرونِ اولیٰ میں بھی کم ہی ہوسکتا ہے، بعد کے زمانے میں اور بھی نادر ہوگیا، اس عملی تجربہ اور مشاہداتی حقیقت کو سامنے رکھ کر ہی کہا گیا تھا:

إن الاجتهاد المطلق اختتم بالأئمة الأربعة . (۲)

اسی بنا پر امام رازیؒ (م:۶۰۶)، امام رافعیؒ (م:۶۲۴) اور امام نوویؒ (م:۶۷۶) پکار اُٹھے تھے:

إن الناس كالمتفقين اليوم ان لا مجتهد .

یعنی آج تمام لوگ اس پر متفق نظر آتے ہیں کہ کوئی مجتہد نہیں رہا۔

(۱) اعلام الموقعین:۱/۵۰، ارشاد الفحول:۳۳۳، بحوالہ الاجتہاد:۱۸۵، آیات احکام کی تعداد کی طرح احادیث احکام کی تعداد میں بھی خاصا اختلاف ہے، پانچ سو سے لے کر پانچ لاکھ تک کی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔

(۲) فواتح الرحموت، شرح مسلم الثبوت:۲/۳۹۹ (بحر العلوم)۔

چنانچہ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں بھی کسی ایک شخص کے اندر شرائط اجتہاد جمع نہیں ہوسکے؛ چہ جائیکہ بعد کی صدیوں میں جب کہ علم و ہمت دونوں روبزوال ہوگئے؛ لیکن مجتہد مطلق کی نفی کا مطلب یہ نہیں کہ ہر درجہ کے مجتہد مفقود ہوگئے اور چوتھی صدی ہجری شروع ہونے کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کے حل سے علماء قاصر رہے اور انھوں نے ''اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا'' کا عذر پیش کرکے راہنمائی کا فریضہ ادا کرنے سے گریز کیا ایسا سمجھنا یا کہنا نہ صرف علماء کے ساتھ سوء ظنی کا مظہر ہے؛ بلکہ خود

''اسلام'' پر بھی اس سے حرف آتا اور تہمت لگتی ہے، نیز واقعات اور تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے، فقہ اسلامی کی پوری تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ علماء نے مجتہد مطلق کے مرتبہ پر فائز نہ ہونے کے باوجود ان ہی کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر محدود اجتہاد کر کے اپنے زمانہ کے ہر ہر چیلنج کا مقابلہ کیا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بارہ صدیوں تک مسلسل تقریباً نصف متمدن دنیا پر حکومت مسلمہ قائم نہیں رہ سکتی تھی اور عرب کے سادہ مزاج اور معمولی زندگی کے عادی روم وفارس کی سی متمدن ترین سلطنتوں کے حکمراں اور وہاں کے متمدن ومثقف عوام کے سربراہ ہمیشہ کے لئے نہیں بن سکتے تھے، دور کیوں جایئے خود ہمارے ملک ہندوستان میں مسلمانوں کو کم وبیش سات صدیوں تک سربراہی کی ذمہ داریاں پورا کرنے کا موقع ملا، عرب وہند کے مابین طویل مسافت، اسی کے ساتھ تمدن، ثقافت، زبان حتیٰ کہ غذاؤں کے اختلاف کے باوجود عربی نژاد نبی اُمی (فداہ ابی وامی) کے لائے ہوئے دین کو جس حکمران نے بھی اپنی حکومت کے نظم کے لئے (جس درجہ میں بھی) معیار بنایا اور اسے نافذ کرنا چاہا علماء کی راہنمائی اور قانون شریعت کی ہمہ گیری نے اسے ناکام یا معذرت خواہ ہونے کا موقعہ نہیں دیا اس کی بالاتری اور کامیابی کا ایک ثبوت یہ کیا جاسکتا ہے کہ ابھی نصف صدی قبل، خلافت کے آخری وارث ملک یعنی مرحوم ترکی (جس کے حدود سلطنت ایشیاء وافریقہ، یورپ تین براعظموں تک پھیلے ہوئے تھے) نے پوری آن بان اور شکوہ کے ساتھ علماء شریعت کے تیار کردہ دستور مملکت ''**مجلة الاحکام العدلیة**'' کی روشنی میں نظم مملکت چلایا اور کبھی اسے شرمسار قانونی خامی کی بناء پر نہیں ہونا پڑا — تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی خداترس حکمراں نے اسلامی قانون نافذ کرنے اور اس بارے میں نیک قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا، علماء عصر نے زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق اسلامی قانون مرتب کر کے پیش کیا، یا ہر ہر موڑ پر رہنمائی کے لئے فقہ اسلامی کی برتری بلکہ زندگی وتازگی کا اعتراف کیا کرایا کہ قاضی ابو یوسف کی 'کتاب الخراج' ابو عبید کی 'کتاب الاموال' سرخسی کی 'المبسوط' اقضی القضاۃ الماوردی کی 'الاحکام السلطانیۃ' ابن رشد اول کی المقدمات امام

غزالی کی الوجیز، ابن قدامہ کی الکافی، ابن حزم کی المحلی، مرغینانی کی ہدایہ اخیرین، کاسانی کی بدائع صنائع، ابن قیم کی اعلام الموقعین، ابن ہمام کی فتح القدیر، ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر، جامع الفصولین اور ابن عابدین کی ردالمحتار اور اپنے ملک ہندوستان میں ملا محمد عطاری کی فوائد فیروز شاہی، عالم بن علاء الدہلوی کی فتاوی تاتارخانیہ، قاضی جگن گجراتی کی خزانۃ الروایات، مفتی ابوالفتح کے فتاوی حمادیہ، نظام الدین کی ابراہیم شاہیہ، قاضی ضیاء الدین سنامی کی فتاوی ضیائیہ اور سب سے بڑھ کر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی عظیم یادگار فتاوی عالمگیریہ (جسے ۲۰ ممتاز ترین علماء نے مرتب کیا اور جس پر اس ارزانی کے زمانے میں دولاکھ روپے خرچ ہوئے) یہ اور ان کے علاوہ ہزاروں کتب فقہ وفتاویٰ اس امر کی شاہد ہیں کہ علماء کسی دور میں بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے؛ بلکہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو بطریق احسن انجام دیا (**فجزاھم اللہ احسن الجزاء**) اور یہ سب اسی اجتہاد کا رہین منت ہے جس کا تخم قرن اول ہی میں بودیا گیا تھا جو بعد میں تناور درخت بنا پھر جس کی چار شاخیں چہاردانگ عالم میں پھیلیں اور ان ہی کے سائے میں آسودہ ہوکر علماء نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور علمی سفر جاری رکھا، علماء کی یہ رہنمائی صرف حکمرانوں کی خاطر یا مسلم اقتدار کے ادوار ہی میں نہیں رہی؛ بلکہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں طور پر وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے صرف ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار چھن جانے کے بعد ہی کے علماء کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو احاطہ ناممکن ہوجائے — ہزاروں علماء کے لاکھوں فتاوے جن میں عموماً وقتی مسائل سے ہی تعرض کیا جاتا اور جواب دئے جاتے رہے — کے علاوہ پیش آمدہ اہم مسائل پر مستقل سینکڑوں رسالے اور کتابیں موجود ہیں، صاحب فتاویٰ علماء اور ان کے فتاوی کے ذخیرہ کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے شاید یہ ذکر کردینا کافی ہوگا کہ ماضی قریب کے ایک ممتاز ترین عالم عبدالحی فرنگی محلی کے فتاوے تین ضخیم جلدوں میں سما سکے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے فتاوے کی ترتیب کا کام تقریبا دس بارہ سال سے ہورہا ہے،

سات جلد شائع ہوسکی ہیں، ہر جلد کی ضخامت ۳۰۰-۴۰۰ صفحات یا اس سے بھی زیادہ ہے؛ لیکن ابھی نصف تعداد ہی شائع ہوسکی ہے، اسی طرح حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کے فتاوی کی ابھی ۵ جلدیں شائع ہوئی ہیں جن میں صرف عبادات سے متعلق فتاوی بھی سب نہیں آسکے ہیں نیز اس میدان کے سب سے نامور عالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجموعہ فتاوی امدادیہ کے جدید ترین ایڈیشن کی صرف پہلی جلد ۸۴۳ صفحات میں آسکی ہے اس جیسی ۶ یا ۷ جلدوں میں تمام فتاوے سماسکتے؛ اس لئے فتاوی مجموعہ کی نشاندہی سے احتراز کرتے ہوئے یہاں صرف چند علماء کے ان چند رسائل کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، جن میں وقتی مسائل پر قلمی رہنمائی کی گئی ہے اور پیش آمدہ مسائل کا فقہی حل بتا کر گویا شریعت کے دوام وبقاء کی دلیل فراہم کی۔

اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں صرف رسالوں اوران کے مصنفین کے ناموں کی کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا، کہیں ضروری سمجھا گیا تو تعارف بھی کرادیا جائے گا۔

۱- سب سے پہلے اہم ترین عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے چند رسائل کا نام ذکر کرنا مناسب ہوگا، مولانا انہی تصانیف کی کثرت اور علمی وسعت میں عالمی شہرت کے مالک ہیں۔

(۱) **الفلک المشحون فیما یتعلق بإنتفاع المرتهن با لمرهون**، دخلی رہن کا قانون بننے پر اس کے شرعی حکم کی تفصیل رسالہ میں بیان کی گئی ہے۔

(۲) **الفلک الدوّار فی رؤیه الهلال بالنهار**، چاند نظر آجائے تو شرعی حکم کیا ہے، اس کی تفصیل۔

(۳) **ترویح الجنان بتشریح کم شرب الدخان**، حقہ، بیڑی سگریٹ پینے، پلانے کا شرعی حکم۔

(۴) **زجر أرباب الريان عن تشريح حكم شرب الدخان**، روزہ میں حقہ وغیرہ پینے پلانے کا حکم۔

(۵) **ردع الاخوان عن محدثات آخر جمعة رمضان**، الوداع کے جمعہ کو ہندوستان میں غیر معمولی اہمیت دی جاتی دیکھ کر مولانا نے اس پر متنبہ کیا۔

(۶) **آکام النفائس فی أداء الأذکار بلسان فارس**، عجمی زبانوں میں ذکر اللہ کا مسئلہ پیش آیا تو مولانا رسالہ لکھ کر شرعی حکم بتلایا۔

۲- اس خانوادہ کی مختلف موضوعات پر بکثرت تصانیف ہیں، جس میں یہ خاندان مشہور ہے، یہاں صرف ایک اور فرنگی محلی عالم مولانا محمد معین ملا محمد مبین کے ایک رسالہ ''**غاية البيان فيما يحل ويحرم من الحيوان**'' کا ذکر کیا جاتا ہے، جس میں کونسے جانور حلال ہیں اور کون کونسے حرام، تفصیل سے بتایا گیا ہے۔

۳- ہندوستان سے مسلم اقتدار ختم ہوتے ہوئے طرح طرح کے مسائل سامنے آئے، ان میں ایک مسئلہ یہ تھا کہ چوں کہ بعض کتب فقہ میں ''جمعہ'' کی صحت کی شرائط میں موجودگی سلطان یا نائب سلطان کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے ہندوستان میں غیر مسلم اقتدار کے زمانے میں جمعہ فرض ہوگا یا نہیں، جب یہ مسئلہ کھڑا ہوگیا تو اس کے جواب میں کئی علماء نے رسالے لکھے ان میں ایک رسالہ بنام ''**شواهد الجمعة فی ابطال شرطية السلطان لإقامة الجمعة**'' شیخ علی حبیب بن ابی الحسن پھلواروی نے لکھا جس میں فرضیت جمعہ ثابت کی گئی ہے۔

۴- ان کے بالمقابل ایک دوسرے عالم شیخ جان محمد لاہوری ایک مختصر رسالہ فارسی میں لکھ کر عدم فرضیت کو ترجیح دی، یہاں اس سے بحث نہیں کہ کونسا مسلک راجح اور قوی ہے، دکھانا یہ کہ علماء نے ایک مسئلہ سامنے آنے پر اپنی تحقیق کے مطابق مسئلہ کا حل پیش کیا۔

۵- جب پوری دنیا کی طرح ہندوستان میں بھی انگریزی دواؤں کا استعمال عام ہوا اور یہ بات سامنے آئی کہ اکثر دواؤں میں ''الکوہل'' جو شراب کی قسم سے ہے، شامل ہوتی ہے اس سے یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ایسی دوائیں شرعاً استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں اسی کا جواب متعدد علماء کے علاوہ مولانا عادل بن محمد ناروی نے ''**تحقیق الکلام فی التداوی**

بالشيىء الحرام'' رسالہ لکھ کردیا۔

۶،۷- جب لڑکیوں کی تعلیم کا رواج عام ہوا تو اس کے سامنے آنے لگے علماء بھلا اس صورتِ حال پر خاموش کیسے رہ سکتے تھے؛ چنانچہ متعدد رسائل وجود میں میں آئے ان میں ایک رسالہ محدث شہید مولانا شمس الحق ڈیانوی کا ''**عقود الجمان جواز الكتابة للنسوان**'' اور ایک مولوی وکیل احمد سکندر کا ''**تنقيح البيان بجواز كتابة النسوان**'' منظر عام پر آیا اور اس میں عورتوں کی تعلیم خاص طور پر لکھنے کے جواز پر گفتگو کی گئی ہے کہ ان کا پڑھنے سے زیادہ لکھنا ہی فتنہ کا موجب بنتا ہے۔

۸،۹،۱۰- بندوق کا رواج ہوا اور اس کے ذریعہ شکار بھی کیا جانے لگا تو یہ مسئلہ کھڑا ہوگیا کہ گولی سے ہلاک شدہ جانور کو تیر کے ذریعہ کئے جانے والے شکار کا حکم دیا جاسکے گا یا نہیں؟ اس موضوع پر بڑا علمی معرکہ گرم ہوا اور متعدد رسالے لکھے گئے، ان میں ایک سب سے اہم رسالہ مولانا سید عرفان ٹونکی نے بنام ''**زكوٰة الصيد بما اصابه الرصاص**'' ایک شیخ محمود حسن ٹونکی اور ایک شیخ محمد یوسف سورتی نے لکھا۔(۱)

اختصار کے پیش نظر صرف ان دس ہندوستانی علماء کے کارناموں کے ذکر پر اکتفاء کیا جاتا ہے؛ لیکن شاید اتنا ذکر بھی علماء کی ذمہ داریوں کے احساس اور وقتی تقاضوں کے پورا کرنے میں پیش قدمی کرنے کے عمل کو سمجھنے کے لئے کافی ہوگا، اخیر میں ایک اور ہندوستانی، کثیر التصانیف عالم اور عارف باللہ شیخ حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی کے گیرانقدر کارناموں کی نہایت مختصر فہرست پر یہ باب ختم کیا جاتا ہے، یہ تو سب اہل علم جانتے ہیں کہ مولانا موصوف کی چھوٹی بڑی تمام تصانیف ایک ہزار کے قریب ہیں، جن میں بہشتی زیور اور بیان القرآن جیسی ضخیم کتابیں بھی ہیں اور ''التقى فى احكام الرقى'' جیسا مختصر چند ورقی رسالہ بھی ہر پیش آمدہ مسئلہ پر اُمت کی رہنمائی کی چنانچہ اکثر ایسے نئے مسائل پر رسائل

(۱) بحوالہ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند (تالیف مولانا سید عبدالحئ حسنی) ص:۱۰۸ تا ۱۱۶۔

تحریر کئے جو شائع ہوکر نفع عام کا ذریعہ ہے، اس کے علاوہ ہزاروں مسائل پر فتاویٰ، جن میں بعض بہت تفصیلی ہیں، تحریر فرمائے جو بہت سے وقتی مسائل سے بھی متعلق ہیں، ایسے چند اہم رسالے اور فتاویٰ مولانا نے نفع عام کے لئے ''بوادر النوادر'' نامی کتاب میں جمع فرما کر شائع کرادے جس کی ضخامت ۸۰۰ صفحات سے زیادہ ہے، یہاں ان سب کا تذکرہ تو ممکن ہی نہیں ہے صرف چند رسائل مختصر تعارف کے ساتھ یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

۱- ''**رسالة التحقيق الفريد فى حكم آلة تقريب الصوت البعيد**'' لاؤڈ اسپیکر کے رواج اور اس کے نماز واذان کے اندر کا شرعی حکم اس میں بتایا گیا ہے۔

۲- ''**ضم شادر الابل فى ذم شارد ابل**'' انگریزی حکومت نے جب شادی کی عمر کی تعیین کا قانون ''شاردا بل'' کے نام سے پاس کیا تو مولانا نے شرعی نقطۂ نظر سے اس پر تنقید کی اور رد لکھا۔

۳- ''**تصجيح العلم فى تقبيح الفلم**'' جب فلم اور سنیما عام ہوئے تو مولانا نے اس کے دیکھنے کا شرعی حکم اس رسالے کے ذریعہ واضح کیا۔

۴- ''**صاحب الكلام فى حكم مناصب الحرام**'' غیر مسلم حکومتوں کی ملازمت خاص طور پر شعبۂ عدالت کی ملازمتوں کا مسلمانوں کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ اسی کا جواب رسالے میں دیا گیا ہے۔

۵- ''**المقالات المفيدة فى حكم أصوات الآلات الجديدة**'' ریڈیو وغیرہ پر قرآن شریف پڑھنے سننے اور اس قبیل کے دیگر مسائل کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

۶- ''**تحذير الاخوان عن الربا فى الهندوستان**'' ہندوستان کو دارالحرب ماننے کی صورت میں یہاں بعض علماء نے سود کے جواز کا فتویٰ دیا تھا، مولانا نے اس کی تردید کرتے ہوئے سود کو ناجائز بتایا۔

۷- ''**رافع الضنک عن منافع البنک**'' بنکوں کے رواج کے ساتھ ان سے ملنے اور انھیں اور انھیں دینے والے انٹرسٹ کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا نے شرعی حکم اس

رسالے میں تفصیل سے بیان کیا۔

۸- ’’قائد قادیان‘‘ جب غلام احمد قادیانی کا فتنہ اُبھرا تو مولانا نے ان کا کلام اور دُعاوی کا تجزیہ کر کے اس فرقہ کے عقائد کی شرعی حیثیت بیان کی۔

۹- ’’شق العین عن علی وحسین‘‘ جنگ آزادی کے زمانے میں مسلمان دو نظریوں، متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ میں بٹے ہوئے تھے اور اس نظری اختلاف نے جنگ وجدال اور سب وشتم کی صورت اختیار کر لی تھی، مولانا نے اپنے نقطہ نظر سے جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے، اس نظریہ کی صحت دلائل شرعیہ سے ثابت کی اور سب وشتم سے روکا۔

۱۰- ’’**الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة**‘‘ یہ رسالہ جو ایک کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، اب محتاج تعارف نہیں رہا، جہالت کے سبب اور اسلامی حکومت کی نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر شوہر اپنی بیویوں پر ظلم ڈھاتے، مگر عورتیں گلوخلاصی ان سے نہ کرا پاتیں ایسے بعض اور وجوہ سے منکوحہ عورتیں ظلم وستم کا شکار بنیں، مگر حبالہ نکاح سے انھیں چھٹکارا نہ ملتا، اس صورت حال نے مولانا کے حساس دل کو بے قرار اور ضمیر کو جھنجھوڑا تو مولانا نے ایسی ستم رسیدہ عورتوں کی گلوخلاصی کی شرعی تدبیریں رسالے میں بیان کیں، تمام دنیا کے ممتاز علماء کے فتاویٰ اور تائیدیں حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے کی کوشش کی۔

یہ چند رسائل مولانا کے علمی اور قلمی کارناموں کے مقابل میں ایسے ہیں جیسے سمندر کے چند قطرے، مگر اختصاراً اتنے پر اکتفاء کیا جارہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو نیا مسئلہ بھی مولانا کے سامنے آیا، یا لایا گیا اور شاید کوئی ہو جو رہ گیا ہو، مولانا نے اپنی رائے شریعت غرّا کی روشنی میں پیش کی اور اُمت کی معتدبہ تعداد نے اسے قبول کیا، اب جب کہ بدقسمتی سے مولانا کے درجہ کی کوئی شخصیت نہیں ہے کہ جس کے علم، تقویٰ اور تفقہ پر اتنا اعتماد کیا جاتا ہو تو ضرورت تھی کہ ایک فرد کے بجائے متعدد وسیع النظر علماء کی جماعت جن کی دھانت اور علم پر اعتماد کیا جاتا ہو اس ذمہ داری کو سنبھالے، چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ علماء اس ذمہ داری سے غافل نہیں رہے اور انھوں نے متعدد مجلس تحقیقاتِ

شرعیہ جس نے کئی اہم وقتی مسئلوں پر اجتماعی فیصلے یا رسالے شائع کر کے راہنمائی کا فریضہ کسی درجہ میں ادا کیا۔

لیکن اب زمانہ کی تیز رفتار ترقی اور مسائل حاضرہ کی پیچیدہ شکلوں نے یہ ضرورت سامنے لا کھڑی کی ہے کہ علماء شریعت کے ساتھ ماہرین قانون اور سائنس داں بھی پورا تعاون کریں؛ تاکہ سائنسی ایجادات اور مجالس قانون ساز کے بنائے ہوئے بتانے میں سہولت ہو، اگر یہ سیمینار ایسا مستقل مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی یہ ایسی بڑی کامیابی ہوگی جس پر یہ سیمینار جتنا بھی فخر کرے کم ہے، آخر میں راہِ صواب پر چلنے کی توفیق مانگنے کے بعد آپ حضرات کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔

☆ ☆ ☆

غیر مسلموں میں تبلیغ

ایک دینی فریضہ اور ملی وسیاسی ضرورت

اس میں کسی ذی عقل کے لئے شبہ کی گنجائش نہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ سب کا پیدا کرنے اور پالنے والا ہے ایک نہایت حکیم و دانا اور قادر و توانا ہے، یہ حقیقت نہ صرف آسمانی کتابوں اور خدا کے پیغمبروں نے بیان کی ہے؛ تمام سلیم الفطرت انسانوں کی فطرت پکار پکار کر اس کا اعلان و اعتراف کرتی آرہی ہے، ایک قدیم عرب شاعر نے ’’کل الی ذات الا له يشير ‘‘ کے بلیغ انداز میں یہی اظہار واعتراف کیا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ مشرکین عرب بھی اسی ایک کو تمام کائنات کا خالق ورازق مانتے تھے، شاہ ولی اللہؒ نے (اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ میں) نقل کیا ہے کہ یہ حقیقت مشرکین عرب وغیرہ کے درمیان بھی تسلیم شدہ تھی، موصوف کے الفاظ ہیں: ’’القرآن ناص على انهما من المقدمات المسلمته عنه همه‘‘ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس واضح و مسلم حقیقت سے عملی وفکری انحراف وروگردانی کی تکلیف دہ کہانی (یعنی شرک و بت پرستی کی روایت) اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسان کی معلوم تاریخ چنانچہ آدم ثانی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک یہ مرض اور مریض ذہنیت برابر چلی آرہی ہے۔

اس مرض کی سنگینی اور اس کے ازالہ کی تدابیر کے ضروری ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، از آدم تا ایندم ان مساعی کا تسلسل چلا آرہا ہے، جن پر یہ مرض زائل ہو
-

پہلے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقریباً ایک لاکھ انبیاء علیہم السلام اسی مہم پر بھیجے گئے اور سب نے آکر یہ پیغام دیا ’’يقوم اعبد وا الله مالكم من إله غيره‘‘ اور اسی زریں سلسلہ کے خاتم وآخر کی بعثت کے بعد یہ ذمہ داری وارثین کے انبیاء علیہ السلام کے سپرد کی گئی، جسے وہ بطریق احسن انجام دیتے رہے، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ظلمت شرک و کفر برابر سکڑتی اور نور ایمانی مسلسل پھیلتا رہا، تاکہ آج کلمہ گو یوں کی تعداد قرون اولیٰ کے

مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، مردم شماری کے اعداد وشمار کے مطابق مسلمان کل انسانی آبادی کا کم وبیش بیس فیصد حصہ ہیں؛ لیکن مسلمانوں کی تعداد کے یہ خوش کن اعداد وشمار، داعی اور مبلغ حضرات کے لئے اسلاف اور پیشرو حضرات کی مساعی کا اندازہ کرنے اور ان کے کام کرنے کی غرض سے ذکر کردیئے گئے ہیں۔

اس وقت تک کسی داعی کے لئے چین و اطمینان سے بیٹھنا درست نہیں، خاص طور پر ایسے ملک میں جہاں صورتِ حال یہ ہو کہ سینوں کے اندر نور ایمان کی جھلملاتی ہوئی شمع بجھا دینے کے لئے بڑے بڑے مناخ (پھونک مارنے والے آلات) حکومت وعوام کی پوری طاقت کے ساتھ استعمال کئے جارہے ہوں، وہاں داعی حضرات پر نہ صرف ان آلات کے اثرات کا توڑ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ بلکہ جو لوگ نور ایمان سے ابھی تک محروم ہیں ان تک یہ روشنی پہنچانا بھی داعی کے فرائض میں داخل ہے، اس کے لئے بقدر استطاعت و وسعت ہر ایک داعی پر تمام صلاحیتوں کا بروئے کار لانا ضروری ہے اور کسی قسم کی کوتاہی وتساہل کو راہ دینے کی گنجائش نہیں (مسلمانوں کا اسلامی اخلاق اور شرعی قوانین واُصول کا معاملات وغیرہ میں پوری طرح اپنانا بھی تبلیغ کا اہم ذریعہ بن سکتا ہے؛ کیوں کہ اس راہ میں کوتاہی نہ صرف خداوند تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بلکہ مسلمانوں کی دنیاوی تباہی کا سبب بھی بن سکتی ہے، جس طرح دریا اپنی روانی چھوڑنے کے بعد باقی رہتا؛ بلکہ اس کا پانی سڑ کر بدبو پھیلانے لگتا ہے، اسی طرح جو دین اشاعت پذیر نہیں رہتا، وہ اور اس کے ماننے والے بھی سمٹتے سمٹتے بالآخر مٹ جاتے ہیں، جس پر مذاہب و ادیان عالم کی تاریخ گواہ ہے، شاید یہی وہ راز یا سبب ہے جس کی بنا پر بعض ایسے ادیان والے بھی اپنے اپنے دین کو تبلیغی کہنے اور اس کی اشاعت پر بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے جو اصلاً تبلیغی اور اشاعتی نہیں تھا، مثلاً عیسائی مذہب کے وہ اصلاحات بنی اسرائیل کے لئے تھا، جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صریح اقوال اور اللہ کا کلام دال ہے، خلاصہ یہ کہ ہندوستان جیسے ملک میں اسلام کی (غیر مسلموں میں) تبلیغ کرنے کی اہمیت نہ صرف شرعی ودینی ہے، بلکہ ملی، سیاسی، عمرانی، تمدنی

اور عقلی بھی ہے کہ اس کے بغیر عالم اسباب میں مسلمانوں کا ہندوستان میں وجود و بقا خطرہ میں پڑ سکتا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی فریضہ کی عدم ادائیگی خداوندی غضب کا مستحق بنا سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

معاشرہ کی اصلاح سے متعلق کچھ ضروری باتیں

سب واقف جانتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جس کی تعلیمات وہدایات انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں، پیدائش سے لے کر وفات تک جتنے مراحل آتے ہیں ان سب کے لئے احکام وضوابط موجود ہیں، اس وقت ان تمام احکام کا بیان اور پیش کرنا مقصود نہیں، صرف اس حصہ کا مختصر ذکر مقصود ہے جو شادی بیاہ، طلاق ووراثت وغیرہ سے متعلق ہے، جسے عام طور پر ”عائلی نظام“ کہتے ہیں؛ کیوں کہ آج کل ان کی خلاف ورزی عام ہورہی ہے جس کے نتیجہ میں مسلمان دنیا میں بھی سخت پریشانی کا شکار ہورہے ہیں اور آخرت میں بھی باز پرس اور سزا کا خطرہ ہے، عائلی قوانین کی پابندی نہ کرنے کی ایک وجہ مسلمانوں کی ان قوانین سے لاعلمی بھی ہے، اس لئے بھی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان کا مختصر انداز میں تذکرہ کرکے عام مسلمانوں کو باخبر کیا جائے، اس قسم کے قوانین (عائلی قوانین) کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے تنہا یہ بتادینا کافی ہوگا کہ قرآن مجید کی چھ سورتوں، بقرہ، نساء، نور، احزاب، ممتحنہ اور طلاق میں تقریباً چالیس آیتوں کے اندر یہ بیان ہوئے ہیں اور ان احادیث نبویہ کا تو شمار ہی مشکل ہے جن میں اس قسم کے احکام وہدایات دی گئی ہیں، ان سب میں جو بہت اہم ہیں ان پر علاحدہ علاحدہ یہاں گفتگو کی جارہی ہے۔

نکاح

سب سے زیادہ شرعی قوانین کی خلاف ورزی، بلکہ پامالی، نکاح یعنی شادی بیاہ کے موقع پر کی جاتی ہے اور عجیب قابل افسوس بات ہے کہ شادی کے موقع پر ہر ایک عزیز کو راضی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؛ حتیٰ کہ ملازموں، خادموں اور نوکروں کو بھی، مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے بجائے شرعی احکام کی خلاف ورزی کرکے ناراض کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے موقع پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے کی پوری کوشش کی جاتی (خواہ اس کے نتیجہ میں کوئی بھی

انسان ناراض ہوتا) شادی کے موقع پر، عورت (دولہن) پر شرعاً کوئی خرچ لازم نہیں ہے، نہ جہیز، نہ بارات کو کھانا کھلانا، نہ باراتیوں کی خاطر مدارت کرنا، بلکہ لڑکے (ہونے والے شوہر، دولہا) کی یا اس کے سرپرستوں کی طرف (باپ وغیرہ) سے جہیز کا یا بارات کو کھانا کھلانے کا یا ان کی خاطر مدارات کرنے کا مطالبہ کرنا اور انھیں اس پر مجبور کرنا، شرعاً ممنوع ہے، اگر بارات کے لئے کھانے یا ناشتہ کا، لڑکی یا اس کے سرپرستوں نے جبراً انتظام کیا تو اس کا کھانا کسی باراتی یا دولہا اور اس کے رشتہ داروں تک کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے: ''**لا یحل مال أمری مسلم الا بطیب نفسه**'' اسی طرح اگر فرمائش کر کے جہیز لیا گیا یا نقد رقم لی گئی تو وہ بھی مرد (دولہا) کے لئے جائز نہیں، نہ اس کا استعمال کرنا جائز ہے؛ بلکہ شرعاً اسے واپس کرنا ضروری ہوگا، نکاح کے وقت جو اور بہت سی رسمیں غیر مسلموں کے دیکھا دیکھی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں ان سے بھی بچنا چاہئے، مثلاً گانا، باجا، ویڈیو کا استعمال غیر محرم مردوں اور عورتوں کا ایک ساتھ بیٹھنا اُٹھنا، کھانا پینا، غیر محرم مردوں کے سامنے عورتوں کا بے حجاب سامنے آنا وغیرہ، عقد نکاح کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ چند مسلمانوں، کم از کم دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ہو؛ چوں کہ دلہن (عورت) گھر کے اندر ہوتی ہے، اس لئے ایک شخص اس کی منظوری لے کر آئے (ایجاب کرائے) اور اس وقت دو اور مردوں کو وہاں موجود رہنا چاہئے تاکہ وہ ایجاب کی تصدیق کر سکیں اور ضرورت پڑے تو گواہی دے سکیں، اجازت لینے والا شخص دولہا کے پاس آکر دلہن کے ایجاب کو پہنچائے اور اسی مجلس میں دولہا اسے قبول کرلے، نکاح (ایجاب وقبول) کے وقت خطبہ پڑھنا بھی مسنون ہے، فرض نہیں ہے، (خطبہ کے بغیر بھی دو مردوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ہو جانے سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے) نکاح ہونے کے بعد کھجور یا چھوارہ تقسیم کرنا بھی مستحب ہے، نکاح کے وقت ہی مہر مقرر ہو جانا چاہئے، جو نہ بہت کم ہو کہ جس سے عورت کی بے وقعتی ظاہر ہو اور نہ اتنا زیادہ کہ

جس کا ادا کرنا شوہر کے لئے ناممکن ہو، مہر کی ادائیگی یا کم از کم اس کے کچھ حصے کی ادائیگی فوراً ہو جائے تو بہتر ہے، آج کل چوں کہ روپیہ کی قیمت بہت جلد جلد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے (گھٹتی زیادہ ہے) اس لئے اچھا یہ ہے کہ مہر سونے یا چاندی کی متعینہ مقدار میں مقرر کیا جائے، ویسے کسی بھی مالیت رکھنے والی چیز (خواہ غلہ ہو، جائداد ہو، کپڑا ہو، یا اور کوئی قیمتی چیز ہو، بشرطیکہ متعین کی جاسکتی ہو) کا مہر مقرر کیا جاسکتا ہے، مہر کا ادا کرنا دوسرے قرضوں کی طرح ضروری ہے، مہر ادا کرنے کی جلد سے جلد کوشش کرنی چاہئے، عورت کی طرف سے رسمی اور دکھاوے کی معافی سے مہر معاف نہیں ہوتا، ہاں واقعتاً خوش دلی سے، بغیر کسی دباؤ اور دھونس کے وہ معاف کردے تو معاف ہو سکتا ہے، نکاح کے وقت جو مہر مقرر کیا گیا، اس میں اضافہ اور کمی بھی زوجین کی حقیقی رضامندی سے ہو سکتی ہے، نکاح کے بعد زوجیت کا عملی تعلق قائم ہو جانے، یعنی صحبت کے بعد ولیمہ کرنا مسنون ہے، اس میں نام ونمود اور دکھاوے کے لئے بہت سے لوگوں کو بلا کر کھلانا شرعاً پسندیدہ نہیں؛ بلکہ بہ آسانی (بلا قرض لئے) جتنے لوگوں کو کھلا دیا جائے، غریبوں اور ناداروں کو اس میں ضرور دعوت دی جائے؛ کیوں کہ کھانے کی جس دعوت میں صرف مالداروں اور دولت مندوں کو بلایا جائے، غریبوں کو چھوڑ دیا جائے اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بدترین دعوت قرار دیا ہے۔

زوجین کے حقوق وفرائض

بیوی کے تمام اخراجات، کھانا کپڑا، رہائش شوہر کے ذمہ ہیں، خواہ بیوی کتنی ہی دولت مند ہو اور چاہے شوہر غریب ہو، بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی (بلا وجہ اس کی دل شکنی نہ کرنا) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اسے معقول اور مناسب وجہ کے بغیر ڈانٹ ڈپٹ کرنا شرعاً ممنوع ہے، اس کے عزیزوں بالخصوص والدین کو بھی نامناسب انداز میں یاد کرنا جس سے بیوی کی دلآزاری ہو شرعاً ممنوع ہے، اس کی جائز اور مناسب

باتوں پر روک ٹوک کرنا درست نہیں؛ البتہ ناجائز اور نامناسب باتوں پر روک ٹوک کرنی چاہئے، مثلاً بے پردہ گھومنے پھرنے، غیرمحرم کے سامنے آنے سے منع کرنا چاہئے، کہنا نہ ماننے پر تنبیہ بھی کی جاسکتی ہے۔

بیوی کے ذمہ اپنے شوہر کی ہر جائز کام میں اطاعت کرنا اور اسے خوش رکھنا ہے، اس کے مال اور اولاد کی نگہداشت کرنا بھی بیوی کی ذمہ داری ہے خاص طور پر جب کہ شوہر موجود نہ ہو (سفر وغیرہ پر گیا ہو) اس وقت بیوی کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، خلاف شرع کام کرنے پر ہر ایک دوسرے کو ٹوک سکتا ہے (مگر مناسب انداز میں اور فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے) کسی خلاف شرع کام میں اطاعت نہ کی جائے، چاہے اس پر شوہر ناراض ہی ہو، مثلاً شوہر اگر غیرمحرم کے سامنے آنے کے لئے اپنی بیوی سے کہے تو بیوی اس کی یہ بات نہ مانے، دونوں ایک دوسرے کی دل جوئی کی کوشش کرتے رہیں اور دل آزاری سے بچیں، ایک دوسرے کے عیبوں کو حتیٰ الامکان چھپائیں۔

تعلقات خراب ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے

خدانخواستہ اگر میاں بیوی میں سے کسی کو دوسرے سے شکایات پیدا ہوجائیں تو انھیں آپس میں ہی دور کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے، اس بارے میں شوہر کو اپنی بیوی سے اگر شکایات ہیں تو وہ بیوی کو پہلے سمجھائے بجھائے اس سے بھی شکایات دور نہ ہوں اور بیوی کے نامناسب رویہ میں تبدیلی نہ آئے نہ تو وہ کچھ عرصہ کے لئے بیوی کو خواب گاہ سے علاحدہ سوئے، اس سے بھی کام نہ چلے تو ہلکی تنبیہ کرسکتا ہے، یہ علاج بھی کارگر نہ ہو تو دونوں (میاں بیوی) کے قریبی رشتہ دار درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کرانے اور دونوں کے تعلقات درست کرانے کی پوری کوشش کریں، یہ تدبیر بھی دونوں کے تعلقات خوشگوار بنانے میں بے اثر ثابت ہو۔

طلاق کب اور کیسے دی جائے؟

تو پھر صرف ایک طلاق دی جائے وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ عورت پاک ہو اور اس سے قریبی زمانہ میں (اسی پاکی کے زمانہ میں) صحبت نہ کی ہو، اگر یہ پہلی صریح طلاق ہے (یا دوسری) تو عدت پوری ہونے سے قبل تک شوہر کو حق رہتا ہے کہ وہ نیا نکاح کئے بغیر بھی جب چاہے اسے بیوی بنالے، مثلاً وہ اس کے ساتھ اس طرح کا کوئی عمل کرلے جو بیوی ہی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے یا زبان سے کہہ دے کہ ''میں پھر بیوی بناتا ہوں'' یا اس جیسی کوئی اور بات کرلے جس سے دوبارہ ازدواجی تعلقات قائم ہونے کا پتہ چلتا ہو، عدت مکمل ہونے کے بعد اس شخص کے لئے یہ عورت بالکل اجنبی ہوجائے گی جیسے کہ نکاح سے پہلے تھی؛ البتہ عدت ختم ہونے کے بعد دوبارہ نکاح کرکے بیوی بناسکتا ہے (جس طرح پہلے نکاح کرکے بیوی بنایا تھا) عوام میں یہ غلط مشہور ہوگیا ہے کہ ''تین سے کم طلاقیں ہی نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ بیوی ہی رہتی ہے'' حالاں کہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، عدت ختم ہونے کے بعد ایک طلاق دینے سے بھی وہ عورت بالکل غیر اور اجنبی ہوجاتی ہے؛ البتہ تین طلاق دینے سے خواہ ایک ساتھ دی گئی ہوں یا الگ الگ دوبارہ نکاح کرنے کا اختیار ختم ہوجاتا ہے، اس لئے ہرگز تین طلاقیں نہ دی جائیں، تین طلاقیں ایک ساتھ دینا بہت بڑے گناہ کی بات ہے، اس سے دینی اور دنیاوی دونوں نقصانات ہوتے ہیں اس لئے اس سے ہمیشہ بچنا چاہئے۔

طلاق کے اسباب دور کرنے کی کوشش

عام طور پر سے معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے طلاق دے دی جاتی ہے؛ حالاں کہ معمولی بات پر دفعتاً ایک طلاق دینا بھی گناہ ہے، طلاق دینے سے پہلے وہ تدبیریں کرنی چاہئیں جن کا ذکر ابھی ہوا، آج کل شرعی احکام سے غفلت اور بے دینی کی وجہ سے مردوں، بالخصوص نوجوانوں میں نشہ (ڈرگ) کی بری عادت بھی طلاق کا اکثر سبب بن جاتی ہے اور لاٹری (جو درحقیقت شرعاً جوا ہے) کے ٹکٹ خریدنے اور معمے حل

کرنے کے لئے فیس جمع کرنے جیسے اخراجات بڑھ جانے سے پہلے سے شوہر اپنی بیویوں کے واجب حقوق ادا نہیں کر پاتے، اس لئے بھی طلاق کی کثرت ہو رہی ہے، ان اسباب سے جو خود اپنی جگہ بڑے گناہ ہیں اور خداوند تعالیٰ کو سخت ناراض کرنے والے ہیں، سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی جائے، تاکہ دنیا وآخرت کی بربادی سے بچا جا سکے، شریعت نے سوہر اور بیوی دونوں کے انتخاب کے لئے دینداری کو سب سے زیادہ اہم اور قابل ترجیح وصف بتایا ہے، اس لئے شادی کے وقت ہی اس وصف کا خیال کیا جائے، اگر دیندار سے شادی ہو تو بہت سکون رہے۔

طلاق کے بعد شوہر کی ذمہ داریاں

طلاق (خواہ ایک دی ہو یا زیادہ) کے بعد عدت ختم ہونے تک مطلقہ (طلاق شدہ) عورت کے تمام ضروری اخراجات (کھانا، کپڑا، رہائش) طلاق دینے والے کے ہی ذمہ رہتے ہیں؛ البتہ تین طلاق کے بعد اس مطلقہ عورت کا طلاق دینے والے سے پردہ ضروری ہو جاتا ہے، اگر طلاق دینے والے کے گھر میں طلاق دینے والے سے مطلقہ کے پردہ کا اہتمام نہ ہو سکتا ہو یا اس سے کسی قسم کا خطرہ ہو تو مطلقہ عورت کہیں اور محفوظ جگہ، مثلاً اپنے میکہ منتقل ہو سکتی ہے، اگر طلاق دینے والے شوہر سے اس مطلقہ کے چھوٹے بچے ہیں تو یہ چھوٹے بچے (لڑکا سات سال کی عمر تک اور لڑکی بالغ ہونے تک) اپنی والدہ (مطلقہ عورت) کے پاس پرورش پانے کے حقدار ہوں گے اور بچوں کے تمام اخراجات باپ پر یعنی طلاق دینے والے پر ہی ہوں گے، اگر یہ مطلقہ بچوں کی ماں، بچوں کی پرورش کی خاطر اپنا نکاح کسی اور شخص سے نہیں کرتی ہے تو وہ جب تک پرورش کرتی رہے گی اس کے اور ان کے بچوں کے تمام ضروری اخراجات، بچوں کے باپ کے ذمہ رہیں گے، ہاں اگر وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لے گی تو پھر اس کا بچوں کی پرورش کا حق ختم ہو جائے گا۔

ترکہ کی تقسیم

مسلمانوں کے اندر جن شرعی احکام کی خلاف ورزی کا رواج پڑ گیا ہے ان میں غالبًا سب سے زیادہ ترکہ کی تقسیم کے حکم کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور یہ برائی نماز، روزہ، جیسے شرعی احکام کے پابند بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہے (یہ اور تکلیف دہ اور افسوس ناک بات ہے) حالاں کہ ترکہ شرعی مستحقین میں تقسیم کرنا بھی دیگر فرائض کی طرح ایک اہم فریضہ ہے، خود قرآن مجید میں اسے ''فریضہ'' قرار دیا گیا ہے اور ترکہ سے متعلق تفصیلی احکام بھی قرآن مجید کے اندر (سورۂ نساء میں) بیان ہوئے ہیں عام طور پر اس بارے میں کوتاہی، عورتوں کو بالعموم مرنے والے کی بیٹیوں اور بہنوں کو ترکہ سے محروم رکھ کر کی جاتی ہے، کسی بھی ترکہ کے مستحق کو ترکہ نہ دینا اور اس کا حصہ دبا لینا ایسا ہی ہے جیسے کسی کا مال غصب کر لینا یا زبردستی چھین لینا، اس کا استعمال غیر مستحق کے لئے حرام ہے اور حرام مال استعمال کرنے والے کے نماز، روزے بھی قبول نہیں ہوتے۔

خوفِ آخرت کے پیش نظر ترکہ کے مسائل جاننے والے کسی عالم سے مسئلہ دریافت کر کے تمام شرعی مستحقین تک ترکہ پہنچایا جائے، اس حکم کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں بہت سی دنیاوی مشکلات سے بھی دوچار ہو رہے ہیں، مثلاً غیر مسلموں کی طرح بہنوں، بیٹیوں کو ترکہ نہ دینے کے رواج کی ہی یہ نحوست معلوم ہوتی ہے کہ غیر مسلموں ہی کی طرح مسلمانوں میں بھی جہیز اور تلک جیسی برائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں اور اس کے نتیجہ میں بہت سی جوان لڑکیاں رشتوں سے محروم رہ جاتی ہیں اور پھر بعض تو اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتیں؛ بلکہ غیر مسلموں تک سے شادی کر کے اسلام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ اعاذنا اللہ منہ۔

لڑکیوں یا بہنوں کی شادی بیاہ میں ہونے والے اخراجات سے ان کا ترکہ میں استحقاق وحصہ ختم نہیں ہوتا اور نہ جہیز دینے سے ترکہ والا حصہ ادا ہو جاتا ہے؛ بلکہ ترکہ کا حساب لگا کر انھیں ان کا پورا حصہ دینے سے ہی ادا ہوگا، ورنہ شرعاً وہ ان لوگوں کے ذمہ باقی رہے گا، جنھوں نے ترکہ نہیں دیا اور خود دبا رکھا ہے، (ان تمام مسائل کے دلائل اور مزید

تفصیلات جاننے کے لئے دیکھئے راقم کی کتابیں ’’معاشرتی مسائل‘‘ شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنو اور ’’موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل‘‘ شائع کردہ مکتبہ حرم لکھنؤ)، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو تمام شرعی احکام پر پورا پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آخرت کی فکر نصیب فرمائے۔ آمین

☆ ☆ ☆

تاریخ، تذکرہ اور سفرنامے

سیرت نبویہ کا ہر پہلو درخشاں اور نفع رساں

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ہر پہلو منور و درخشاں اور سارے عالم کے لئے مینارۂ نور ہے، آپ کی زندگی کے وہ افعال جنھیں عموماً عادت کے قبیل کا سمجھا جاتا ہے ان میں بھی آفاقیت یعنی ساری انسانیت کے لئے راہ نمائی اور افادیت کا سامان ہے اور وہ بھی تمام لوگوں کے لئے قابل تقلید اور لائق اتباع ہونے کے ساتھ دینی و دنیاوی مصالح ومنافع کے حامل ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول داہنی کروٹ پر لیٹنے اور اسی پہلو پر سونے کا تھا، بائیں کروٹ پر پسند نہیں فرماتے تھے۔(۱)

اس معمول کے طبی اور جسمانی بے شمار فوائد اصحابِ فن نے بتائے ہیں، جن کا ذکر شراحِ حدیث نے بھی کیا ہے اور اس کے دینی فوائد بھی بہت ہیں، مثلاً قلب کا غافل نہ ہونا، سحرخیزی میں آسانی ہونا کہ جو ذکر اللہ کا بہترین وقت ہے؛ چنانچہ قرآن مجید میں رات کے وقت نرم گرم بستروں سے اُٹھ کر خدا کی یاد میں مشغول ہوجانے والوں کا تذکرہ ایسے شوق انگیز انداز میں کیا گیا ہے کہ پڑھ کر قلب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، فرمایا :

تتجافى جنوبهم عن المضاجع يدعون ربهم خوفاً
وطمعا ومما رزقناهم ينفقون ، فلا تعلم نفس ما أخفى
لهم من قرة أعين جزاءً بما كانوا يعملون ۔ (۲)

جن لوگوں نے اپنے پہلوؤں کو بستروں سے اُٹھا کر خدا سے
اُمید وبیم کے ساتھ لولگا رکھی ہے، ان کے خوش کرنے کے لئے

(۱) ابن ماجہ، کتاب الدعاء: ۳۸۷۴، ۳۸۷۷، اس سے ملتے جلتے مضمون داہنی کروٹ لیٹنے کی روایات بخاری: ۹۹۴ وغیرہ میں بھی ہیں۔ (۲) آلم السجدة:۱۶

جو سامان چھپا کر (تیار رکھا) گیا ہے، اسے دنیا میں کوئی نہیں
جان سکتا اور وہی ان کے حسن عمل کا بدلہ ہوگا۔

اسی طرح کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے ''ابدوا بالميامن''(۱) (داہنی طرف سے شروع کرو) مثلاً مجمع زیادہ ہو اور کوئی چیز تقسیم کرنا ہو تو داہنی طرف جو شخص ہو پہلے اسے دو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُصول کی خود کس درجہ پابندی فرمائی! اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، (۲) (جو صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے) کہ ایک مرتبہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے داہنی طرف ان کے مقابلہ میں ایک بہت معمولی شخص بیٹھے ہوئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پہلے ان ہی کو دیا اور اس میں انھیں ترجیح دی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نہیں؛ حالاں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متوجہ بھی کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، مگر اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُصول کی خلاف ورزی نہیں فرمائی، ہاں اگر وہ شخص جو داہنے ہاتھ پر ہے اجازت دیدے تو اس کی اجازت کے بعد دوسرے کو دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ ایک مرتبہ خود (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی صورت میں جب کہ داہنی طرف ایک کم عمر صاحب زادہ (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما) بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بعد ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادہ سے اجازت مانگی کہ ان سے پہلے ان دونوں حضرات کو دودھ کا پیالہ دے دیا جائے! مگر انھوں نے اجازت دینے اور اس کے نتیجے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پس خوردہ کے براہ راست استعمال کرنے کی نعمت سے محروم ہونے سے انکار کردیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) ابن ماجہ:۴۰۲-۴۰۱، كتاب الطهارة ، باب التيمن في الوضوء، اسی مضمون کی روایتیں بخاری وغیرہ میں بھی کچھ الفاظ کے فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، (بخاری، کتاب الجنائز: ۱۲۵۶)

(۲) مسلم ، کتاب الأشربة، حدیث نمبر: ۵۲۸۹-۵۲۹۰-۵۲۹۱، بخاری، کتاب المساقات، حدیث نمبر: ۲۳۵۱-۲۳۵۲ (۳) کتاب الهبة، باب:۲۲، حدیث نمبر: ۲۶۰۲

پہلے ان صاحبزادہ کو ہی دودھ کا پیالہ عنایت فرمایا اس کے بعد ان بزرگوں کو دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے افعال واقوال کی پابندی اگرچہ فرائض اور واجبات کے درجہ میں تو نہیں آتی ؛ لیکن ان کا اتباع بھی دینی ودنیاوی خیر وبرکت کا باعث ہے اور ان کے استحقاق وتحقیر سے ایمان کے سلب ہونے کا خطرہ ہے۔ **(اعاذنا الله منه)**

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس طرح کی داہنی جانب سے ابتداء کرنے جیسے ہدایات نبوی کی کیا عجیب اور دور رس نتائج کی حامل حکمت بتائی ہے، موصوف نے اسے قطع ضغائن (تعلقات بہتر کرنے اور کشیدگی سے بچانے) کا ایک اہم ذریعہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ عموماً لوگ اپنے مقابلہ میں ایسے مواقع پر دوسرے کی برتری کے قائل نہیں ہوتے ، اگر تقسیم کے مواقع پر اشخاص کے مراتب سامنے رکھ کر ترجیح کا اُصول اختیار کیا جائے تو جسے ترجیح دی جائے گی اسے شکایت ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ یہ شکایت کینہ کی شکل اختیار کرلے ؛ لیکن داہنی جانب سے شروع کرنے کی ہدایت اور اس اُصول کی پابندی سے ایسی شکایات نہ ہوں گی ، پھر نتیجتاً کینہ پروری کے مواقع بہت کم ہوجائیں گے، جس کی اہمیت سے کوئی بھی صاحب ہوش وخرد انکار نہیں کرسکتا، مقام غور ہے کہ اس سنت نبوی کے اتباع کا تنہا یہی فائدہ کیا کم ہے؟ کیا حرص وآرزو کی دنیا میں کینہ وحسد کی آگ بجھا دینا یا اس کی شدت میں کمی کردینا کسی بھی عقل وخرد والے کے نزدیک کمتر درجہ کی چیز ہے؟ ان دونوں مثالوں کے سامنے آجانے کے بعد شاید اب یہ بات محتاج دلیل نہیں رہ گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ یعنی آپ کا ہر قول وفعل اور آپ کی ہر ادا عالمگیر افادیت اور بے شمار فوائد ومصالح کے حامل ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ سیرت نبوی کے بعض پہلو دوسرے بعض کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتے ہوں، سیرت مبارکہ میں ایسے پہلو بھی بکثرت ہیں جن کی اہمیت کا اعتراف

مسلمانوں ہی نے نہیں، غیر مسلموں بلکہ اسلام دشمنوں تک نے کیا ہے اور کچھ تو بین الاقوامی چارٹر'' کے اندر نمایاں مقام حاصل کرچکے ہیں ، ان میں مساوات انسانی اور حقوق نسواں سے متعلق آپ کے طرز عمل وہدایات کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے، کسی بھی منصف مزاج کے لئے اس حقیقت کا انکار حقائق سے چشم پوشی کے بغیر ممکن نہیں کہ رحمت عالم ہی کی تعلیمات کے نتیجہ میں دنیا ان اُصول سے واقف ہوئی ہے، ورنہ اس سے پہلے دنیا میں اتنی روشنی نہیں پھیلی تھی جس سے ان جیسی حقیقتوں کے حسن کو صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے ؛ حالاں کہ اب یہ بدیہی حقیقتیں معلوم ہونے لگی ہیں ؛ لیکن اس سے پہلے صدیاں نہیں ، ہزاروں سال اس طرح بیتے ہیں کہ عورت کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور اسے جینے کا حق بھی حاصل نہیں تھا ؛ بلکہ وہ حق مرد کے اختیار میں سمجھا جاتا تھا، کبھی باپ کے، کبھی شوہر کے ہاتھ میں۔

اور یہ تو گویا کل کی گذشتہ صدی کے آخر کی بات ہے کہ یورپ کے، فرانس، جیسے ترقی یافتہ ملک (جس کے روشن خیال اور ترقی یافتہ ہونے کے لئے ، انقلاب فرانس، کے پرشور غلغلہ سے آسمان سر پر اٹھالیا گیا تھا) کا گذشتہ صدی تک یہ حال تھا کہ اس میں عورت کے انسان ہونے نہ ہونے کی بحثیں عوام میں نہیں، خواص، بعض دانشوروں اور مقننوں تک کے حلقوں میں جاری تھیں اور انسانی برابری اور مساوات کا تو اسی مہذب علاقہ یورپ وغیرہ میں صرف ابھی نام ہی سنا جارہا یا سنا جاسکا ہے اور عملاً کیا حال ہے اس کی داستان امریکہ کے ریڈ انڈینس اور جنوبی افریقہ کی گوری سرکار اور صدیوں تک غلام رہنے والے وہاں کے اصل باشندوں کالوں سے سنئے ! دوسری طرف سیرت طیبہ کی پرچھائیں پڑ جانے والوں کو دیکھئے کہ ان کے عوام نہیں خواص اور خواص بھی کس درجہ کے؟ امیر المؤمنین اور خلیفۂ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۱) جیسے رعب وداب کے حامل حبشہ سے کبھی پکڑ کر لائے جانے والے غلام کو جب وہ دولت ایمان سے سرفراز اور محبت نبوی سے سرشار ہوگئے تو پھر انھیں ''سیدنا بلال'' کہہ کر پکارتے ہیں اور یہ صرف زبانی ہی نہیں ؛ بلکہ ان کے ساتھ معاملہ

بھی ،سید جیسا ہی کرتے ہیں ؛ چنانچہ انھیں دربار خلافت میں داخلہ کی ہمہ وقت اجازت تھی ،
جب کہ

(۱) بخاری، کتاب فضائل الصحابۃ: ۳۷۵۴،کان عمر یقول:أبوبکر سیدنا وأعتق سیدنا یعنی بلالاً۔

سردار کہے جانے اور عالی نسب سمجھے جانے والے متاخر الاسلام ،لوگوں کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا اور وہی عورت جسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور جسے تہذیب سکھانے کے دعویدار ملکوں میں کل تک انسان نہیں سمجھا جاتا تھا وہ کہیں ''ام المومنین'' کا لقب پاتی اور کہیں ،سیدہ کہلاتی اور کبھی اسے فقیہہ کا خطاب دیا جاتا، (جیسا کہ علامہ کاسانی کی اہلیہ اور فقیہہ سمرقندی کی دختر کو) اور کبھی ممتاز اولیاءاللہ میں شمار کی جاتی ہے (جیسا کہ رابعہ بصریہ) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت بتائی جاتی ہے (۱) اور بتانے والا کون؟ جس کی زبان ہمیشہ حق وصداقت کی ہی ترجمان رہی (ﷺ) اور اس سے بھی بڑی سند درکار ہو تو احکم الحاکمین کے کلام، جس سے بڑھ کر کوئی کلام نہیں، میں اس طرح مل جاتی ہے۔

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف ۔

عورتوں کے حقوق وذمہ داریاں (مردوں کے) برابر ہیں۔

اور یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ مساوات بنی آدم اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں اب تک جو کچھ کیا گیا یا آئندہ کیا جائے گا وہ صاحب سیرت (**علی صاحبھا ألف ألف تحیۃ وسلام**) کی صدائے حق کی بازگشت ہے اور ہوگی اور مشہور شاعر متنبّی کا اپنے بارے میں یہ کہنا :

وما الدھر إلا من رواۃ قصائدی

تو محض شاعرانہ ڈینگ تھی ؛ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کا حقیقی مصداق صاحب اُسوۂ حسنہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور عجب نہیں کہ شاعر نے ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کے برعکس حدیث خویش میں ،دیگر کی حکایت بیان کر دی ہو!

مذکور بالاسطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے بآسانی یہ بات ظاہر وثابت ہوجاتی

ہے کہ اس مقدس (ذات) کی سیرت کے وہ گوشے بھی جنھیں نجی، یا غیر آفاقی سمجھا، یا کہا گیا

(۱) سنن ابن ماجه ، كتاب الجهاد ، باب الرجل يفترو وله أبوان،حدیث نمبر:۲۷۸۱،سنن نسائی ، كتاب الجهاد ، بالرخصة فی التخلف له والدة،حدیث نمبر:۳۱۰۶۔

یا کہا جا سکتا ہے، وہ بھی آفاقیت رکھتے ہیں اور ہمہ گیر افادیت کے حامل ہیں، پھر اس کے کن گوشوں کو لیا جائے اور کن سے صرفِ نظر کیا جائے؟ یہ سوال ہر واقف کے سامنے سنگِ گراں کی طرح آ کر کھڑا ہو جاتا ہے ؛ کیوں کہ یہاں معاملہ وہ ہے جو ایک شاعر نے کسی کے بارے میں کہا تھا :

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

اس لئے آخر میں بس ایک اور مثال دے کر بات ختم کی جاتی ہے؛ لیکن اس سے پہلے ایک نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہو رہا ہے، وہ یہ کہ انسان کی بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اس کا اندرون پوری طرح جھلکتا بلکہ چھلکتا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے باطن کو اگر چھپانا چاہے بھی تو چھپا نہیں سکتا، ان میں سے ایک حالت وہ ہے جب کہ اپنے رب کے حضور مصروف دُعاء ہوتا ہے، دُعاء میں ایسی ہی چیز طلب کی جاتی ہے جو اس کے نہاں خانۂ قلب میں بلند جگہ رکھتی ہو اور جس کے حاصل ہونے پر غایت درجہ آسودگی ہو بلکہ اسے نمایاں کامیابی سمجھتا ہو، اس تمہید کے بعد سیرت نبوی سے وہ مثال پیش کی جارہی ہے جس کا ابھی سطور بالا میں وعدہ کیا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دُعائیں منقول ہیں وہ خود اپنی جگہ ایک ایسا عظیم سرمایۂ ہدایت ہیں جس سے سیرت نبوی کے طالب علم کو بڑی روشنی مل سکتی ہے اور اس طیب سیرت کے بہت سے وہ گوشے سامنے آسکتے ہیں جو دوسری قسم کے ذخیرۂ روایات سے نہیں معلوم ہو سکتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول وماثور دُعاؤں میں ایک مشہور دُعاء یہ ہے :

اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی أعین الناس کبیراً ۔(۱)

اے میرے رب مجھے میری اپنی آنکھوں میں تو چھوٹا کردے،

لیکن اور تمام لوگوں کی نظروں میں بڑا بنا دے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس متبرک دُعاء کے الفاظ ومطالب میں جتنا غور کیا جائے گا، معانی کے

(۱) الجامع الصغير فى احاديث البشير النذير للسيوطى: ۵۷/۲۔

دفتر کھلتے چلے جائیں گے اور اہمیت آشکارا ہوتی جائے گی، اس دُعاء میں جس چیز کی طلب ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس کے حاصل ہونے کے بعد (جسے بھی وہ میسر آجائے) خوش بختی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اگر کسی معاشرہ کو یہ نعمت حاصل ہوجائے جو اس دُعاء میں مانگی گئی ہے تو وہ معاشرہ پاکیزہ ترین اور معیاری انسانی معاشرہ کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہوگا؛ کیوں کہ اگر دیکھا جائے تو معاشرہ کے بگاڑ کا بنیادی سبب یا بنیادی اسباب میں سے ایک یہ ہوتا ہے کہ انسان باوجود کسی ایسے کمال سے خالی بلکہ عاری ہونے کے کہ جس کی بنا پر لوگ اس کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں، خود کو باعظمت سمجھنے لگتا ہے اور پھر بزبان حال؛ بلکہ بسا اوقات بزبانِ قال بھی اس کا دوسروں سے مطالبہ کرنے لگتا ہے کہ اس کی عزت کی جائے اور ہر اس منصب کا اہل سمجھا جائے جس کا یہ شخص خود، باوجود نااہلی کے اپنے آپ کو اہل سمجھتا ہے اور یہ جذبہ کبھی تو ایسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی خواہش کو ٹھکرانے والے ظلم وستم کا نشانہ بنائے جانے لگتے ہیں اس کے برخلاف اگر صورت حال یہ ہو کہ دوسرے تو اسے کسی منصب سونپنے پر اصرار کریں اور وہ خود کو اس کا اہل نہ خیال کرکے اس سے گریز کرے تا اینکہ اس کی ذاتی خواہش کے علی الرغم وہ منصب اس پر لاد دیا جائے تو اس میں جتنا خیر ہے وہ کسی عاقل سے مخفی نہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جو اس پاکیزہ دُعاء میں طلب کی گئی ہے اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی وہ پہلو ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں دراصل جو پرتو تھے اسوۂ نبویہ کا۔ **(على صاحبها التحية)**

اس طرح دیکھا گیا کہ انھیں خلافت جیسے جلیل وعظیم منصب کی پیشکش ہورہی تھی، مگر

وہ خود کو اس کی اہلیت سے عاری سمجھ کر گریزاں نظر آرہے تھے؛ بلکہ اس پیشکش سے ایسے خائف معلوم ہورہے تھے جیسے کسی بہت ہی ناگوار اور مہلک شئ سے ڈرایا جارہا ہو، مصر کے مشہور وممتاز اہل قلم استاذ عباس محمود عقاد نے اپنے شہرۂ آفاق سلسلۂ ''عبقریات'' میں سے ''عبقریۃ الصدیق'' (ص: ۲۲) میں بیعت ابی بکر کے سلسلہ میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی ان کی (حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ) طرف سے بیعت خلافت کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''أمين هذه الأمة'' کہا ہے اس کا جواب اُمت کے اس امین نے جو دیا ہے واقعہ یہ ہے کہ وہ ان کی صفت امانت (وسیع معنی میں) کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔

انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی طرف بیعت کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا: عمر! اس سے پہلے تو میں نے کبھی ایسی سخت لغزش تم سے سرزد ہوتی نہ دیکھی تھی، بھلا ثانی اثنین (ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بیعت کا کیا سوال!

یہ ہے اُسوۂ نبوی اور سیرت طیبہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک اہم سبق جس کی ضرورت آج سے زیادہ شاید کبھی نہ تھی؛ کیوں کہ آج ہر ایک اپنی آنکھوں میں خود کو بڑا نظر آرہا ہے، جب کہ دوسروں کے نزدیک اس کی حیثیت، بونوں جیسی ہے؛ حالاں کہ ضرورت ایسے حضرات کی ہے جو اپنی آنکھوں میں تو صغیر ہوں؛ لیکن دوسرے انھیں بجا طور پر کبیر سمجھ کر آنکھوں میں جگہ دیتے ہوں!

اللهم وفقنا لما تحبه، وترضاه وصلى الله تعالىٰ على
خير خلقه سيدنا محمد وآله وأصحابه أجمعين.

☆ ☆ ☆

سچی محبت کی علامت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں بہت سی فطری صفات پیدا کی ہیں ان میں ایک اہم صفت محبت ہے، یہ صفت اکثر حالات میں دوسری صفات پر غالب آجاتی ہے اور اپنا اثر دکھاتی ہے، یہی صفت عالم کو آباد رکھنے اور اسے ویرانے میں تبدیل ہوجانے سے روکے رکھتی ہے، یہ صفت نہ ہوتی تو ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش، استاذ شاگردوں کی تربیت، مرشد و مصلح خلق خدا کی خیرخواہی و رہنمائی کرنے پر آمادہ اور اس کے لئے تکلیفیں اُٹھانے کو تیار نہ ہوتے۔

یوں تو محبت کے بے شمار آثار وعلامات اور اس کی بے گنتی پہچانیں ہیں، مگر سب سے اہم پہچان ''اطاعت'' ہے یعنی جس سے محبت ہوتی ہے محبّ اس کی بات مانتا اور فرمانبرداری کرتا ہے، کسی عرب عارف نے صحیح کہا ہے ''فان المحب لمن یحب یطیع'' (ہر محبّ اپنے محبوب کی بات مانتا ہے)۔

یہ بھی واقعہ ہے جسے سارے مسلمان جانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت جب تک سب سے زیادہ نہ ہو اس وقت تک کوئی بھی صاحب ایمان نہیں ہوسکتا؛ لیکن عجیب بات ہے کہ بہت سے مسلمان اللہ اور اس کے رسول سے محبت کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کی اطاعت سے روگرداں نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ اظہار محبت بھی اس طرح کرتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہوتی اور وہ خوش ہونے کے

بجائے ناراض ہوتے ہیں، دور کیوں جایئے! ربیع الاول کے مہینہ میں جو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مہینہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا بھی بہت سے مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وتعلق ظاہر کرنے کے لئے وہ طرز اختیار کرتے ہیں جو دوسرے باطل مذہب والے اپنے مذہبی پیشواؤں یا بانیانِ مذہب کے لئے اپناتے ہیں، مثلاً چراغاں کرنا، جشن منانا، میلہ ٹھیلہ کا سا انداز اختیار کرنا؛ حالاں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کاموں سے صاف طور پر اور خاص طریقے سے منع کیا ہے، نیز دوسرے باطل مذاہب والوں کی نقل ومشابہت سے عمومی ممانعت فرمائی ہے کہ (۱) جو جس قوم کی نقل ومشابہت دینی معاملات میں کرے گا اس کا حشر بھی اسی قوم کے ساتھ ہوگا۔

اس بنا پر یہ بات قابل غور بلکہ لائق فکر ہے کہ اظہار محبت کے عنوان سے بہت سے لوگ تقریباً ہر جگہ ربیع الاول کے مہینہ میں جو خلافِ شرع حرکتیں کرتے ہیں وہ کیا مسلمانوں کے لئے باعثِ شرم اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا باعث نہیں ہیں؟ تو کیا مسلمانوں کو اس سے روکنا اور باز رکھنا ہر دیندار آخرت کی مسئولیت کا احساس رکھنے والے پر لازم نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ '' جو مسلمان بھی کسی غلط کام کو ہوتا دیکھے وہ اسے اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق روکنے کی کوشش کرے اور کم سے کم یہ کہ اس کام سے دلی نفرت کرے'' (۲) اس حقیقت کا ظاہری بلکہ کم از کم مطالبہ یہ ہے کہ ایسے جلسوں، جلوسوں، میلوں اور نمائشوں میں کسی طرح کا حصہ لینے کے بجائے ان نمائشی اظہار محبت کے طریقوں کو روکنے پر محنت کرے کہ اس کے بغیر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کھوکھلا بلکہ جھوٹا ہے۔

آیئے! ہم سب دُعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت نصیب فرما اور ہمیں اپنا اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پکا فرمانبردار بنا اور ایسے تمام کاموں سے بچا جن سے ان کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔

☆ ☆ ☆

(۱) ابوداؤد،حدیث نمبر:۴۰۳۱،باب:۴،کتاب اللباس۔

(۲) مسلم:۱۷۷،باب:۲۰،کتاب الایمان ، ترمذی:۲۱۷۲،باب:۱۱،کتاب الفتن۔

ملیشیا میں عالمی اسلامی کیلنڈر سیمینار

آج کل ہر قسم کے وسائل واسباب کی فراوانی کی وجہ سے پوری دنیا گویا ایک مکان کا صحن بن گئی ہے کہ ایک حصہ کی خبر آن کی آن میں تمام گوشوں تک پہنچ جاتی ہے، اگر چہ اسی صورت کی افادیت وخوبی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ؛ لیکن بعض اوقات یہی خوبی انتشار واختلاف کی برائی پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس پہلو کا سب سے زیادہ تکلیف دہ نظریے چاند کی خبر ریڈیو وغیرہ پر نشر کرنے سے اس وقت سامنے آتا ہے جب کہ ایک ہی شہر میں کئی کئی عیدیں منائی جاتی ہیں ، اس بری اور مضحکہ خیز حالت سے بچنے کے لئے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف تجاویز و تدابیر سامنے لائی جاتی ہیں ، پھر جو حلقہ جس تدبیر کو صحیح وموثر سمجھتا ہے اسے روبعمل لانے کے لئے کوششیں کرتا اور فطری طور پر دوسروں سے بھی اس کی تائید کا خواہاں ہوتا ہے ، جس پر نہ ملامت کی جاسکتی ہے نہ الزام دیا جاسکتا ہے ، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی تدبیر شرعی اُصول یا روح شریعت سے متصادم ہوتو علماء کی ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ اس کا نوٹس لیں اور دلائل شرعیہ کی روشنی میں اس ...... کی غلطی واضح کریں ؛ کیوں کہ رمضان کے روزوں اور ذی الحجہ کی قربانی کی طرح عید بھی عبادت ہے ،صرف تیوہار نہیں ہے۔

سیمینار کی اصل غرض

اس سلسلہ میں جن باشعور، ذی علم اور دین دار لوگوں نے اپنے اپنے دائرۂ علم وعمل کے مطابق تدابیر سوچیں بلکہ دریافت کیں ، پھر انھیں بروئے کار لانے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں ، ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر الیاس صاحب پروفیسر ملیشیا سائنس یونیورسٹی کا ہے جو فلکیاتی علوم کے ممتاز ماہر ہونے کے ساتھ دینی مزاج کے حامل اور طبع سلیم کے بھی وارث ہیں ، موصوف نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرکے نئے چاند کی رؤیت کے امکان کا ایک طویل المیعاد چارٹ تیار کیا ہے اور اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بھی انگریزی زبان میں بنام "A-Modern Guide to Astronomical Caloulation of Islamic Calendar" لکھی ، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرلینے کے لئے شاید تنہا یہ بات کافی ہو کہ اس پر دیگر ماہرین فن کے ساتھ ''گروپنچ'' رسالہ کے نائب ایڈیٹر نے بھی بہترین رائے ظاہر کی ہے ، کتاب میں ایک ایسا چارٹ بھی ہے جس سے ساری دنیا میں ۳۸ سال تک کے ہر نئے چاند کا امکانی وقت اور تاریخ دریافت کرنا آسان ہوجائے ، موصوف نے صرف علمی انکشاف پر اکتفاء نہیں کیا ؛ بلکہ اسے عملی شکل دینے اور چارٹ کی افادیت سے روشناس کرانے کے لئے ایک وسیع تعارفی پروگرام بھی بنایا ہے ، اس میں دنیا کے مختلف حصوں میں پہلے علاقائی سطح کے سیمینار منعقد کرانا پھر عالمی پیمانہ پر ایک بہت بڑے سیمینار کا انعقاد شامل ہے ، اسی سلسلہ کا پہلا علاقائی سیمینار "International Islamic Calender" پر ملیشیا کے مشہور شہر پینانگ کی ، سائنس یونیورسٹی ملیشیا میں ۸ تا ۱۰ رجون ۱۹۸۸ء ، مطابق ۲۲ تا ۲۴ رشوال ۱۴۰۸ھ ڈاکٹر الیاس صاحب کی کوشش اور دعوت پر منعقد ہوا جس میں جنوبی دنیا پاکستان ، ہندوستان ، بنگلہ دیش ، مالدیپ ، سری لنکا ، سنگاپور ، جاپان ، ملیشیا ، انڈونیشیا ، ہانگ کانگ ، برونی ، فلپائن ، تائیوان ، تھائی لینڈ ، نیوزی لینڈ ، فیجی آسٹریلیا نیز امریکہ وغیرہ ۲۵ ملکوں کے تقریباً ستر نمائندے شریک ہوئے ۔

سائنس دانوں کی اکثریت

سیمینار کے شرکاء میں زیادہ تر عصری تعلیم یافتہ اور سائنس داں یعنی علوم فلکی کے ماہرین تھے، علماء شریعت اور عربی داں کم تھے، ہندوستان سے راقم الحروف اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق پروائس چانسلر اور شعبہ جغرافیہ کے سابق صدر پروفیسر محمد شفیع مدعو تھے؛ لیکن پروفیسر صاحب نہیں پہنچ سکے، اس لئے راقم نے ہی ہندوستان کی نمائندگی کی۔

سیمینار کی نشستیں یونیورسٹی کے ایک ہال میں (جو ''دیوان'' کہلاتا ہے) ہوئیں، یہ ہال ایسے ہی کاموں کے لئے مخصوص طور پر بنایا گیا ہے، اس لئے وہاں مدرج کرسیاں لگی ہوئی تھیں، یونیورسٹی کی تمام عمارتیں سادہ اور صاف ستھری ہیں، یہ ہال بھی سادہ اور اوسط درجے کا ہے، یونیورسٹی کی سڑکیں بھی اچھی اور صاف ستھری نظر آئیں، فٹ پاتھ پر سرخ رنگ کی اینٹیں نہایت سلیقہ سے اور خوبصورت انداز میں بچھی ہوئی ہیں۔

یونیورسٹی اور ہماری قیام گاہ کے درمیان تقریباً دس کیلومیٹر کا فاصلہ، آرام دہ ایرکنڈیشن کوچ سے طے کرایا جاتا تھا جو مہمانوں کے لئے مخصوص تھیں۔

رصدگاہ کا قیام اور علمی نمائش

ایک روز شہر سے تقریباً بیس کیلومیٹر کے فاصلے پر تمام شرکاء ایسی جگہ لے جائے گئے جہاں ایک طرف سمندر (بحر ہند کی شاخ) موجیں مار رہا تھا اور دوسری طرف متوسط درجہ کی سرسبز پہاڑی کا خوشنما منظر تھا اسی پہاڑی کے کنارے ایک رصدگاہ کا سنگ بنیاد صوبہ پینانگ کے گورنر الحاج آوانگ حسن نے رکھا، اس تقریب میں گورنر کے علاوہ اس صوبہ کے چیف منسٹر (جو چینی نسل کے بودھ ہیں) نیز دیگر معززین شریک تھے اس جگہ ایک بہت بڑے میدان میں عارضی ٹینٹ لگا کر مہمانوں کی نشست اور ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا اور ایک علمی نمائش بھی لگائی گئی تھی، جس میں فلکیات سے متعلق بہت سی مفید معلومات

تصاویر اور مختلف آلات کے ذریعہ فراہم کی گئی تھیں اور فلکیاتی مشاہدے کے قدیم آلات اصطرلاب وغیرہ بھی دکھائے گئے تھے اور بعض ماہرین فلکیات، مثلاً ابن سینا، رازی، کی قلمی تصاویر بھی دکھائی گئی تھیں اور بجلی کے ذریعہ سیارات کی رفتار وغیرہ کا نقشہ دکھایا گیا تھا، اس تقریب کی خبریں دوسرے روز وہاں کے بڑے اخبارات میں بھی شائع ہوئیں اس میں یہ بھی ذکر تھا کہ صوبائی حکومت نے اس رصدگاہ کے لئے آٹھ لاکھ ڈالر (غالباً ملیشیائی ڈالر کیوں کہ وہاں کے سکہ کا نام بھی ڈالر ہے) کی امداد منظور کی ہے یہ بھی چرچا تھا کہ اس رصدگاہ کا منصوبہ ڈاکٹر الیاس صاحب ہی کا پیش کردہ ہے، ظاہر ہے کہ ان کی نگرانی ہی میں تحقیقی اور مطالعاتی کام بھی ہوگا اور اُمید ہے کہ وہ اپنی دینی فکر اور اسلامی خدمت کے جذبہ کی بنا پر اس مفید وجدید ادارہ میں اسلامی خدمت کے مواقع ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، ڈاکٹر الیاس صاحب کا اس سیمینار سے اصل مقصد اپنے تیار کردہ چارٹ کا تعارف اور اس کی قدر و قیمت و افادیت سے روشناس کرانا تھا، تاکہ اس مفید کام سے ساری دنیا فائدہ اٹھا سکے اور اس میں شک نہیں کہ اس چارٹ سے کم از کم یہ نفع تو یقیناً اُٹھایا جاسکتا ہی ہے کہ اس میں دیئے ہوئے وقت و تاریخ پر چاند دیکھنے کا زیادہ اہتمام کیا جائے اور جس روز رؤیت کا امکان نہ ہو اس دن چاند دیکھنے کا دعوا کرنے والے کی بات ماننے میں بہت ہی زیادہ احتیاط کی جائے؛ بلکہ عام حالات میں نہ مانی جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے سیمینار کی متعدد نشستوں میں اس موضوع پر بہت مفید معلومات افزا اور تحقیقی لکچرس دیئے اور مختلف قسم کے نقشوں کے ذریعہ آسان بنا کر پیش کیا، نیز فلکیاتی علوم سے متعلق بہت سی قیمتی معلومات فراہم کیں، یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ لکچرس سیمینار کا حاصل تھے، سیمینار میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ دیگر شرکاء نے بھی حصہ لیا، اکثر نے زبانی بعض نے تحریری (پروگرام کا تفصیلی خانہ خوبصورت کتابچہ کی شکل میں پہلے ہی تقسیم کردیا گیا تھا)۔

سیمینار کا عمومی رُخ

راقم السطور اپنا مقالہ (عربی میں) پیش کرنے کی غرض سے لے گیا تھا، چنانچہ سیمینار کی ایک مخصوص نشست جو علماء پر مشتمل تھی ، میں وہ پڑھا گیا (اس نشست کی صدارت کا بار بھی میرے ناتواں دوش پر رکھ دیا گیا تھا) چوں کہ شرکاء کی زیادہ تعداد عصری تعلیم گاہوں کی فیض یافتہ تھی، مزید برآں یہ کہ ملیشیا میں انگریزی جاننے والے بکثرت ہیں، بلکہ ملیشیائی زبان انگریزی (رومن) رسم خط میں لکھی جاتی ہے، اس لئے زیادہ تر مذاکرات انگریزی میں ہی ہوتے تھے، شرکاء کی اکثریت جس ذہن وفکر اور ماحول کی تھی اس کے پیش نظر یہ بات قابل تعجب نہیں سمجھی جائے گی کہ عمومی رجحان یہ تھا کہ چاند کی پہلی تاریخ کا فیصلہ حسابی طریقہ پر یا بالفاظ دیگر ڈاکٹر الیاس صاحب کے تیار کردہ چارٹ کے مطابق کرنا چاہئے ، رؤیت (آنکھ سے نئے چاند دیکھنے) پر مدار نہ ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ اسی سے اختلافات رونما ہوتے ہیں؛ لیکن اللہ جزائے خیر دے ڈاکٹر الیاس صاحب کو کہ انھوں نے صحیح دینی ذہن وفکر کی بنا پر، صاف کہہ دیا کہ '' چاند کی تاریخ کا فیصلہ کرنا علماء شریعت کا ہی منصب ہے، ہمارا نہیں، ہم نے اپنی محنت کا حاصل علماء کے سامنے رکھ دیا ہے اب وہ اس سے جس طرح یا جس درجہ میں فائدہ اُٹھانا چاہیں اُٹھائیں۔

سیمینار کی مذکورہ بالا تفصیلات سے قارئین نے یہ اندازہ کرلیا ہوگا کہ ایک طرف جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں جن کی اکثریت صرف حسابی طریقہ پر نئے چاند کا فیصلہ کرنے کی خواہش مند ہے، دوسری طرف وہ حضرات ہیں جو بہر صورت رؤیت (آنکھ سے نیا چاند دیکھنے) کے مدعیوں کے بیان پر فیصلہ کرنے پر مصر ہیں، خواہ اس روز حسابی وعقلی طور پر رؤیت کا امکان ہو یا نہ ہو، گویا دونوں گروہ دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں، راقم کا نقطۂ نظر درمیانی ہے، وہی سیمینار کے اندر اپنے مقالہ میں مدلل طور پر پیش کیا، خلاصہ یہ ہے کہ فیصلہ کا مدار تو شرعاً رؤیت پر ہی ہونا ضروری ہے، البتہ یہ تحقیق لازمی ہے کہ رؤیت، حقیقتاً ہوئی ہو، محض واہمہ یا قوت متخیلہ کی کارفرمائی نہ ہو، اس کے لئے حساب اور صحیح عقل بنیادوں سے مدد لینا چاہئے کہ جس روز حسابی

وعقلی طور پر پر رؤیت کا امکان نہ ہو اس دن کی رؤیت کا دعوا کرنے والے کی بات ماننے میں بہت زیادہ احتیاط برتی جائے؛ بلکہ عام حالات میں مانی ہی نہ جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ راقم کا نقطۂ نظر نہ صرف یہ کہ قابل توجہ سمجھا گیا؛ بلکہ اس کی رعایت میں تجویز کے اندر یہ عبارت شامل کی گئی :

حساب رؤیت کا بدل نہیں ہے؛ البتہ اس سے رؤیت کے فیصلہ میں مدد لی جاسکتی ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ

یہاں اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ یہ کہ جب سیمینار میں اکثر شرکاء نے حسابی بنیاد پر (چارٹ کے مطابق) فیصلہ کرنے پر زور دینا شروع کیا تو راقم نے مناسب سمجھا کہ اپنے مقالہ کا کم از کم وہ حصہ ان کے سامنے آجائے جس میں نہایت قوی دلائل سے نئے چاند کے فیصلہ کے لئے رؤیت کی ضرورت ثابت کی گئی ہے؛ لیکن دشواری یہ تھی کہ 'مقالہ' عربی میں تھا اور (اُردو قالب بھی موجود تھا) اکثر لوگ دونوں زبانوں سے ناواقف، تو یہ تدبیر سوچی کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر سنا دیا جائے ، چنانچہ پاکستان کے ایک بہت ممتاز اور خلیق سائنسداں سے رابطہ کیا اور وہ ترجمہ کرنے پر آمادہ ہوگئے ، انھیں مقالہ (کا اُردو پیکر) دے دیا گیا، خداوند تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے معتدبہ حصہ کا ترجمہ کردیا اور یہ بھی کہا (راقم کو مخاطب کرتے ہوئے) مولانا میں تو آپ کا مقالہ پڑھ کر کنونس (Convince) ہوگیا، مطلب یہ تھا کہ رائے بدل گئی اور اب رؤیت ہی پر فیصلہ کرنے کی بات صحیح معلوم ہونے لگی، اس پر راقم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ان کی سلامتی فکر اور مخلص ہونے کا اندازہ ہوا۔

سیمینار کی بعض تجاویز

سیمینار میں پاس ہونے والی تجاویز کے اندر مذکورہ بالا تجویز کے علاوہ ایک یہ بھی تھی کہ ہر مسلم حکومت اور ہر جگہ کی رؤیت کا فیصلہ کرنے والی اتھاریٹی سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ اس چارٹ سے جسے سیمینار کے اکثر شرکاء نے ''الیاس تھیوری'' یا ''الیاس پلان'' کا نام دیا فائدہ اُٹھائیں اور نئے چاند کا فیصلہ کرتے وقت اس سے مدد لیں؛ بلکہ (خیال پڑتا ہے کہ) ملیشیا کی حکومت سے تو یہ اپیل کی گئی کہ وہ اس کے مطابق فیصلے کیا کرے اور سننے میں تو یہ بھی آیا کہ ملیشیا حکومت نے یہ بات مان بھی لی ہے، اس جگہ یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ حسابی طریقہ سے فیصلہ کرنے کا رجحان علماء میں بھی پیدا ہونے لگا ہے، چنانچہ سیمینار میں شریک ایک ''عالم'' نے اس مشہور حدیث کا جس سے حساب پر مدار رکھنے کی نفی ہوتی ہے یعنی ''نحن امة اُمّية لا نكتب ولا نحسب الخ ''(۱) عجیب وغریب مفہوم بیان کیا وہ یہ کہ ''رؤیت (دیکھنے) کے بعد چاند کی پہلی تاریخ کا فیصلہ کرنے کا حکم اس وقت تک ہے جب تک کہ حساب کا علم صحیح نہ ہو سکے، حساب کا علم آجانے کے بعد اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے، جس طرح تیمّم کا حکم اس وقت تک ہے جب تک پانی نہ ملے، پانی مل جانے کے بعد تیمّم درست نہ ہوگا، اس پر راقم نے عرض کیا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اُمت نے چودہ صدیوں تک تیمّم کیا اور اب وضو کرنے کا وقت آیا۔

پینانگ شہر

'ملیشیا' جزیروں کا ملک ہے اس کے بہت سے بڑے شہر جزیروں پر آباد ہیں — پینانگ جہاں ملیشیا سائنس یونیورسٹی ہے اور جس میں یہ سیمینار ہوا) وہ بھی ایک خوبصورت جزیرہ ہے اسی مناسبت سے اس کا نام "Pulau Penang" ہی نام ایرپورٹ پر لکھا ہے: "Pulav" ملیشیائی زبان میں جزیرہ کو کہتے ہیں۔

یہ شہر سنگاپور سے شمال مغرب کی طرف ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوائی پرواز پر واقع ہے، اسے ایک دوسرے جزیرہ سے ملانے کے لئے سمندر پر ایک بہت بڑا پل بنا ہے جس کی لمبائی سات کیلومیٹر بتائی گئی وہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے اسی سبب سے تمام عمارتوں، حتیٰ

کہ ایرپورٹ کی عمارت کی چھتیں اوپر سے ڈھلواں مخروطی شکل کی بنائی جاتی ہیں، شہر کا جتنا حصہ ہم نے دیکھا وہ خوبصورت اور منظم طریقہ پر بنا ہوا نظر آیا، ملیشیا بھر کی سب سے اونچی عمارت ۴۴ منزلہ بھی یہیں ہے۔

سب سے زیادہ قابل ذکر عمارت ایک تاریخی مسجد کی ہے جو نہایت پر شکوہ وخوبصورت ہے، پوری چھت گنبد نما یعنی گول ہے اس پر نہایت حسین سنہرا خربوزہ نما گنبد

ہے ، جس پر

سنہرا کلس حسن کو دوبالا کر رہا ہے، اس کی چھت کے نیچے ہزار سے زیادہ نمازی بیک وقت نماز

(۱) بخاری: ۱۳، کتاب الصوم، حدیث نمبر: ۱۹۱۳، مسلم: ۲۵۱۱، کتاب ا□م۔

پڑھ سکتے ہیں، مسجد سے ملحق شاندار عمارت میں وضو خانہ، غسل خانہ وغیرہ ہے، اسی طرز کی ایک بہت بڑی مسجد سائنس یونیورسٹی ملیشیا کے احاطہ کے اندر بھی ہے، جو سعودی حکومت کی امداد سے تیار ہونے کی بنا پر شاہ خالد مسجد کہلاتی ہے، اس طرح کی مسجدوں میں سب سے اگلی صف سب سے چھوٹی ہوتی ہے اور ایسی ہی سب سے پچھلی، درمیانی صف سب سے طویل ہوتی ہے، پوری مسجد میں عمدہ قالین بچھا ہے اس کے باوجود سجدہ کرنے کے لئے عمدہ مخملی جانمازیں جو کہ ہر جگہ عام طور پر حجاز سے حجاج لاتے ہیں، اس طرح بچھی ہوتی ہیں کہ ان پر سجدہ کرتے وقت صرف سر اور ہاتھ رکھے جاسکیں، پیر نہ رکھے جاسکیں۔

آبادی

یوں تو ملیشیا، معمولی مسلم اکثریت کا ملک ہے (۵۲ فیصد مسلمان ہیں) لیکن پینانگ میں، غیر مسلموں کی (چینیوں کی جو زیادہ تر بودھ ہیں) اکثریت ہے، شاید اسی بنیاد پر یہاں کا وزیر اعلیٰ بھی چینی ہے، وہاں ہندو بھی ہیں اور ایک مندر بھی، جو ہوٹل سے یونیورسٹی آتے جاتے نظر آتا تھا؛ لیکن اس کی ساخت ہندوستان کے مندروں سے مختلف ہے اس کے

باہری حصہ پر گہرے سبز رنگ کا روغن ہے۔

ملیشیا بالخصوص پینانگ میں سندھی بھی آباد ہیں جو زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں، جن مقامی لوگوں سے ربط رہا ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں کے باشندوں میں تواضع ، دینداری اور سادہ مزاجی ہے، تکبر اور تصنع نہیں ہے، غالباً دینداری کا یہ اثر ہے کہ پتلون پر ایک خوبصورت تہبند گھٹنے تک استعمال کرنے کا رواج ہے، تبلیغی جماعت کے اثرات بھی نمایاں محسوس ہوئے ، ہر جگہ کی طرح وہاں بھی ایک مسجد میں مرکز ہے، عوام کی اقتصادی حالت بھی اچھی معلوم ہوئی، اس میں حکومت کی مساعی کا خاصا حصہ بتایا گیا ہے۔

ایک خاص پھل

وہاں سرسبز وشادابی عام ہونے کی وجہ سے بہت سے قسم کے پھل، ترکاری اور اناج کی پیداوار ہوتی ہے؛ لیکن وہاں کا ایک خاص پھل دُریان ہے جو کٹھل جیسی شکل کا ہوتا ہے، وہ پھل برما وغیرہ میں بھی سنا ہے کہ پایا جاتا ہے؛ البتہ ہندوستان میں نہیں ہوتا، اسے وہاں کے لوگ بہت شوق سے کھاتے اور بہت مقوی مفید اور لذیذ بتاتے ہیں، مگر اس میں ایک خاص قسم کی بدبو (لہسن کی بو سے ملتی جلتی بلکہ اس سے زیادہ کریہہ) اتنی شدید ہوتی ہے کہ جس جگہ وہ پھل کاٹا جاتا ہے پورا علاقہ اس کے بو سے بس جاتا ہے جو بہت سے لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے، اس لئے اکثر بڑے ہوٹلوں میں یہ ہدایت لکھی ہوئی ہے ''یہاں دریان لانا منع ہے''، ہمارے ہوٹل میں بھی یہ ہدایت لکھی تھی۔

سیمینار کی آخری ضیافت کے اختتام پر اس پھل ''دُریان'' سے مہمانوں کی تواضع کی گئی، مگر راقم الحروف بدبو کی وجہ سے کھانے کی ہمت، باوجود ترغیب دلانے کے نہیں کرسکا ؛ البتہ لیچی جیسا ایک عمدہ پھل بھی وہاں موجود تھا، جو دریان کا گویا نعم البدل ہے، راقم نے اسی پر اکتفاء کیا۔

اختتام

اس طرح یہ تین روزہ سیمینار بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا، منتظمین نے اکثر مدعوین کو ہوائی جہاز سے آمد ورفت کے ٹکٹ کنفرم کرواکر بھیجے تھے، اس لئے آنا جانا ان ہی کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوا، راقم الحروف کا ٹکٹ براہ سنگاپور تھا؛ چنانچہ آتے جاتے دونوں موقعوں پر سنگاپور کے ایرپورٹ پر کئی گھنٹے ٹھہرنا ہوا، یہ ایرپورٹ غالباً ایشیاء میں سب سے بڑا ہے اور شاید حسین ترین بھی، آج کے اکثر انٹرنیشنل ایرپورٹ صرف ٹرانسپورٹ ہی کے نہیں تجارت کے بھی مرکز ہوتے ہیں، اس حیثیت سے بھی سنگاپور ایرپورٹ بہت ممتاز نظر آیا'' سوپر مارکٹ'' معلوم ہوتا ہے اور جگہ جگہ'' ڈیوٹی فری شاپ'' کے سائن بورڈ گذرنے والوں کو خریداری کی دعوت دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

تحریکِ آزادی پر فکرِ ولی اللّٰہی کے اثرات

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين ، سيدنا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ، أما بعد ۔

یہ حقیقت مبالغہ سے خالی ہے کہ دنیا اسلام سے پہلے آزادی ومساواتِ انسانی کے تصور سے گویا ناآشنا تھی ، تاریخ گواہ ہے کہ عموماً ہر قوی اپنے سے کمزور کی آزادی سلب کرلینے اور اسے نہ صرف کمتر وذلیل سمجھنے ؛ بلکہ عملاً حقارت کا برتاؤ کرنے کا عادی ہوگیا تھا اور انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرنے کا خوگر۔

یہ اسلام ہی کا اثر ہے کہ دنیا والے حقیقی آزادی اور مساواتِ انسانی کی فکر سے آشنا

ہوئے؛ لیکن پھر بھی یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ اب تک بھی عملاً کامل حریت کو اپنانے کے دعاوی کے باوجود، عادی نہیں ہوسکے، مہذب کہلانے والی اقوام اور ملکوں، مثلاً امریکہ، یورپ، کا بقیہ دنیا والوں کے ساتھ سلوک اس کا کھلا ثبوت ہے۔

اس کے برخلاف اسلامی تعلیمات کے رنگ میں ڈوب جانے؛ بلکہ اس سے متاثر ہوجانے والے معاشروں میں پہلے دن سے حریت فکر ورائے کے محیر العقول نمونے برابر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں، اسلامی فکر (آزادیٔ کامل) کا عکاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یادگار یہ تاریخی جملہ :

مذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهم أحراراً ۔ (۱)

اسلامی مزاج کا آئینہ دار ہے کہ جب انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے تو اسے غلام

(۱) اسلام کا اقتصادی نظام: ۹۱۔

بنانے کا حق کسی کو کہاں پہنچتا ہے؟ اسلامی تعلیمات کے سایہ میں پلے بڑھے کسی بھی حساس شخص کے لئے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بھی غلامی برداشت کرنا قطعاً گوارہ نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس کی بکثرت شہادتیں ملتی ہیں کہ بڑے سے بڑے جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے گریز نہیں کیا گیا۔

غلامی اور آزادی کا حقیقی مفہوم

اسلامی تعلیمات کی روشنی سے جس طرح بہت سی حقیقتیں جو جہالت کے انبار میں چھپی رہ گئیں اور مسخ شدہ ہو چکی تھیں، وہ روشن اور صاف ہو کر نمایاں ہوئیں اور ان کی اصلیت سامنے آئی، اسی طرح آزادی وغلامی کے بگڑے ہوئے تصور کی بھی اصلاح ہوئی اور اس کا اصلی چہرہ سامنے آیا، اسلامی شعور اور تعلیمات سے ناآشنا معاشروں میں آج بھی غیر اور ''اپنے'' میں تفریق کی وجہ سے غیر کی غلامی کو تو ناپسند کیا جاتا ہے اور غلامی سمجھا جاتا ہے، مگر اپنے کی غلامی کو گوارہ کرلیا جاتا ہے؛ چنانچہ اگر ''امریکن'' پر امریکی حکومت کرے یا

بالفاظ دیگر امریکیوں کو امریکی غلام بنائے رکھے تو وہ غلامی نہیں، آزادی کہلانے کی مستحق ہے، خواہ اس میں کتنی ہی تکلیفیں اور پریشانیاں جھیلنی پڑیں اور پابندیاں لگادی گئی ہوں؛ لیکن امریکیوں پر غیر امریکی (مثلاً ایشیائی کی) حکومت ہو تو وہ غلامی کہلائے گی، چاہے اس میں کتنی ہی آزادی اور عوام کو راحت ملتی ہو۔

اسلام نے اس بنیادی فکر میں تبدیلی کرکے اس پر چوٹ لگائی اور یہ بتایا کہ اگر کوئی حکمراں خواہ ملکی یا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ ظلم وزیادتی کرتا ہے اور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے اور رعایا کے حقوق پامال کرتا ہے تو وہ گویا غلام بناتا اور آزادی سلب کرتا ہے؛ لہٰذا اس کے خلاف جدوجہد کرنا بھی جہادِ حریت ہے، چنانچہ اسلامی تاریخ میں اس کی بے شمار شہادتیں ملتی ہیں، امام الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کے خلاف جہاد اسی نوعیت کی جدوجہد تھی، اس کے بعد امام الاتقیاء ذو نفس زکیہ کا حکومتِ وقت کے خلاف نبرد آزما ہونا بھی اسی قبیل کی سعی وکوشش تھی اور ماضی قریب میں مصلحِ اعظم، مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیاں بھی گویا اسی کی زریں مثالیں تھیں۔

سب واقف جانتے ہیں کہ شہیدین رحمۃ اللہ علیہما کی متذکرہ بالا تحریک، امام ولی اللہؒ کے روشن کردہ چراغ کی ہی ایک لو تھی، جیسا کہ بہت سے مفکرین نے لکھا ہے (مثلاً حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''تاریخ دعوت وعزیمت'': ۵/۳۲۱) میں اور تاریخ آزادی کی معمولی شد بد رکھنے والے بھی یہ بات جانتے ہیں کہ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک آزادی کا اصلاً رُخ غیر ملکی نہیں، ملکی ہی ظالم حکمراں قوتوں، جس میں سب سے بڑھ کر ظلم ڈھانے والے مرہٹوں نیز سکھوں اور جاٹوں کے خلاف تھا، شاہ صاحبؒ کے حسن تدبر، عالی ہمتی، دور اندیشی اور مردم شناسی اور سب سے بڑھ کر توفیق خداوندی کی بدولت، انھیں ظاہری طور پر بھی ایسی اعلیٰ اور نمایاں کامیابی ملی، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ایسی کسی بھی سیاسی

انداز کی دینی تحریک کو کم از کم ہندوستان میں قریبی دور؛ بلکہ طویل مدت کے اندر بھی نہیں ملی تھی، اس سے آگے بڑھ کر، یہ کہنا بھی شاید غلط نہ ہو کہ اس طرح کی تحریکیں تاریخ میں غالبًا خال خال ہی کامیاب ہوئیں، وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء؛ لیکن صد افسوس کہ اس زمانہ کے نااہل مغل حکمراں اس کو باقی نہ رکھ سکے اور خاطر خواہ فائدہ نہ اُٹھا سکے؛ بلکہ وہ سعی ایک طرح سے رائیگاں گئی :

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل

بنابریں یہاں پر شاہ ولی اللہؒ کی اس سعی وکوشش کی کم از کم ایک جھلک دکھانا موضوع کے لئے ناگزیر معلوم ہوتا ہے، خوش قسمتی سے تقریباً نصف صدی قبل اکابر کی تاریخ پر سند سمجھے جانے والے مشہور مبصر ومؤرخ اور ممتاز عالم مولانا نسیم احمد فریدی قاسمی امروہویؒ کے نامور خواہر زادہ اور ملک کے ممتاز مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے ''شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات'' (اسی نام سے) اپنے مؤرخانہ ومحققانہ حواشی کے ساتھ شائع کردیئے ہیں (جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۶۹ء، ۱۳۸۸ھ میں چھاپا ہے) اس طرح پروفیسر صاحب موصوف نے ایک بڑا علمی اہم اور ضروری کام، بلکہ کارنامہ انجام دیا ہے، اسی کے کچھ حصے ذیل میں پیش کر کے شاہ صاحبؒ کے اس اہم کارنامہ کی کچھ تفصیل قارئین کے ملاحظہ میں لائی جارہی ہے؛ تاکہ عبرت وبصیرت حاصل کی جاسکے۔

پروفیسر صاحب کتاب کے مقدمہ ہی میں صورت حال کی تصویر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جب آنکھ کھولی تو سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام آچکا تھا، مرکز کے کمزور ہونے کے باعث ساری سلطنت میں ابتری، بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، دکن سے جو طوفان اُٹھتا تھا وہ لال قلعہ سے آکر ٹکراتا تھا،

> پنجاب سے جو آندھی اُٹھتی تھی اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے تھے، جاٹوں کا جو ہنگامہ برپا تھا اس کی جولانگاہ یہی بدبخت شہر (دہلی) بنتا تھا۔

پھر حاشیہ پر اپنی بات کی تائید میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ (جانشین حضرت شاہ ولی اللہؒ) کے ایک اہم خط کا اقتباس پیش کیا ہے :

> ایں حالت عجب است کہ بسبب غلبۂ سکھ ومرہٹہ وجٹ بر بلاد مسلمین، ونہب اموالِ ایشاں، وانتہاک حرمت ایشاں آسائش را فراموش نمودہ، چنانچہ فقیر نیز مع قبائل بہ مرادآباد انتقال نمودہ است، (ص: ۱۷-۱۸) مفہوم: بدامنی کی وجہ سے دہلی چھوڑ کر مرادآباد منتقل ہونا پڑا۔

اس ناگفتہ بہ صورتِ حال کا شاہ ولی اللہؒ نے گہرا مطالعہ ومشاہدہ کرنے کے بعد پہلے تو سلطنتوں کے تباہ وبرباد ہونے کے اسباب کا علمی وتاریخی مبصرانہ تجزیہ پیش کیا (جس پر شاہ صاحبؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے متعدد ابواب ومباحث، بالخصوص ''مبحث الارتفاقات'' شاہد ہیں) موصوف نے صرف علمی تجزیہ پر گویا مرض کی نشاندہی پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ خیر خواہ معالج وحاذق طبیب کی طرح اس کے ازالہ کی بھی ہر ممکن تدبیر کی، جس میں حساس وباحمیت مسلمان حکمرانوں کو صورت حال میں تبدیلی لانے کے لئے ہر کارگر تدبیر حتیٰ کہ حرب وضرب اختیار کرنے کا نہ صرف مشورہ دیا؛ بلکہ گویا حکم دیا، چنانچہ اس غرض سے متعدد حکمرانوں (ملکی وغیر ملکی) طاقتور فرمانرواؤں کو بڑے مؤثر، طاقتور اور فکر وتدبر سے بھرپور راہنما خطوط لکھے، جن میں صورت حال کی سنگینی کا حقیقی نقشہ پیش کر کے انھیں ہر قسم کی جدوجہد کے لئے — ان کی دینی حمیت وغیرت کو اُبھار کر — آمادہ کیا؛ بلکہ ایک طرح سے مجبور کیا اور للکارا، ان میں خاص طور سے دو حکمرانوں (ایک ملکی اور دوسرے غیر ملکی) نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کو مخاطب بنا کر اس مہم کو سر کرنے کے لئے ہر طرح کا مناسب

وضروری اقدام کرنے پر مائل بلکہ مجبور کیا، اس بارے میں بھی نظام صاحب مرحوم کا اقتباس نذر ناظرین کیا جارہا ہے۔

پہلے تمہیدی طور پر فرماتے ہیں :

شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت اور حقیقت شناسی کا یہ کمال تھا کہ انھوں نے دو ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا، جن کو بیسویں صدی کا ایک مشہور مؤرخ اٹھارہویں صدی کی سب سے زیادہ قابل شخصیتیں تصور کرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد رقم طراز ہیں :

پانی پت کا میدان کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہؒ کا سجایا ہوا تھا، وہ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان مدعو کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے (اس زمانہ کے) حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔ (ص:۴۲)

اس کے بعد خلیق صاحب موصوف نے مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں کی ریشہ دوانیوں، بلکہ دست درازیوں (جن کا خلاصہ اوپر شاہ عبدالعزیزؒ کے خط میں آچکا ہے) ان کے علاوہ خود مسلمان حکمرانوں، جاگیرداروں وغیرہم کی جارحانہ کارروائیوں اور آپس میں ہی باہم دست وگریباں ہونے اور نبردآزما ہونے کی تفصیلات بتائی ہیں، پھر لکھتے ہیں :

شاہ صاحب نے اس موقع پر ایک طرف (ملکی حکمراں) نجیب الدولہ کو تیار کیا کہ وہ ہمت وجرأت سے مقابلہ کرے، دوسری طرف (غیر ملکی طاقتور فرمانروا) احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان آکر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے؛ چنانچہ اس جنگ کا (جو پانی پت میں مرہٹوں اور ابدالی کے مابین

ہوئی) یہ نتیجہ نکلا کہ مرہٹوں کے بڑے بڑے سردار موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اُڑ گئی۔ (ص:۴۵)

سر جادو ناتھ سرکار کے بقول :

مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، لیڈروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہوگئی۔ (ص: ۴۵)

جس کے نتیجہ میں ہندوستان کو بالخصوص شمالی ہند کے باشندوں کو ان کے عذاب سے نجات مل گئی۔

مرہٹوں کی چیرہ دستیاں

اوپر ذکر آیا کہ مرہٹوں کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے شاہ صاحب کو افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلانا پڑا، اس پر ہوسکتا ہے کہ حقیقت ناشناس لوگوں کو حیرت ہو اور سوچنے لگیں کہ آخر شاہ صاحبؒ انھیں کیوں اتنا خطرناک سمجھتے تھے کہ ایک بدیسی حکمراں کو دعوت جنگ دینے کا اقدام کرنے پر مجبور ہوگئے؟ حالاں کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے خط میں بیان کردہ یہ حقیقت کہ ان جیسے مؤقر اور بااثر شخص کو اپنے خاندان سمیت دہلی سے مرادآباد منتقل ہونا پڑا تھا، حالات کی نزاکت اور خطرناکی سمجھنے کے لئے کافی ہے، پھر بھی ناواقفوں کی حیرت دور کرنے کے لئے چند حقائق بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

مشہور عالم دین مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ''الفرقان'' کے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' (جو درحقیقت ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے) میں اپنے معرکۃ الآراء مقالہ کے درمیان اس گروہ (مرہٹہ) پر جو کچھ لکھا ہے، اس کے جستہ جستہ حصے آگے دیئے جارہے ہیں، مشہور مؤرخ عالم مولانا آزاد بلگرامی کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں: (اصل عبارت فارسی

میں ہے، یہاں اس کا ترجمہ مولانا کے قلم سے دیا جارہا ہے) :

مرہٹہ کی نیت یہ ہے کہ جہاں ان کو قابو حاصل ہوجائے، وہاں خدا کی مخلوق کے سارے ذرائع معاش کو بند کرکے اپنی طرف سمیٹ لیں، چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک ہوجائیں، جہاں کہیں انھوں نے آبادی پائی اسے جلاکر، لوٹ کر زمین کے برابر کردیا، ہلہ کرکے ایک بھیڑ کے ساتھ باطمینان تمام دلی کو لوٹا اور بہت دولت جمع کی، عرفہ کے دن (دہلی کے مشہور شاہی بازار) مینا بازار اور آبادی کی دوکانوں کو آگ لگا کر بھسم کیا۔ (الفرقان، ولی اللہ نمبر:۱۲۰-۱۲۲)

شاہ صاحبؒ اس فتنہ (مرہٹوں کے فتنہ) اور اس وقت کی سلطنت جس کا برائے نام سربراہ مسلمان تھا، مگر پوری سلطنت کے مال وزر اور دروبست پر غیر مسلم (مرہٹہ وغیرہ) قابض تھے، اس سے وہ کس درجہ متالم ورنجور تھے، اس کا اندازہ ان ہی کے ایک طویل مکتوب کے (جسے نظامی صاحب نے اپنی ترتیب میں نمبر دوم دیا ہے) ان چند جملوں سے ہوجاتا ہے :

غرضیکہ جماعت مسلمین قابل رحم ہے، یہ غریب سب بے خانماں، پریشان اور بے مایہ ہوگئے، اس وقت جو عمل سرکار پادشاہی میں باقی ہے وہ ہنود کا ہے۔ (مکتوبات:۹۰)

مسلمانوں کا یہ عبرت ناک حال جاننے کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ شاہ صاحبؒ نے ابدالی کو کیوں دعوت دی؛ بلکہ یہ بھی دیکھئے کہ وہ کس درجہ مؤثر اور دردوکرب سے ڈوبے الفاظ میں اسے مخاطب بناتے ہیں :

اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ اقتدار وشوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش ہو اور جنگ آزما ہو،

سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ...... ہم بندگانِ الٰہی حضرت رسول اللہ ﷺ کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارکہ کو اس جانب متوجہ فرماکر مخالفین سے مقابلہ فرمائیں؛ تاکہ خداوند تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ (مکتوبات:۹۱)

اس خط کی طاقتور اور جذبات انگیز عبارت پڑھ کر بھلا کون سچا مسلمان ہوگا جو تعمیل حکم کے لئے تیار نہ ہوجائے، یہ مکتوب خاصا طویل ہے، اس میں اس کے علاوہ دیگر مکتوبات میں بھی شاہ صاحبؒ نے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ایسا سچا دل دوز نقشہ پیش کیا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ نکلنا ہی چاہئے تھا، جو سامنے آیا گویا تیر نشانہ پر بیٹھا کہ ابدالی نے مرہٹوں کی ایسی کمر توڑی جس کا ذکر اوپر آیا کہ پھر وہ آج تک ہندوستان پر قبضہ کرنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اوپر کی تفصیلات سے یہ بدگمانی ہوسکتی ہے کہ مرہٹہ صرف مسلمانوں کو ستاتے تھے؛ حالاں کہ ان کی دستبرد سے غیر مسلم بھی محفوظ نہ تھے، اس لئے وہ بھی بیزار تھے، جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں :

مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں کا شکار ہندو و مسلمان سب ہی تھے، (کیوں کہ) ان کا دیہاتوں کو لوٹنا، لوگوں کے ہاتھ پیر، ناک کان کاٹ لینا غیر معمولی بات نہ تھی، نفسانی ہوس کا شکار بلاتفریق مذہب وملت عورتوں کا پورا طبقہ تھا...... پھر مولانا نے ایک مؤرخ کا قول نقل کیا ہے: ''وہ (مرہٹہ) آدھے بادشاہ، آدھے راہ زن تھے''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/۲۷۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے پیش نظر صرف مسلمانوں کو ہی اس فتنہ

سے بچانا نہیں تھا؛ بلکہ پوری انسانیت کی حفاظت مقصود تھی۔فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

شاہ صاحبؒ نے اس کے علاوہ اس وقت کے دوسرے فتنوں، اسلام اور مسلمانوں، نیز عوام کے دشمنوں (مثلاً سکھ اور جاٹ وغیرہ) کے استیصال کی فکر بھی کی، اس کے لئے بھی موصوف نے ہندوستان کے مسلمان طاقتور حکمرانوں (نجیب الدولہ وغیرہ) کو متوجہ کیا، واضح ہو کہ ان تمام ظاہری تدابیر کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے ہر مرحلہ پر خداوند تعالیٰ سے الحاح وزاری کے ساتھ دُعائیں بھی کیں کہ اصل کارساز تو وہی ہے، اس کا ذکر بھی مکتوبات میں جگہ جگہ ہے۔

اصلاحِ عوام وخواص کے لئے شاہ صاحبؒ نے ان سیاسی وفوجی تدبیروں کے علاوہ دیگر اقدامات بھی کئے، مثلاً مؤثر اصلاحی کتابیں لکھ کر ہر طبقہ کو جھنجھوڑا اور نجات کی راہ دکھلائی، اس پہلو کو جاننے کے لئے شاہ صاحبؒ کی سوانح پر لکھی گئی کتابیں بکثرت ہیں، ملاحظہ کرنی چاہئیں، (ان میں تاریخ دعوت وعزیمت کا پانچواں حصہ خاص طور سے لائق مطالعہ ہے)۔

شاہ صاحبؒ کے بعد

شاہ صاحبؒ کی دکھائی ہوئی (بالخصوص ملک وملت کے دشمنوں سے ہند کو پاک کرنے کی) راہ پر ان کے خلاف بالخصوص خلف اکبر شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے تربیت یافتہ بے شمار افراد (خاص طور پر شاہ اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہیدؒ) چلے، جس کی تفصیل اس موضوع پر لکھی گئی متعدد اہم کتابوں —— خاص طور پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے بعد ان کے سچے اور صحیح جانشین سراج الہند شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد ماجد کے شروع کئے ہوئے کاموں کو نہ صرف جاری رکھا؛ بلکہ اس کی توسیع بھی کی، بایں طور کہ سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی توجہ اس تبدیلی کے نتیجہ میں سامنے آنے والے اصل نئے دشمن اور طاقتور حریف انگریزی اقتدار کی طرف مبذول

کردی، جس نے اب خطرہ سے بڑھ کر ''واقعہ'' کی شکل اختیار کرلی تھی، اس تبدیلی والی صورت کے نتیجہ میں شروع کی گئی تدابیر کے ڈانڈے آگے چل کر علماء ہند بالخصوص علماء دیوبند سے مل جاتے ہیں۔

علماء دیوبند اور جنگ آزادی سے وابستہ رہنے والوں کے تفصیلی حالات حضرت مولانا سید محمد میاںؒ دیوبندی قاسمی (سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء) نے اپنی معرکۃ الآراء اور مفید ترین کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' (بالخصوص اس کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے حصوں) میں بیان کردیئے ہیں، تفصیل کے طالب اسے ملاحظہ کریں، ذیل میں اسی کے کچھ اقتباسات نذرِ ناظرین کئے جارہے ہیں، (آگے اس کی جلد دوم مع صفحات کے نمبرات کے دیئے گئے ہیں، ناشر ایم، برادرس، دہلی)۔

اقتباس سے پہلے یہ تمہید ضروری ہے کہ اوپر گذر چکا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی دُعاؤں اور مساعی کی بدولت اس وقت کے دشمنانِ ملک وملت مرہٹوں کا زور ٹوٹا، اس کے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی کہ بعد میں جب غیر ملکی دشمن یعنی انگریزوں نے دست درازی شروع کی (بقول سید احمد شہیدؒ: بیگانگانِ بعید الوطن ملوکِ زمن وزمین گردیدہ) تو پرانے دشمن (مسلمان ومرہٹہ) غیر ملکی طاقتوں کے مقالہ کے لئے ایک بڑے مقصد کی خاطر متحد ہوگئے، جیسا کہ مولانا سید محمد میاںؒ تحریر فرماتے ہیں:

> اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہوگئی، مرہٹی علاقوں کے مسلمان، مرہٹی علاقہ میں، مرہٹوں کی فوج میں شامل ہوگئے اور آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے......شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے خاص معتقد سید احمد شہیدؒ کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا، جو جسونت راؤ ہُلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے مہاراجہ ہُلکر پے در پے ناکامیوں کے بعد اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا، اندور

> کے چھوٹے سے علاقہ پر قانع بنادیا گیا، امیر خاں کوٹونک کا علاقہ دے کر خاموش کر دیا گیا سید صاحبؒ کی رائے نہیں تھی جب ان کی رائے نہیں مانی گئی تو سید صاحبؒ نے امیر خاں کو وداع کیا(۸۲-۸۸) ایک طرف عوام کے وہ جذبات تھے جن کو احساسِ شکست برانگیختہ کر رہا تھا اور دوسری جانب خاندان ولی اللہی کی تربیت گاہ کے اثرات تھے، جنھوں نے منتشر طور پر ہمہ گیر انقلاب کے بیج بہت سے دماغوں میں بو دیئے تھے، حضرت سید صاحبؒ کی زیر قیادت ایک گروپ بنایا گیا، مولانا اسماعیل شہیدؒ اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سید صاحبؒ کے مشیر خاص قرار دیئے گئے، بیعت جہاد لینے کے لئے دورہ پر بھیجا گیا، روحانی مشاغل کے ساتھ سپاہیانہ ورزشیں بھی جاری رہتیں ، اس کے بعد مولانا قاسمیؒ نے ان دوروں کی خاصی تفصیل دی ہے۔

حجاز مقدس کے علاوہ ہندوستان میں جہاں جہاں دورے ہوئے ان میں سے اکثر اہم مقامات کے نام بھی دیئے گئے ہیں اور اہم واقعات بھی (ان مقامات میں دیوبند، سہارنپور، میرٹھ، رام پور، لکھنؤ، کلکتہ، پٹنہ، بنارس شامل ہیں) اسی ذیل میں عوام کے اور علاقائی حکمرانوں کے حالات اور ان کی بعض مزاجی خصوصیات کا تذکرہ بھی ہے، قافلہ کی مقبولیت اور اس کے غیر معمولی اثرات بھی مذکور ہیں، حجاز مقدس کے دورہ کی تفصیلات اور اس کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، قافلہ اور میر قافلہ کے تقویٰ، دیانت اور عفت وعصمت کے سبق آموز واقعات بھی جستہ جستہ بیان ہوئے ہیں (۸۹-۱۸۱) جن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، سید صاحبؒ نے جو اہم خطوط علاقائی حکمرانوں

(جن میں غیر مسلم بھی ہیں) کو لکھے تھے، ان کے خلاصے بھی دیئے گئے ہیں اور بعض کے جوابات بھی، ان میں بار بار یہ مضمون آیا ہے :

> خدا گواہ ہے، ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے، نہ اپنی حکومت قائم کرنا ہے...... ہمارا منشاء وطن کو آزاد کرنا ہے اور بس۔(۱۹۲-۱۹۳)

اس شبہ کا آزالہ بھی کیا گیا کہ بعض مواقع پر انگریزوں ـــــ مرد وعورت ـــــ نے قافلہ کی مدد کی، اس کے اسباب بتائے گئے ہیں (۲۱۲-۲۱۳) فتح پشاور کا بھی تفصیلی ذکر ہے اور سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کو ''وہابی'' مشہور کرنے کی دشمنوں کی طرف سے حکمت عملی کا بھی اور اس کی تشہیر کرنے والے بعض نام بھی مذکور ہیں (۲۶۶) سکھوں سے معرکہ آرائی کی پوری تاریخ آگئی ہے (۲۶۶-۲۴۴) اس کے بعد دونوں کے درمیان تعلقات استوار ہوجانے کا بھی ذکر ہے (تیسری جلد میں) سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کے جانشینوں، تسلسل کے ساتھ ان کی تحریک کے جاری رہنے اور اس سلسلہ کو باقی رکھنے والے بعض اہم افراد اور تحریکوں کے سربراہوں کے تذکرے بھی ہیں، مثلاً علماء صادق پور پٹنہ تحریک، مولانا ولایت علی، مولانا محمد علی رام پوری کا تحریک کے درمیان رابطہ کے لئے خفیہ زبان (کوڈورڈ) کا استعمال، مجاہدین کے خلاف انگریزوں کی تازہ کارروائیوں، اس کے نتیجہ میں انھیں سخت سزائیں (عمر قید بعبور دریائے شور اور پھانسی) دیئے جانے کی بھی خاصی تفصیل دی گئی ہے۔(چوتھی جلد میں)

سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے مولانا محمد میاںؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جسے انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دیا) کا بیان اور اس میں حصہ لینے والے اور دیگر بہت سے علماء ومجاہدین کا ذکر کیا ہے، مثلاً مولانا محمد اسحٰق دہلویؒ، مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا مملوک العلی، اسی طرح اہم مقامات مثلاً تھانہ بھون، شاملی وغیرہ کے اہم واقعات کا ذکر ہے۔

اس جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی پر ختم ہونے کے نتیجہ میں عام مسلمانوں

بالخصوص علماء کی ہر جگہ دار و گیر ہوئی اور انھیں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا بھی تفصیلی ذکر ہے، جس میں حاجی امداد اللہؒ اور ان کے ممتاز ترین خلفاء — حضرت الامام نانوتوی، حضرت گنگوہیؒ وغیرہ — کی آزمائشوں اور سرگرمیوں کا، نیز مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد منیرؒ کا تذکرہ، پھر بعض ایسے مقامات کا جہاں جنگ آزادی اہتمام سے لڑی گئی، ان میں مرادآباد، بریلی، بجنور وغیرہا شامل ہیں، مختصر ومفصل ذکر ہے۔

حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی کے تذکرہ کے ساتھ ناگزیر تھا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اور ان کے اہم رفقاء استاذ نا حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہ کے تذکرے بھی ہوں، چنانچہ ان مبارک ہستیوں کے مبارک ذکر پر، مسک الختام ہوجاتا ہے:

أولئک آبائی فجئنا بمثلهم
إذا جمعتنا یا جریر المجامع

فرحمهم الله رحمة کاملة واسعة، وأدخلهم جنات النعیم.

☆ ☆ ☆

قدیم اسلامی علوم کا منہج تعلیم اور نصاب

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی

سید الانبیاء والمرسلین، سیدنا محمد وآله وصحبه أجمعین، أما بعد.

جامعہ سید احمد شہید (کٹولی) کے ''سہ روزہ سیمینار'' میں دعوت دے کر راقم کی عزت افزائی کی گئی جس پر احقر منتظمین بالخصوص داعی برادر گرامی قدر مولانا سید سلمان حسینی سلمہ کا شکر گذار ہے، یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر ادھر کوئی ایک صدی کے اندر نہ جانے کتنی بار مختلف نکات پر وقفہ وقفہ سے اجتماعات ہو چکے ہیں اور تجاویز منظور کی گئی ہیں، مگر لگتا ہے کہ ہنوز روز اول والی صورت حال ہے، اگر پچھلے اجتماعات سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوگئے ہوتے تو شاید اب مزید اس موضوع پر اہل علم و دانش وغیرہ کے اجتماع کی ضرورت نہ پیش آتی، راقم سے متعلق موضوع ''قدیم اسلامی علوم کا منہج تعلیم اور نصاب'' کیا گیا ہے، اس موضوع کا تقاضہ نیز راقم کے اپنے مطالعہ اور غور وفکر کا مقتضا یہ ہے کہ جب تک طلوع آفتاب اسلام سے لے کر ماضی قریب تک کی علمی درسگاہوں کے عملی وعلمی آثار ونتائج کا جائزہ خواہ مختصر ہو نہیں لیا جائے گا اس وقت تک بات واضح نہیں ہوسکے گی اور کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہوگا، شروع میں ہی یہ عرض کر دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ درسگاہ کے اصلاً تین بنیادی ستون ہیں: (۱) اساتذہ ومنتظمین (بلکہ اصلاً اساتذہ)، (۲) طلبہ، (۳) نصابِ تعلیم۔

ان میں سب سے اہم پہلے دو ہیں، تیسرے کی حیثیت محض ثانوی ہے، یہی وجہ ہے کہ نصابی کتب کے بدلنے سے چنداں تبدیلی واقع نہیں ہوتی؛ البتہ اساتذہ اور طلبہ کی ذہنی وعملی تبدیلی ہمیشہ بہت مؤثر ثابت ہوتی ہے، ان تمہیدی سطور کے بعد اصل مدعا پیش کیا جاتا ہے۔ **وبالله التوفیق.**

باخبر حضرات کو یہ بتانا تو قطعاً غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم دینی کے لحاظ سے معیاری اور آئیڈیل پہلا وہ مدرسہ ہے جس کی بنیاد خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ان ہی کی بابرکت مسجد کے اندر صفہ پر رکھی گئی تھی، اس بنا پر معیاری تعلیم کے لئے ہی نہیں معیاری معلم ومتعلم کے لئے بھی اسی مدرسہ کو اسوۂ (آئیڈیل) سمجھنا ہوگا، اس سے جو مدرسہ

اور معلم ومتعلم جتنا قریب ہوگا اتنا ہی بلند مرتبہ پانے کا مستحق بنے گا، اسی طرح کردار سازی اور کردار میں جو درسگاہ اور اس کے وابستگان اس مدرسہ سے جتنے مشابہ ہوں گے اتنے ہی وہ کامیاب قرار دیئے جائیں گے، اسی وجہ سے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ سب سے پہلے اولین مدرسہ اور اس کے معلم کامل (صلی اللہ علیہ وسلم) نیز متعلمین کے کردار کا...... مختصر ترین ہی سہی...... تذکرہ کریں اور اولین معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) جسے خود خالق نے ''**انک لعلیٰ خلق عظیم**'' کی سند دی ہو، اسی طرح ''مدرسہ اولیٰ'' کے تمام متعلمین کے کردار پر مختصر روشنی ڈالنا بھی کسی مقالہ کا نہیں ضخیم کتاب کا موضوع ہے اس لئے یہاں اس بابرکت درسگاہ کے صرف ایک نمونہ (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) کی ہلکی سی جھلک دکھانے پر اکتفاء کیا جارہا ہے۔

ان کا تحصیل علم میں انہماک کا یہ حال تھا کہ وہ معلم انسانیت کے گویا سایہ بن گئے تھے، انھوں نے جب سے آستانۂ نبوی پر قدم رکھا (۷ھ میں) تو اسی کے ہو رہے، نہ گھربار سے خاص سروکار رکھا نہ کسبِ معاش کے جھمیلوں میں خود کو ڈالنا گوارا کیا اور نہ بھوک اور پیاس کی پرواہ کی، ان کی اسی وارفتگی اور علم کی سچی پیاس دیکھ کر معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے حریص فی العلم ہونے کی شہادت دی، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ موصوف بالاتفاق ''احفظ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' قرار پائے، صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حفظ احادیث کا ان کے کردار وعمل پر جو اثر پڑنا چاہئے تھا وہ بھی ظاہر ہوا، بایں ہمہ خوف آخرت کا یہ حال تھا:

...... أن أباهريرة رضى الله عنه بكى فى مرضه فقيل له: ما يبكيك؟ قال: أما إنه ما أبكى على دنياكم هذه، ولكن أبكى على بعد سفرى وقلة زادى.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پھر بحیثیت استاد و مدرس کے کتنے معیاری اور اعلیٰ ثابت ہوئے اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شاگردوں میں صحابہ کرام

کی بھی ایک تعداد ہے اور جلیل القدر تابعی شاگردوں کا تو پورا شمار ہی مشکل ہے، محتاط ترین اندازہ کے مطابق آٹھ سو ہے، یہ ہے وہ نمونہ جو پہلے معیاری مدرسہ نے پیش کیا۔

اس موقع پر پہلے یہ ذکر کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ امتیازات اور بنیادی اوصاف کونسے ہیں جن کا اس معیار پر ٹھیک اُترنے والوں کے اندر پایا جانا ضروری ہے، اس بارے میں سب سے زیادہ جامع مختصر اور بلیغ کلام امام غزالی کی معرکۃ الآراء تصنیف '' احیاء علوم الدین'' میں ملتا ہے، موصوف نے یہ پانچ اوصاف ضروری بتائے ہیں، عبادت، زہد، علم، تفقہ، اخلاص۔

اصل بات یہ چل رہی تھی کہ صفہ کی سرزمین پر اُگنے والے شجرۂ طوبیٰ کی ان شاخوں کے ثمرات کو بھی ذرا دیکھیں جو ارضِ مقدسہ سے نکل کر دور تک پھیلیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسی کا تذکرہ مناسب ہوگا، جس کی عظمت کے سامنے عجم ہی نہیں عرب بھی جھکا جھکا سا نظر آتا ہے کہ جس کی نظر میں دنیا واقعی مچھر کے پر کی طرح حقیر تھی، اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے جلیل القدر امام نے اگر یہ اطلاع دی کہ: ''**عرضت عليه الدنيا بحذافيرها ففر منها**'' تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اور جو صرف بدنی ہی نہیں مالی ذریعہ سے بھی خدا کے قرب کے لئے ایسے اور اتنے کام کرتا تھا اور جس کی جود وسخا اور ورع وتقویٰ کے اتنے واقعات ہیں کہ ان پر اس کے ناقد اور معتقد بھی منھ بھر بھر کر تعریف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ذی علم قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ ہماری مراد امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ہے۔

عرب وعجم کے دونمونے دیکھ لینے کے بعد اب ذرا اس سرزمین کے علمی گلستانوں کی بھی تھوڑی سیر کرلیں جس میں صدیوں بعد اسلام کی بہار آئی اور علوم دینیہ کی کھیتی لہلہائی، ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ان میں سے بس چند کی نکہت سے مشام جہاں کو، آج کی محفل میں معطر وآسودہ کرنا مقصود ہے، گیارہویں صدی ہجری میں سید محمد مبارک نامی بڑے جلیل القدر عالم بلگرام میں گذرے ہیں، ان کی خودداری اور غیرت ایمانی کا نہیں حمیت علمی کا

ایک ایسا واقعہ مطالعہ میں آیا کہ جسے ذکر کئے بغیر گذر جانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔

جس کا حال ان ہی کے شاگرد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: ''محدث ممدوح وضو کرنے کے لئے اٹھے ہی تھے کہ اچانک گر پڑے، سبب دریافت کیا تو بہت ردوقدح کے بعد بمشکل بتایا کہ میں دن سے منھ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی ہے یہ فقر وفاقہ نیز عسرت والی زندگی کی عادت حق گوئی و بے باکی کے علاوہ جود وسخا اور عجز وانکسار کے لئے بھی بہت بڑا ہتھیار رہے اور یہ ہتھیار صرف مدارس عربیہ ہی کے سلاح خانوں میں رہا اور وہیں سے ملتا یا مل سکتا ہے، جو عسرت کی زندگی کا عادی ہو وہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں معاشی فارغ البالی سے محروم بھی کر دیا جائے تو اس کے لئے زندگی وبالِ دوش نہیں بن سکتی، یہ وہ نکتہ ہے جو اس طریق کے راہ نوردوں بلکہ راہنماؤں نے سمجھ لیا تھا اور جنھوں نے یہ راز پالیا تھا وہ شاہان مملکت کو بھی نگاہ میں نہیں لاتے تھے اور انھیں ان کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ذلت نہیں اُٹھانا پڑتی تھی۔

یہی وہ سبق تھا جو علوم دینیہ کے رسمی اسباق کے ساتھ مدارس میں پڑھایا جاتا رہا اور حق کی خاطر دنیوی ہر مفاد کو ٹھکرا دینے کا جذبہ اسی تعلیم وتربیت سے پیدا ہوتا تھا جو مدارس میں دی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ عجز وانکسار، نیز خدمت خلق جیسی صفات ان ہی مدارس کے مستفیدین کا طرۂ امتیاز رہی ہیں، اگرچہ قدیم نظام پر یہ اعتراض بار بار کیا گیا اور آج بھی کیا جاتا ہے کہ اس سے طلبہ کی خودی اور عزت نفس مجروح ہوتی ہے؛ لیکن مولانا گیلانیؒ کے الفاظ میں :

> یہ ان کی طرف سے کہا جاتا ہے جن کے اندر ہی میں نہیں باہر بھی اپنا کچھ باقی نہیں، چہرہ سے، پیشانی سے، گریبانوں سے، ٹانگوں سے، الغرض ہر جگہ سے جہاں اس کا امکان تھا اپنی خودی کو پوچھ پوچھ کر دوسروں کو بھرا گیا ہے۔

مگر اس قدیم نظام کے تحت تعلیم وتربیت پانے والوں کی طرف سے خودی اور خود

داری، نیز اپنا تشخص قائم رکھنے اور عزت نفس کی حفاظت کرنے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کی ایسی اور اتنی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ دوسرا کوئی نظام تعلیم وتربیت ان کے ہم پلہ تو کیا اس کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکا اور شاید نہیں کر سکتا، حضرت تھانویؒ کا نظام دکن (جو نواب نہیں فی الواقع ایک خاصی بڑی سلطنت کا سلطان تھا، جس کے دربار کی باریابی بخت کی معراج سمجھی جاتی تھی) سے ملاقات نہ کرنا؛ بلکہ نظام کے خاص مصاحب کی خواہش ملاقات کو ٹھکرا دینا قدیم نظام تعلیم وتربیت کے ہزاروں نمونوں میں سے ایک ہے، آج جب کہ بڑی تنخواہوں کے لالچ میں لوگ اپنے ادارے ہی نہیں ؛ بلکہ ملک چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہیں اور تنخواہیں بڑھوانے کے لئے زبانی اصرار ہی نہیں اسٹرائکیں اور مظاہرے ہو رہے ہیں، مگر گذشتہ نظام تعلیم وتربیت نے ایک نہیں ہزاروں اس طرح کے نمونے پیش کئے کہ مثلاً مولانا یعقوب صاحب نانوتوی نے ۳۰/روپے کے مشاہرہ کو چھوڑ کر ''دس گنی تنخواہ'' پر یعنی تین سو روپے ماہانہ کی پیشکش پر جانا اور محسن ادارے اور محسنوں کے سائے سے جدا ہونا گوارہ نہیں کیا ۔

ان حضرات کا مدرسہ کی رقم اور عوامی چندہ کے خرچ کے بارے میں احتیاط کا یہ حال تھا کہ آج کے جیسے بے احتیاطی کے دور میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، مثلاً حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ اگر بہ ضرورت کبھی مدرسہ کے دوات وقلم سے اپنا کوئی خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانہ میں داخل کر دیتے اور فرماتے کہ یہ بیت المال کی چیز ہے ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں اور اس سے بھی عجیب تر واقعہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کا ہے جو مدرسہ مظاہر علوم میں سردی کے موسم میں سالن کے برتن کو مدرسہ کی مسجد کے حمام کے سامنے اندر نہیں؛ بلکہ باہر رکھوا دیتے تھے، اس کی تپش سے وہ گرم ہو جاتا تھا تو یہ فرما کر وہ تین روپے ہر ماہ چندہ کے طور پر دیتے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے؛ حالاں کہ اس زمانہ میں دو وقت کھانے کی ماہانہ فیس ہی غالباً اتنی ہوتی ہوگی۔

ان اکابر کا مفوضہ فرائض کے انجام دہی اور احساس ذمہ داری میں یہ حال تھا کہ آج

اس کا باور کرنا بھی مشکل نظر آتا ہے، اختصار کے پیشِ نظر اس کی صرف ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے :

> استاذ العلماء حضرت مولانا اعزاز علیؒ اسی مادرِ علمی (دارالعلوم دیوبند) کے لائق ترین فرزند بھی تھے (جس میں نصف صدی سے زیادہ مدت تک درس دیا، جنھیں ان کے تلامیذ شفیق ترین باپ بجا طور پر سمجھتے تھے اور جن پر فنِ تدریس کا کمال گویا ختم سمجھا جاتا ہے، ان کا درس دینے میں پابندی اوقات کے لحاظ سے یہ حال تھا کہ سردی ہو یا گرمی، جاڑا ہو یا برسات، بیماری ہو یا تندرستی، شادی ہو یا غمی، بہرحال سبق ہونا چاہئے ...... ابھی درس کا وقت شروع ہونے میں دس منٹ باقی ہیں کہ مولانا نے بغل میں کتابیں دبائیں اور کمرہ کو مقفل کرنا شروع کردیا، ابھی پانچ منٹ باقی ہیں، مگر مولانا کا اضطراب نہ پوچھئے! مدرسہ کے گھنٹہ پر چوٹ پڑی اور مولانا نے درسگاہ کی طرف عجلت کے ساتھ قدم بڑھانا شروع کردیا، گھنٹہ بجانے والا ابھی بجانے سے فارغ نہیں ہوا کہ درسگاہ پہنچ گئے، وہ سخت بیمار ہوتے ہیں، معالجین و متعلقین کا اصرار ہوتا ہے کہ اس وقت سبق نہ پڑھائیے، مگر وہ کہاں مانتے بلکہ فرماتے ہیں کہ ''اسی میں میرے لئے شفا ہے، سب سے بڑھ کر تو یہ واقعہ ہے کہ مولانا، اہلیہ محترمہ کی تدفین سے فارغ ہوکر عصر کے قریب لوٹے تو مغرب کے بعد شمائل ترمذی پڑھانے کے لئے درسگاہ میں موجود۔

ان قدسی صفات حضرات کے طرزِ عمل نے ان کے منتسبین و ہم نشین افراد کا مزاج بھی یہی بنا دیا تھا، لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات دوسروں سے وصول کرنے کے باب

میں جتنے ''عسیر'' (مشکل پسند) ہوئے تھے اوروں پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں اتنے ہی ''یسیر'' (فراخ حوصلہ) تھے ان کا زہد زاہدِ خشک کا زہد نہ تھا؛ بلکہ وہ تھا جو امام مالکؒ نے ان الفاظ میں بتایا: ''لیس الزهد فقد المال وانما الزهد فراغ القلب'' یا امام غزالیؒ نے فرمایا: ''راس الزهد السخا'' (اصل زہد تو سخاوت ہے)، چنانچہ ان حضرات کے دسترخوان پر کھانے والوں کی تعداد اور ان کی سیر چشموں کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ وہی محتاط اشخاص ہیں جو کہ مدرسہ کے قالین پر بیٹھ کر دوستوں سے گفتگو کرنا بھی اس لئے نامناسب سمجھتے ہیں کہ ''قالین صرف تدریس کے لئے دیا گیا ہے''۔

حضرت سہارنپوری اور حضرت مدنی (قدس اللہ اسرارہم) کی مہمان نوازیوں اور حوصلہ مندیوں کے واقعات دیکھنے والے بحمد اللہ ابھی موجود ہیں بالخصوص حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے دسترخوان کی وسعت پر شاہد، بلکہ ان کے خوشہ چین اور ان میں سے بہت سے موجود ہیں (جن میں یہ حقیر بھی ہے) اور ان سب سے پھولوں کے ''عطر مجموعہ''، یعنی سب کے معتمد اور سچے جانشین سیدی ومولائی حضرت اقدس شیخ الحدیث علیہ الرحمہ نے تو اس باب میں بھی وہ نقش قائم کیا جو اپنی مثال آپ ہے، دور نہیں رمضان ۱۳۹۹ھ کے اخیر عشرہ میں حاضری کی سعادت جن کے حصہ میں آئی وہ سب ہی اس رنگ کی میزبانی دیکھ کر کہ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مہمان ہوں اور ہر ایک مہمان نوازی اعلیٰ درجہ کی اور اس طور پر ہو کہ معمولات میں فرق نہ آئے، حیرت میں پڑجائیں تو بعید نہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سوچیں کہ آج ان ہی اسلاف کے نام لینے والوں میں سے اکثریت کی (اور اکثریت بھی کیسی؟ غالباً سو میں ننانوے کی) جو حالت ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے کیا زمانہ ہماری قدر دانیوں کے لئے سرو قد محض اس وجہ سے کھڑا ہوجائے گا کہ ہم ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ بہت زور سے لگاتے یا لگا سکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور اندازہ ہے کہ یقیناً آپ سبھی کا جواب نفی میں ہی ہوگا تو بہ ہزار معذرت یہ سوال پیش کرنے کا مجاز ٹھرایا جاؤں گا کہ ان ہی گلستانوں میں ایسے پھول کھلنے اور ان ہی

باغوں میں ایسے پھل اترنے اب اس قدر کم کیوں ہو گئے؟ (یہ نہیں کہتا کہ بند ہو گئے) کہ ''غیر'' ہی نہیں، اپنے بھی اس قسم کے سوال کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں......اس اجمال کی تفصیل کے لئے نہ تو وقت ہے اور نہ اس کی چنداں ضرورت! کیوں کہ ہر دردمند کم وبیش تفصیلات سے واقف ہے، دل یہی چاہتا ہے کہ یہ مدارس پھر وہی برگ و بار دینے لگیں، دینی فکر و ذہن کے حاملین میں سے کوئی بھی، امام دارالہجرۃ (مالکؒ) کے اس حکیمانہ بلکہ الہامی مقولہ ''لن يصلح آخر هذه الأمة الا بماصلح به اولها'' کی افادیت وتاثیر سے انکار کی جرأت نہیں کرے گا، بنابریں مدارس کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں کو انھیں ہتھیاروں سے لیس ہونا پڑے گا، جن سے ہمارے اسلاف ''اول ہذہ الامۃ'' نے کام لیا تھا، ان میں بنیادی حیثیت ان تین کو حاصل ہے۔

۱- تقویٰ، تقویٰ صرف محدود معنی میں نہیں بلکہ اپنے وسیع تر مفہوم میں جس کے اندر خداوند تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے ساتھ ہر اس چیز سے پرہیز کرنا شامل ہے جو مقصد کے لئے ضرر رساں ہو۔

۲- صبر، یعنی جن اُمور سے مقصد برآری کی اُمید ہو ان پر جی جان کھپا دینا اور کسی مرحلہ میں بھی ہمت نہ ہارنا؛ بلکہ پوری لگن کے ساتھ کام کرنا اور سخت سے سخت مواقع پر ثابت قدم رہنا۔

۳- احسان، ہر کام کو بہتر طریقہ پر انجام دینا جس کے اندر اخلاص کو نمایاں مقام حاصل ہے، اس کارگر اور تیر بہدف نسخے کا پتہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے اس حکیمانہ مقولہ سے چلتا ہے جو اللہ نے قرآن مجید میں قیامت تک کے لئے محفوظ فرما دیا: ''**إنه من يتق ويصبر فإن الله لا يضيع أجر المحسنين**''۔(یوسف)

یہی وہ نسخہ ہے جسے استعمال کر کے حضرت موصوف جیل کی بلکہ کنویں کی قید اور غلامی کی ذلت سے نکل کر براہ راست تخت حکومت پر جلوہ افروز ہو گئے تھے، گویا یہ نسخہ صرف نظری نہیں بلکہ عملی ہے کہ جس کی کامیابی کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔

اس نسخہ کے استعمال کرنے والے کے اندر استغناء، حق گوئی و بے باکی، علمی تبحر، زہد وتقویٰ، فرض شناسی اور اخلاص (جو شاہ کلید ہے) کا پیدا ہو جانا طبعی ہے، ان صفات سے مزین جب مدارس کے ذمہ دار اور مدرسین، طلبہ کے مستقبل سنوارنے اور انھیں ان ہی اوصاف سے متصف کرنے کی پوری سعی کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ مدارس پھر وہی ثمر دینے لگیں گے جو ان سے اصلاً مطلوب ہیں، بتانے کی ضرورت نہیں کہ مدارس کی اصلاح میں مدرسین و معلمین کا حصہ سب سے زیادہ ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے لئے نمونہ بنتے ہیں اسی کے برابر مقصد (ہدف) کی اہمیت کا ہے، یعنی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کا مقصد اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہو، درحقیقت خرابی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ آج اس مقصد سے طلبہ بالعموم عاری ہوتے ہیں، ان کے سامنے بس جیسے تیسے امتحان پاس کر لینا پھر سند حاصل کر کے دنیاوی ترقیوں کے زینے طے کرنا ہوتا ہے، کہنے دیجئے کہ بڑے مدارس کی سندوں کی مادی قیمتوں کے بڑھ جانے سے اصلی مقصد کو بڑا نقصان پہنچا ہے، ان مدارس کی سندوں کو بعض یونیورسیٹیوں کے اپنے یہاں اونچے درجوں میں داخلہ کے لئے قبول کر لینے سے بظاہر لگتا ہے کہ مدارس کی قدر افزائی کی گئی ہے؛ لیکن درحقیقت اس طرح ان مدارس کے مقاصد کو شدید نقصان پہنچانے کی راہ، دانستہ یا نادانستہ، نکالی گئی ہے، اس لئے اس خطرناک حکمت عملی کا تدارک کرنے کی فکر سب سے پہلے کرنی چاہئے، نیز طلبہ کے اندر مقصد کی لگن اور حصول علم کا شوق اور آخرت کی فکر پیدا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے، اس سلسلہ میں تاریخ کی ایسی مثالوں کا پیش کرنا مناسب نہ ہوگا کہ محض علم کو مقصد بنانے والے بھی بڑے سے بڑے دنیاوی اعزازات اور مادی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔

☆ ☆ ☆

کولمبس کے دیش امریکہ میں ڈھائی ہفتے

امریکہ کی دریافت کا سہرا — غلط یا صحیح طور پر — پندرہویں صدی کے اٹلی نژاد ''کولمبس'' نامی ایک یورپین سیاح کے سر باندھا جاتا ہے، اگرچہ اس ملک کا نام (کولمبس کے بجائے اس کے چھ سال بعد ۱۴۹۸ء میں) وہاں جانے والے سیاح ''امریگو'' (Amerigo) کے نام پر ''امریکہ'' (America) پڑا۔

ادھر عرصہ سے تمام دنیا پر — خفیہ یا علانیہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ — جن دو حکومتوں کی گویا حکمرانی ہے ان میں سے ایک امریکہ ہے، علاوہ ازیں وہاں کی خوشحالی نیز مال ودولت کی فراوانی کے چرچے بھی عام ہیں، اس لئے قدرتی طور پر اس کی اہمیت کا فی الجملہ احساس تھا، مگر اس کا اندازہ نہ تھا کہ قریبی زمانہ میں جدید تہذیب وتمدن کے گہوارہ میں جا کر اس کے حسن وقبح کا بچشم خود مشاہدہ کرکے عبرت وبصیرت کا سامان فراہم کرنے کا موقع ملے گا؛ لیکن ایک دینی محرک سے راقم الحروف اکتوبر ۱۹۸۹ء کے پہلے ہفتہ میں شمالی امریکہ کے مشہور صنعتی وتجارتی مرکز اور بلند وبالا بلکہ فلک بوس عمارتوں کے لئے مشہور ''میشگن'' جھیل کے کنارے آباد خوبصورت ترین شہر ''شکاگو'' پہنچا۔

سفر امریکہ کی تقریب

اللہ کے سچے اور آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی :

لیبلغن هذا الامر ما بلغ اللیل والنهار ولا یترک الله بیت مدر ولا دبر الا ادخله هذا الدین ۔ (احمد)

جہاں دن رات کی گردش ہوگی (یعنی ساری دنیا) وہاں یہ دین بھی ضرور پہنچے گا، اس دین سے کوئی چھوٹی بڑی آبادی خالی نہیں

رہے گی۔

— کی یہ دلیل صداقت بلکہ شہادت سمجھی جائے گی کہ اتنے دور دراز فاصلہ پر واقع (ارض حرم سے جس کا فاصلہ تقریباً پندرہ ہزار کیلومیٹر ہے) یہ سرزمین امریکہ بھی نورِ اسلام سے منور ہوئے بغیر نہیں رہی؛ بلکہ بعید نہیں کہ وہاں باہر سے پہنچنے والا پہلا انسان ہی جیسا کہ محققین سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے ایک عرب نے اسے دریافت کیا، خدا یہ سچا پیغام ''اسلام'' لے کر پہنچا ہو اور اب تو غالباً امریکہ میں کوئی بڑا شہر ایسا نہ ہوگا جہاں کچھ نہ کچھ کلمہ گو نہ ہوں اور ان کی تعداد بحمد اللہ روز افزوں ہے۔

مگر دین اسلام کی دولت سے مالا مال یا اس کی طرف مائل ہوجانے والوں ...... سے ان کی یہ بے بہا دولت چھین لینے یا انھیں غلط راستوں پر ڈالنے کے لئے کچھ گروہ عرصہ سے حملہ آور ہو رہے تھے، ادھر ان کے حملے تیز تر ہونے لگے، ان حملہ آوروں میں ''قادیانی'' گروہ سب سے زیادہ پیش پیش ہے کہ مادیت کی یلغار سے اُکتا جانے اور فطرت سلیم رکھنے والوں کو دین فطرت (اسلام) کی طرف ان کی فطری کشش ...... سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قادیانیت کو ''اسلام'' کا نام دے کر اپنے جال میں پھانسنے کی جدوجہد میں یہ گروہ لگ گیا اور حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کو شکار کرلینے کے سنہرے خواب دیکھنے لگا۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کا شکاگو میں قیام

اس صورتِ حال سے اسلام کے سچے خادموں کا فکر مند اور بے چین ہونا فطری تھا، چنانچہ ان ہی میں سے چند بیدار مغز اور فکر مند مخلصین نے ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' قائم کی، شمالی امریکہ کا مشہور شہر شکاگو، جو مسلم آبادی کا امریکہ میں غالباً سب سے بڑا مرکز بھی ہے، اس مجلس کا مرکزی مقام قرار دیا گیا۔

دراصل قادیانیت کو اسلام کا نام دینا ایسا ہی ہے؛ جیسا کہ اسلام کو یہودیت یا نصرانیت کا نام صرف اس لئے دیا جائے کہ مسلمان بھی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو

نبی مانتے ہیں، یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ نئے نبی کی آمد ماننے والوں کو پچھلے نبی کے لائے ہوئے دین کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا، اس لئے جب قادیانی مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں تو انھیں خود کو مسلمان کہنے کا کوئی حق نہیں رہ جاتا۔

مجلس تحفظ کے امیر مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم (جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور اسی مردم خیز قصبہ دیوبند کے باشندے بھی ہیں) نے اپنے ایک تعارفی پمفلٹ میں مجلس کے قیام کا پس منظر اور اس کے یہ اغراض ومقاصد بیان فرمائے ہیں :

> ...... قادیانی ان ملکوں (مغربی ملکوں) میں مراکز قائم کرکے، وہی فریب کا راستہ اختیار کرتے ہیں (یعنی اسلام کے نام سے قادیانیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔

کتابچہ میں ان کے فریب کارانہ کوششوں کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ :

> الحمدللہ صحیح العقیدہ مسلمان تو ان کے ہاتھ نہیں لگتے؛ لیکن مقامی عیسائی باشندے جو مذہب سے بے خبر ہیں یا اپنے آبائی مذہب سے دل برداشتہ ہیں اور انھوں نے اسلام کا نام سن رکھا ہے، ان میں سے بعض لوگ ان قادیانی مبلغین کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے بنام ''اسلام'' قادیانیت قبول کرلیتے ہیں۔

مجلس کے قیام کی ضرورت کا اظہار یوں کیا ہے :

> ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے سد باب کی منظّم صورت ہونی چاہئے ، اس لئے شکاگو اور ملک کے مختلف اہل الرائے کے مشورے سے یہی مناسب معلوم ہوا کہ یہاں (امریکہ میں بھی ''تحفظ ختم نبوت'' کے نام سے کام کیا جائے۔

چنانچہ اس 'مجلس' ہی کی ایک تجویز کے مطابق ماہ اکتوبر (۷، ۸) ۸۹ء میں ایک

سیمینار منعقد کیا گیا، جس میں شرکت کی دعوت راقم الحروف کو بھی دی گئی۔

سیمینار میں تمام دنیا کی نمائندگی

اگرچہ اس مجلس کی طرف سے منعقد ہونے والا یہ پہلا سیمینار تھا؛ لیکن موضوع کے ساتھ علاقہ کی اہمیت (جس میں اس کام کی قدر وقیمت اور اہمیت بھی دو چند ہوگئی ہے) کی وجہ سے مدعوین میں سے اکثر نے باوجود طویل اور پرمشقت سفر کے وہاں پہنچنا اپنی شرعی ذمہ داری بلکہ ملی فریضہ سمجھا، اس لئے وہاں اصحاب تحریر وتقریر کی بڑی تعداد جمع ہوگئی۔

برصغیر (ہندو پاک وبنگلہ دیش) کے علاوہ افریقہ، یورپ، امریکہ، کناڈا کے متعدد ملکوں کے نمائندے وہاں پہنچے، شرکت کرنے والے مدعوین میں سعودی عرب سے امیر محمد بن فیصل ابن ترکی (اسلامی اُمور کے، واشنگٹن میں سعودی حکومت کی طرف سے نمائندہ) مصر سے عربی وانگریزی کے شعلہ بیان مقرر فتحی عثمان اور ہندوستان کے راقم الحروف (محمد برہان الدین) کے علاوہ مولانا محمد نعیم صاحب اور ان کے خویش مولانا نادر صاحب دیوبندی مولانا حمید الدین عاقل حسامی (حیدرآباد) مولانا کے ساتھ ان کے خویش مسٹر رحیم الدین انصاری، مولانا یوسف اصلاحی صاحب (رامپور) پاکستان سے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب (کراچی) مولانا سمیع الحق صاحب (اکوڑہ خٹک) مولانا اجمل قادری صاحب حفید مولانا شاہ احمد علیؒ مفسر (لاہور) مولانا محمد منظور صاحب (چنیوٹ) لندن سے عبدالرحمٰن یعقوب باوا صاحب اور مولانا منظور احمد حسینی صاحب کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امریکہ کے مختلف حصوں سے آکر شریک ہونے والوں کا جن میں اکثر دوسرے ملکوں کے رہنے والے تھے، سب سے زیادہ ہونا قدرتی تھا، ان میں مولانا ڈاکٹر مزمل حسین صاحب صدیقی ندوی کی ذات نمایاں تھی۔

سیمینار کے لئے مقررہ موضوع اور اس کا طریق کار

جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ سیمینار کا اصل مقصد تو ''قادیانیت'' کے جگائے فتنوں کا سد باب تھا؛ لیکن خود کو مسلمان کہنے والے ہر گمراہ فرقہ وتحریک کی طرح اسے قادیانیت کو بھی

حدیث وسنت سے بے اعتنائی یا قرآن وسنت کی غلط تشریح کی پیداوار سمجھا جاسکتا ہے، اس لئے حدیث وسنت کی اہمیت بھی (معہ متعدد ذیلی عنوانات کے) سیمینار کا ایک اہم موضوع تھا، سیمینار کے لئے راقم نے مقالہ اس موضوع پر (قرآن وسنت کا باہمی ربط'' کے عنوان سے لکھا تھا، جو دوسرے دن صبح کی نشست میں (۸/اکتوبر ۸۹ءکو) پیش کیا گیا، (انشاء اللہ اسے کسی دوسری فرصت میں کسی رسالہ میں شائع کیا جائے گا) بعض حضرات نے زبانی تقریر کی اور اکثر نے تحریری مقالات پیش کئے، سیمینار امریکہ میں ہونے کی وجہ سے یہ فطری تھا کہ اس کی زبان انگریز ہو، اس لئے دوسری زبانوں میں پیش کئے گئے مقالات اور تقریروں کے خلاصے بروقت انگریزی میں سامعین کے سامنے پیش کرنے کا بھی بہت اچھا نظم تھا۔

مہمانوں کا قیام

سیمینار کے دنوں میں مہمانوں کا قیام ایر پورٹ کے پاس مشہور فائیو اسٹار ہوٹل (Holiday Inn) میں رہا، اس ہوٹل کے ایک بڑے ہال کے اندر (جس کی چوڑائی سو فٹ سے کم نہ تھی) سیمینار کی اکثر نشستیں ہوئیں۔

امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کی دینی بیداری

یہ بات خوش آئند ہونے کے علاوہ امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کی دینی حس کی بیداری کی بھی علامت ہے کہ جس جگہ مسلمان تھوڑی تعداد میں اکٹھا ہوگئے ہیں، وہاں بھی انھوں نے چھوٹا یا بڑا اسلامی سنٹر قائم کرلیا ہے، (وہاں کے ایک بڑے سنٹر کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

چنانچہ جس بلاک میں سیمینار ختم ہونے کے بعد مہمان ٹھہرائے گئے تھے اس کے اندر بھی ایک سنٹر ہے، اس بلاک کے مالک ایک نیک طبیعت حیدرآبادی سید احمد محی الدین انجینئر ہیں، بلاک میں جو تیس بتیس فلیٹوں کا ہے، تقریباً سب مسلمان ہیں، ہر سنٹر کے اندر

نماز پڑھنے اور وضو کرنے کی جگہ کے علاوہ بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم (جس میں قرآن مجید، حفظ وناظرہ کی تعلیم بھی شامل ہے) کا نظم بھی ہے، تعلیم عموماً چھٹیوں کے اوقات وایام میں ہوتی ہے؛ کیوں کہ ہر بچے کے لئے عصری تعلیم لازم ہونے کی وجہ سے ہر ایک کا کسی عصری اسکول میں پڑھنا ضروری ہے، معلوم ہوا کہ تنہا ''شکاگو'' کے اندر ہی چھوٹے بڑے تیس سے زیادہ ایسے سنٹر ہیں۔

غذا کے مسئلہ پر مجلس مذاکرہ

امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے دینی رجحان اور شرعی احکام کی پابندی کے جذبہ کا اندازہ، سیمینار کے انعقاد اور کثیر تعداد میں اسلامک سنٹروں کے قیام کے علاوہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ وہاں رائج غذاؤں کے حلال وحرام ہونے کی تحقیق کرنے اور یہ جاننے کے لئے فکر مند رہتے ہیں کہ ان میں کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ تاکہ حرام سے بچا جائے، کچھ عرصہ قبل وہاں حلال گوشت کا ملنا ایک مسئلہ (Problem) تھا؛ لیکن سب سے پہلے وہاں پر مقیم ایک باحمیت اور دیندار عرب نے یہ دشواری دور کرنے کا بیڑا (لوجہ اللہ) اُٹھایا؛ چنانچہ اس نے رضا کارانہ طور پر — بغیر نفع وضرر کا خیال کئے — حلال گوشت مسلمانوں کو واجبی قیمت پر بہم پہنچانے کا اہتمام کیا، پھر اس کے ایثار واخلاص کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے وہاں کے مسلمانوں میں عام بیداری پیدا فرمادی کہ اب خدا کے فضل سے — امریکہ کے تمام ایسے بڑے شہروں میں کہ جہاں مسلمان کثیر تعداد میں ہوں — حلال گوشت کا ملنا بہت آسان ہوگیا، یہ بھی معلوم ہوا کہ تنہا ''شکاگو'' میں حلال گوشت کی سو دوکانیں ہیں، لیکن وہاں مسلمانوں کے لئے غذائی مسئلہ صرف یہی نہیں تھا؛ بلکہ اس کے علاوہ کھانے پینے کی سینکڑوں ایسی چیزیں رائج ہیں جن کے حلال ہونے میں شبہ کی پوری گنجائش ہے، ان میں بعض وہ چیزیں بھی شامل ہیں، جن کے بارے میں ہمارے یہاں مشتبہ ہونے کا تصور ہی نہیں ہوتا (مثلاً بسکٹ، ڈبل روٹی وغیرہ) اور سائنسی ترقی نیز آبادی

کی کثرت کی وجہ سے ان میں اضافہ بھی ہوتا چلا جا رہا ہے، جن کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے کم از کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حلت بڑی حد تک مشکوک ہے؛ بلکہ بہت سی چیزوں کی حرمت میں شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں۔

اس بارے میں غور وخوض نیز تحقیق کرنے اور علماء اسلام کی رائے جاننے کے لئے وہاں مستقل ایک کونسل (Council) بنام (The Islamic Food And Nutrition Council of America) یا ''المجلس الاسلامی للغذاء'' قائم ہے اس مجلس کے اغراض ومقاصد کے اندر مغربی معاشرہ میں حلال اشیاء کی فراہمی اور حلال طریقہ کی ترویج بھی شامل ہے، شکاگو میں ''ختم نبوت سیمینار'' کے موقعہ پر دنیا بھر سے آئے علماء کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کونسل نے غذائی مسائل پر مذاکرہ و بحث کے لئے ایک نشست (۹/اکتوبر ۸۹ھ کو اسی ہوٹل (Holiday Inn) کے ایک ہال میں رکھی اس مذاکرہ میں غذائی اشیاء کے تجزیہ کے ماہرین کے علاوہ ایسے صرف چند علماء مدعو کئے گئے تھے، جن کے بارے میں ذمہ داروں کو کسی ذریعہ سے پہلے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ فقہ سے مناسبت رکھتے ہیں، ان میں راقم الحروف محمد برہان الدین بھی تھا (راقم کو تو غذائی کونسل سے ایک طویل سوالنامہ کے ساتھ دعوت نامہ یہیں لکھنؤ بھیج دیا تھا جو روانگی سے قبل ہی مل گیا تھا) نیز پاکستان کے مشہور محقق عالم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، ہندوستان سے مولانا محمد نعیم صاحب (دیوبند) مولانا حمید الدین عاقل حسامی صاحب اور ان کے علاوہ پاکستان وافریقہ اور عرب کے چند ماہرین علماء نے بحث میں حصہ لیا، جن میں شیخ احمد صقر (عربی) سب سے نمایاں تھے یہ محدود پیمانہ کا مذاکرہ بڑا مفید اور نتیجہ خیز رہا، راقم کی نظر میں اس کی اہمیت بعض اعتبارات سے اصل سیمینار سے کم نہیں تھی، اگرچہ اس کی ایک ہی نشست ہوئی، مگر بہت طویل رہی، مجلس میں غذائی تجزیہ کے ماہرین کی موجودگی سے اکثر شرکاء کو فائدہ پہنچا، ان ہی سے یہ معلوم ہوا کہ وہاں کھانے پینے کی بعض اشیاء جانوروں کی ہڈیوں سے تیار ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں مردہ، ذبح شدہ —— نیز حرام وحلال —— ہر قسم کے جانوروں کی ہڈیاں

ہوتی ہیں، ایسی صورت میں ہڈیوں سے تیار ہونے والی کسی چیز کے استعمال کا شرعاً کیا حکم ہوگا؟ یہ اہم سوال ہے؛ لیکن اس کے جواب کے لئے یہ تنقیح ضروری ہے کہ ہڈیوں سے کھانے پینے کی کوئی چیز تیار کرتے وقت کیا ان کی حقیقت بدل جاتی ہے (جس طرح صابن بناتے وقت کہ اس میں حرام چربی کا بھی پاک ہو جانا بتایا جاتا ہے) یا نہیں بدلتی؟ یہ ایک علمی سوال ہے جس کا تفصیلی جواب دینے کے لئے ماہرین نے مزید مہلت مانگی۔

الکوحل کی حقیقت

اسی طرح اس مجلس میں یہ بھی بتایا گیا کہ کھانے پینے کی اکثر چیزوں —— بالخصوص مشروبات میں ''الکوحل'' کا استعمال عام ہے، راقم نے ان ماہرین سے ''الکوحل'' کی حقیقت دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ وہ ایک عنصر ہے، جو بہت سی چیزوں (مثلاً پھلوں، ترکاریوں) کے اندر قدرۃً موجود رہتا ہے، اسی عنصر کو بعض تدابیر سے علاحدہ کر کے بہت سے اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً خوشبو، ذائقہ بڑھانا، کسی چیز کو جلد خراب ہونے سے بچانا اور اس کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اس کے اندر ایسی بہت سی اشیاء بھی تحلیل ہو جاتی ہیں، جو اور کسی طرح حل نہیں ہو سکتیں، دریافت کرنے پر یہ بھی بتایا گیا کہ اس میں ہلاکت خیز حد تک سکر (نشہ) ہوتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص خالص ''الکوحل'' استعمال کر لے تو نشہ کے ساتھ ہلاک بھی ہو جائے۔

الکوحل کا استعمال

جیسا کہ پہلے ذکر آیا کہ امریکہ میں بلکہ غالباً مغربی ملکوں میں ''الکوحل'' کھانے پینے کی بہت سی چیزوں میں شامل رہتا ہے، جن میں بچوں کی مٹھائیاں، ٹافیاں، گولیاں، کوکا کولا وغیرہ بھی ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ وہاں (امریکہ وغیرہ میں) ہر چیز کا فارمولا (اجزائے ترکیبی) لکھنا قانوناً ضروری ہے؛ لیکن کسی چیز کا تناسب پانچ فیصد سے کم ہو تو لکھنا ضروری نہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر مشروبات اور مٹھائیوں میں ''الکوحل''

پانچ فیصد سے کم ہی ہوتا ہے اس لئے ان پر نہیں لکھا جاتا، ایسی اشیاء کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟ یہ سوال صرف مغربی ملکوں میں رہنے والوں کے لئے ہی اہم نہیں ہے؛ بلکہ ان سب کے لئے بھی اہم ہے جہاں مغرب سے اشیاء درآمد کی جاتی ہیں اور ایسا کونسا ملک ہے جہاں درآمد نہیں ہوتی؟

مسلم کمیونٹی سنٹر (M.C.C)

شکاگو میں رہنے والے مسلمانوں کے دینی جذبہ کا سب سے حوصلہ مندانہ اظہار —راقم کے نزدیک وہاں کے— مسلم کمیونٹی سنٹر کی شکل میں ہوتا ہے، (Muslim Community Centre) جس کا عربی نام ”مركز الجالية الإسلاميه“ ہے۔

جو کئی منزلہ طویل وعریض عمارت پر مشتمل ہے، جس میں چھوٹے بڑے بہت سے کمروں کے علاوہ ایک اتنا بڑا ہال ہے کہ اس میں بیک وقت تقریباً ڈیڑھ ہزار لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں اور ایک امتیازی بات یہ ہے کہ درمیان میں کوئی ستون نہیں ہے (راقم نے اتنا بڑا بغیر ستون کا ہال کم سے کم ہندوستان میں تو نہیں دیکھا) یہ سنٹر اسم بامسمی ہے، یعنی واقعی وہاں کے مسلمانوں کی تمام دینی وملی سرگرمیوں کا مرکز ہے، ہر ہفتہ کئی بار، درسِ قرآن، درس حدیث (انگریزی اُردو زبانوں میں) ہوتا ہے، علاوہ ازیں اس سے متعلق ایک دینی وعربی کالج بھی ہے، جس کے پرنسپل مولانا عبداللہ سلیم ہیں (جن کی حیثیت اس وقت وہاں سب سے بڑی دینی شخصیت کی ہے) مسلمانوں کو اس سنٹر سے وہاں تمام دینی کاموں کے لئے رہنمائی ملتی ہے، مثلاً نمازوں کے اوقات کا تفصیلی کلینڈر (جس میں نمازوں، طلوع وغروب وختم سحر کے اوقات کے ساتھ درس قرآن وحدیث کے اوقات بھی درج ہوتے ہیں) بھی یہ سنٹر شائع کرتا ہے، جمعہ، عیدین کی نمازیں اور دیگر بڑے بڑے دینی اجتماعات اس عمارت میں ہوتے ہیں، سیمینار کی ایک نشست بھی اسی میں ہوئی، حال ہی میں سنٹر کے اسکول کے واسطے ایک اور بڑی عمارت بیس لاکھ ڈالر تین کروڑ روپیہ) میں خریدی گئی ہے، معلوم ہوا کہ

یہ سب اخراجات، عموماً شکاگو کے مسلمانوں ہی برداشت کرتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کا مرکز

ہر ملک؛ بلکہ ہر شہر کی طرح شکاگو میں بھی تبلیغی جماعت کا ”مرکز“ ہے جو اوسط درجہ کی ایک عمارت پر مشتمل ہے، ایک روز بعد مغرب اس مرکز میں بھی راقم کچھ تبلیغی احباب کے ساتھ گیا، وقت ”مشورہ“ کا تھا؛ چنانچہ تمام موجودین مشورہ میں مشغول تھے، اس کے بعد عشاء کی نماز ہوئی، ہر جگہ کے مرکز کی طرح وہاں کا بھی طریق کار تھا وہیں ”بیت المقدس“ کے ایک باشندے سے ملاقات ہوئی، جو اس کام میں عرصہ سے لگے ہوئے ہیں۔

مالی تعاون حاصل کرنے کا نیا طریقہ

معلوم ہوا کہ وہاں مالی تعاون حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ معاونین کو ڈنر (رات کے کھانے) یا لنچ (دوپہر کے کھانے) پر بغرضِ مشورہ بلالیا جاتا ہے اور کھانے پر آنے والی لاگت سے کہیں زیادہ شرکاء پر فیس لازم کردی جاتی ہے اس طرح مشورہ بھی ہوجاتا ہے اور خاصی یافت بھی ہوجاتی ہے پھر کسی ملی یا اجتماعی کام میں صرف کی جاتی ہے؛ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جلسہ میں شرکت کے لئے فیس مقرر کردی جاتی ہے، یعنی مقامی جو شخص بھی شریک ہو تو وہ پہلے مقررہ فیس ادا کرے، چنانچہ سننے میں آیا کہ ختم نبوت سیمینار کے لئے بھی یہ طریقے اختیار کئے گئے تھے، اس کے باوجود سیمینار کے جلسوں میں عام شرکاء کی تعداد بہت تھی، جو کم سے کم ہم ہندوستانیوں کے لئے انوکھی بات ہے؛ کیوں کہ اگر یہاں کسی عام جلسہ کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو شاید منتظمین کے علاوہ اور کوئی جلسہ گاہ میں نظر نہ آئے، اسی طرح کی ایک اور جدت کا علم ہوا وہ یہ کہ چھٹی کے دنوں میں عموماً "M.C.C" (مسلم کمیونٹی سنٹر) میں اجتماعات ہوتے ہیں، اس میں شرکت کرنے کے لئے اکثر لوگ دور دراز فاصلے طے کرکے آتے ہیں، بعض رہائشی علاقے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر ہیں، بالعموم یہ اجتماعات دس بجے دن کے قریب شروع ہوتے ہیں اور عصر تک چلتے

ہیں، درمیان دوپہر کے کھانے (لنچ) کا وقت آتا ہے، اس وقت کھانے کا نظم وہاں مسلم خواتین کی ایک تنظیم کی ذمہ دار خواتین مل جل کر کھانا تیار کرتیں اور واجبی قیمت پر سنٹر کے ہی ایک حصہ میں، کھانا طلب کرنے والوں کو فراہم بھی خود کرتی ہیں، وہیں کھانا کھانے کا بھی انتظام ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نفع ہوتا ہے اسے ''تنظیم'' کے فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔

چند قابل فکر و توجہ پہلو

اوپر کی تفصیلات سے امریکا خاص طور پر شکاگو میں رہنے والے مسلمانوں کی دینی بیداری اور اسلامی شعائر کی پابندی کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ یقیناً دینداروں کے لئے خوش کن اور اطمینان بخش ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بات بہت فکر کی ہے کہ وہاں کے تمام رہنے والے، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، مذہبی ملکی، وطنی امتیازات سے قطع نظر، ایک ہی تمدن اور ایک ہی طرز معاشرت میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں (الا ماشاء اللہ) اس لئے بسا اوقات یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شخص مذہب سے تعلق رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں رہنے والے مسلمانوں کی معتد بہ تعداد نے اپنے اعتقادی اور عبادتی امتیاز کو محفوظ رکھنے کی تو بڑی حد تک کوششیں کی ہیں اور برابر کر رہے ہیں؛ لیکن تمدن و ثقافت اور معاشرت کے بارے میں وہ احتیاط نہیں برتی جو برتنی چاہئے؛ بلکہ بیشتر لوگوں نے جن میں اکثر دین دار بھی شامل ہیں، وہی تمدن اپنا لیا جو وہاں رائج ہے، اگرچہ ہندو پاک کے تمدن پر بھی مغرب کی یہ چھاپ اب تو بہت گہری ہوتی جاتی ہے؛ لیکن وہاں کی صورت حال زیادہ فکر مند بنانے والی ہے؛ کیوں کہ وہاں کسی درجہ کی بھی مقاومت نہیں ہے، اس سے بھی زیادہ تشویش امر یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کے مغربی تمدن و تہذیب ہی میں نہیں بلکہ خدا نہ کردہ، مذہب تک میں ضم ہو جانے کے خطرات سے انکار بہت مشکل ہے اور یہ خطرات اس لئے اور بڑھ گئے ہیں کہ یہاں سے جانے والے عموماً وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے شہریت حاصل کرنے کی فکر میں لگے ہیں اور جنھیں کامیابی ہوگئی ہے، انھوں نے اپنے ذاتی

مکانات بنالئے ہیں، اگرچہ پختہ عمر کے لوگوں میں اس خطرہ کا احساس ہے اور ان کے لئے فکر مندی پائی جاتی ہے؛ بلکہ چھوٹے پیمانے کی تدابیر بھی اختیار کر رکھی ہیں (مثلاً بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لئے سنٹروں کا نظم کر رکھا ہے) مگر جس درجہ کا خطرہ درپیش ہے اس کے حساب سے انتظامات بہت ناکافی محسوس ہوتے ہیں؛ چنانچہ بعض زیرک اور حساس طبیعت لوگوں کو دردمندی کے ساتھ یہ کہتے سنا گیا ہے ''آئندہ نسلوں کے عیسائیت قبول کر لینے کا خطرہ ہے'' اگرچہ اللہ حکیم وخبیر کی ذات سے یہ بعید نہیں کہ وہاں کے اصل باشندوں کو ہی اسلام کی دولت نصیب فرما دے، جس کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں، پھر تو انشاء اللہ یہ خطرہ کافور ہو جائے گا۔

ایک منفرد شخصیت سے ملاقات

مغربی تہذیب و تمدن کی یلغار کے سامنے سرافگندگی کے اس ماحول میں ایک ایسی شخصیت سے بھی ملاقات ہوئی جو وہاں کی سب سے اعلیٰ عصری تعلیم گاہ (شکاگو یونیورسٹی) کے ریسرچ اسکالر ہیں، مگر وہ کسی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ کے بجائے کسی قدیم طرز کے عربی و دینی مدرسہ کے طالب علم معلوم ہوتے ہیں، گھٹنے سے نیچے کرتے اس سے کچھ ہی نیچے شرعی پائجامہ میں ملبوس خانقاہی طرز (تھانوی ساخت) کی سر پر ٹوپی، اپنی تعلیمی استعداد اور انگریزی پر اچھی قدرت کی وجہ سے طلباء میں نمایاں حیثیت کے مالک، یہ ہیں افتخار صاحب، پاکستانی نیشنل (جن کے آباء بہار کے رہنے والے اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے دور کی قرابت رکھتے ہیں) ان سے بھی یہ معلوم ہوا کہ امریکیوں میں ہر قسم کی تہذیب و تمدن اور ہر مذہب وفکر کے لوگوں کو برداشت کر لینے کی عادت غیر معمولی ہے، بالعموم کسی پر کھل کر نہ طنز کرتے ہیں، نہ کسی کے لباس پر اعتراض، چنانچہ افتخار صاحب یونیور سٹی میں اپنے اسی حلیہ کے ساتھ جاتے رہتے ہیں، موصوف کا موضوع مستشرقین کی اسلام کے بارے میں ''تحقیقات'' ہے (جنھیں ہفوات کہنا شاید زیادہ موزوں ہے) ان سے ایک

نئی بات کام کی یہ معلوم ہوئی کہ مستشرقین کی اسلام پر تنقید کا سبب جہالت (عربی سے کم واقفیت) زیادہ ہے، بدنیتی کم ہے، حالاں کہ ہم لوگ اس کا عکس سمجھتے ہیں۔

مستشرقین کی ''تحقیقات'' کا ایک نمونہ

افتخار صاحب نے مستشرقین کا احادیث نبویہ کی ''تحقیقات'' کے بارے میں ایک ''بنیادی اُصول'' ان کی تصنیفات اور اقوال سے یہ اخذ کیا ہے کہ جس حدیث سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے بارے میں مستشرقین کے زعم میں شبہ پیدا ہوتا...... یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر حرف آتا ہو تو وہ ان کے نزدیک یقیناً ''صحیح حدیث'' ہے، چاہے اس حدیث کی سند کتنی ہی کمزور ہو اور اسے کسی بھی قابل ذکر محدث نے صحیح قرار نہ دیا ہو، اس کی مثال میں افتخار صاحب نے مسجد نبوی (علی صاحبہ التحیۃ) کی توسیع سے متعلق یہ حدیث پیش کی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''**لو أمرت بالمسجد فطین فقال عریش کعریش موسیٰ والأمر أعجل من ذلک**'' اس کی تخریج کتب صحاح میں سے کسی میں بھی نہیں کی گئی ہے؛ البتہ ''درمنثور'' جیسی کتابوں میں —— کہ جو ہر قسم کی ضعیف بلکہ منکر روایات تک سے مملو ہیں —— ہی ملتی ہے، موصوف نے اس پر ایک مشہور مستشرق جو ''حدیث'' پر اتھاریٹی (حجت) سمجھا جاتا ہے کا یہ فتنہ انگیز تبصرہ سنایا کہ یہ حدیث یقیناً صحیح ہے؛ لیکن محدثین نے اسے محض اس بنیاد پر ضعیف قرار دیا ہے کہ اس سے محمد کی صداقت کا پول کھلتا ہے، اس اجمال کی تفصیل جاننا بھی مستشرقین کے خبث باطن کی پردہ کشائی کے لئے مفید ہوگا، وہ یہ کہ مستشرقین کا یہ منصوبہ اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب کہ حدیث بالا میں مذکور لفظ ''الأمـــر'' کے معنی ''قیامت'' لئے جائیں اور اگر ''موت'' لئے جائیں جو کہ ظاہر بھی ہیں تو پھر وہ خیالِ خام پورا نہیں ہوسکتا، اس بنا پر مستشرق مذکور کا اصرار ہے کہ یہاں وہی معنی قیامت صحیح ہیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ''حرف'' آتا ہے، اگر چہ وہ ظاہر حال اور سیاق وسباق سے نہ نکلتے ہوں؛ کیوں کہ حدیث کا —— اگر ثابت ہو تو —— صاف اور ظاہر مطلب یہی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب مسجد نبوی کو

مضبوط بنانے کی خواہش یا فرمائش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ نے موت کے قرب کی اور انسانی زندگی کی بے ثباتی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے فرمایا کہ موت سر پر کھڑی ہے، اس لئے معمولی قسم کی چھپر والی مسجد بنالو جیسی کہ جھونپڑی ہوتی ہے، مگر اس مستشرق کا یہ کہنا ہے کہ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں قیامت کے آجانے کی پیشین گوئی کی جو غلط ثابت ہوئی۔ (العیاذ باللہ)

شکاگو میں افتخار صاحب کے علاوہ وہ بعض اور لوگ بھی مشرقی لباس و انداز میں نظر آئے مثلاً ڈاکٹر عرفان اللہ صاحب (سہارنپوری) جو اپنی نورانی شکل بھرپور شرعی داڑھی اور شیروانی میں ملبوس، ہنس مکھ چہرہ اور سادگی وانکساری میں ممتاز نظر آئے۔

شکاگو یونیورسٹی کی لائبریری

افتخار صاحب ہی کے ساتھ شکاگو یونیورسٹی جانا ہوا، وہاں کی عظیم الشان لائبریری کا وہ حصہ دیکھا جو اسلامیات سے متعلق ہے، حدیث، شروح حدیث، فقہ، تفسیر (عربی، فارسی، اُردو کی) بکثرت کتابیں نظر آئیں، بعض ایسی کتابیں بھی جو ہمارے یہاں بڑے عربی مدارس کے کتب خانوں میں بھی بمشکل ہوں گی، افتخار صاحب ہی سے معلوم ہوا کہ لائبریری کا یہ معمول ہے کہ اگر کوئی طالب علم بھی (یا لائبریری ممبر) لائبریری کے متعلقہ عہدہ دار کو یہ بتادے کہ فلاں کتاب یہاں نہیں ہے اور اسے آنا چاہئے تو لائبریری وہ کتاب منگالیتی ہے، چاہے جتنی قیمت کی ہو، موصوف نے یہ بھی بتایا کہ میری نشاندہی پر بہت سی کتابیں آئیں؛ البتہ جو حصہ راقم نے دیکھا اس میں کتابوں کی ترتیب مناسب نہیں معلوم ہوئی، اس کی وجہ شاید وہاں کے ذمہ داروں کی عربی سے ناواقفیت ہو۔

ایک نیا تجربہ

یہ اتفاق سے جمعہ کا دن تھا افتخار صاحب نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ یونیورسٹی میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے (کیوں کہ وہاں ہر مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے، اس لئے ہر

ایک مذہب کی عبادت کے لئے یونیورسٹی میں جگہ دی گئی ہے) چنانچہ جب جمعہ کا وقت آیا تو میں ان کے ہمراہ نماز پڑھنے کے لئے ایک عمارت کے اندر داخل ہوا تو انھوں نے بتایا کہ یہ چرچ (گرجا) ہے، اسی کے ایک حصے میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے (وہاں قبلہ کا رخ چرچ کی عبادتی سمت کے برعکس تھا اور اس عمارت میں کوئی تصویر بھی نمایاں نظر نہیں آرئی نہ صلیب کا نشان، وقت آنے پر کچھ لوگ اکٹھا ہوئے اور فرش بچھایا گیا، اذان ہوئی، کچھ دیر بعد باقاعدہ خطبہ ہوا، پھر جماعت ہوئی، افتخار صاحب ہی امامت کرتے ہیں؛ لیکن انھوں نے از راہ مہمان نوازی امامت میرے سپرد کردی، جماعت میں تقریباً تیس افراد شریک ہوئے، جو ملکوں اور زبانوں کے اعتبار سے کم سے کم چھ قسموں کے ہوں گے، دو خواتین بھی شریک جماعت ہوئیں۔

شکاگو کی قابل ذکر چیزیں

شکاگو نیویارک کے بعد سب سے بڑا شہر ہے (اس کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہو کہ وہاں ہر منٹ میں ہوائی جہاز اُترنے کا اوسط ہے ان تجارت وصنعت، بلند عمارات بعض دیگر خصوصیات کے لحاظ سے غالباً سب سے بڑھ کر ہے یہیں دنیا کی سب سے بلند ترین ۱۱۰ منزلہ عمارت یرس ناور (Sears Tower) جس کی بلندی ۷۰۷ فٹ ہے، اس کے اندر سینکڑوں تجارتی مراکز اور رہائشی فلیٹ ہیں۔

ایک سودس منزلہ عمارت ایک مسلمان انجینئر کا کارنامہ

یہ ایک مسلمان انجینئر فضل الرحمٰن (سابق مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلا دیش کے باشندے) کا عظیم کارنامہ ہے، تفریح کے لئے اس پر چڑھنے کی باقاعدہ فیس ہے (جو بالغوں کے لئے تین ڈالر ہے) ایک تیز رفتار لفٹ کے ذریعہ ایک منٹ کچھ سکنڈ ہی کے اندر ایک سو تین منزل تک جایا جاسکتا ہے، اس سے اوپر جانے کی عام اجازت نہیں ہے (کیوں کہ اس پر ٹیلی ویژن کا نظام سیٹ ہے) مولانا عاقل صاحب، ان کے خویش رحیم الدین انصاری

صاحب اور راقم الحروف ایک حیدرآبادی انجینئر محترم عبدالغنی صاحب کی راہنمائی میں اس پر چڑھے وہاں سے پورا شہر کفِ دست کی طرح نظر آرہا تھا، سڑک کی موٹریں بچوں کے کھلونے والی موٹریں نظر آرہی تھیں، ایسا ہی منظر لگا جیسا کہ کہ اب سے پچیس تیس سال پہلے دہلی کی قطب مینار کی سب سے اوپر کی منزل پر چڑھ کر نظر آیا تھا، اس وقت آخری منزل تک جانے کی عام اجازت تھی، اب تو صرف پہلی منزل تک جایا جاسکتا ہے) اس کے علاوہ اور بھی اس علاقہ میں بے شمار بلند عمارتیں ہیں جن میں ۹۹، ۹۰، ۸۰ منزلہ بکثرت ہیں، یہ حصہ دنیا کی سب سے بڑی میشگن جھیل (Michigan Lake) کے کنارے پر ہے اور شہر کا سب سے بارونق اور ترقی یافتہ خطہ ہے، اسے وہاں ''ڈاؤن ٹاؤن'' (Down Town) کہا جاتا ہے، جھیل کے کنارے پر ہے اور شہر کا سب سے بارونق اور ترقی یافتہ خطہ ہے، اسے وہاں ''ڈاؤن ٹاؤن''(Down Town) کہا جاتا ہے، جھیل کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے اور بھی خوبصورت بن گیا ہے، جھیل کے کنارے تفریح کے لئے لوگ کثرت سے آتے ہیں، جہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی...... کشتیاں اور موٹر لانچ تفریح کرنے کے لئے موجود رہتی ہیں، اسی خطہ (ڈاؤن ٹاؤن) میں ایک ۶۵ منزلہ عمارت کی ۶۲ ویں منزل پر ایک روز رات کا کھانا (عشائیہ) پٹنہ کے ڈاکٹر حامد عبدالحی صاحب کے یہاں کھایا، ڈاکٹر صاحب ہارڈ اسپیشلسٹ (ماہر امراض قلب) ہیں اور بہت مشہور کامیاب ڈاکٹر ہیں، اس سے زیادہ وہ شریف النفس انسان دوست اور علمی ذوق کے حامل انسان ہیں، موصوف سے پہلی مرتبہ شکاگوں ایر پورٹ (Air Port) پر اترتے ہی ملاقات ہوئی؛ کیوں کہ موصوف کی والدہ صاحبہ بھی اسی جہاز سے پٹنہ سے دہلی ہوکر شکاگو پہنچی تھیں، اتفاق سے مجھے لینے جو صاحب آئے تھے وہ وہاں نہ مل سکے تو ڈاکٹر صاحب نے ہی مجھے قیام گاہ پہنچایا، بعد میں بھی راقم سے خصوصی تعلق کا معاملہ فرمایا، اس کا ایک ثبوت گھر پر مدعو کرکے دیا، ان سے معلوم ہوا کہ وہ میرے مضامین اور بعض کتابیں پڑھ چکے ہیں، چنانچہ میری ایک کتاب'' معاشرتی مسائل''، انھوں دکھائی (جو ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی) شہر کے بقیہ حصے

میں عمارتیں، دیگر تمام شہروں کی طرح عموماً دوتین منزلہ فلیٹوں پر مشتمل ہیں، ''ڈاؤن ٹاؤن'' کی ان عمارتوں میں زیادہ تر تجارتی مراکز ہیں وہاں خرید وفروخت کے لئے اس طرح کی کھلی دوکانیں نہیں ہوتی ،جیسی کہ مشرقی ملکوں، بلکہ لندن تک میں ہوتی ہیں، (کہ دوکان کا تمام سامان سڑک سے گزرنے والا دیکھ سکتا ہے) وہاں تقریباً بازار باہر سے بالکل بند، ایک وسیع عمارت کے اندر ہوتا ہے، جہاں ہر قسم کی اشیاء کے لئے الگ الگ حصے مقرر ہوتے ہیں تاکہ جوشخص جس قسم کی چیز کا خواہاں ہے وہ بس اسی حصے میں جائے پورے بازار کا چکر کاٹنا نہ پڑے، ہر چیز پر قیمت لکھی ہوتی ہے، ہر چیز نہایت صاف ستھرے انداز میں پیکٹوں کے اندر دی جاتی ہے، کھانے پینے کی چیزیں؛ بلکہ کچھ ترکاریاں تک بھی پیکٹ میں ملتی ہیں، البتہ شکاگو میں ایک بازار (جس کا نام دیوان "Devon" ہے) ہندوستانی طرز کا نظر آیا وہاں بہت سی دوکانیں ہندوپاک کے باشندوں کی ہیں اور مشرقی ذوق کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔

Shed Aqua Rium شکاگو میں میشیگن جھیل کے بالکل قریب اور دلچسپ چیز مچھلی گھر (Aqua Rium) ہے، جس میں بلا مبالغہ سینکڑوں قسم کی زندہ مچھلیاں بہت شاندار اور وسیع عمارت کے اندر بہت ہی سلیقہ سے اور قدرتی جیسا ماحول بنا کر بلورین خانوں میں رکھی گئی ہیں، برآمدہ میں لٹکی ایک مچھلی (جو مردہ ہے) اتنی عظیم اور عجیب وغریب ہے کہ اسے دیکھ کر ہیبت طاری ہوجانا مستبعد نہیں اس کی لمبائی کوئی بارہ تیرہ فٹ ہوگی (اور قطر تقریباً تین فٹ) اس کے کئی جبڑے ہیں، جو نہایت تیز نکیلے چھوٹے چھوٹے دانتوں پر مشتمل ہیں، اس کا منھ اتنا کشادہ ہے کہ اس کے اندر فربہ انسان بھی بآسانی جاسکتا ہے، سر کے دنوں کناروں پر بالکل سیدھے (سینگ کی جگہ) بانس کی طرح کے دوراڈ اچھی خاصی ضخامت کے (تقریباً دوانچ کے اور کم وبیش چھ سات فٹ لمبے) نکلے ہوئے ہیں، جس سے یہ مچھلی — کہا جاتا ہے کہ — کشتی یا بحری جہاز سے انسانوں کو کھینچ کر اپنا شکار بناتی ہے، اس کے برخلاف مچھلیوں کی بعض اقسام اتنی حسین اور خوبصورت ہیں جنھیں دیکھ کر بے

ساختہ ''فتبارک اللہ أحسن الخالقین'' زبان پر آتا اور ایمان تازہ ہوجاتا ہے، ان کے حسن کی قلم کے ذریعہ تصویر کشی ممکن نہیں، ہم لوگ مولانا عاقل صاحب اور انصاری صاحب وہاں ایک حیدرآبادی انجینئر سعید احمد صاحب کے ساتھ گئے تھے، مولانا عاقل صاحب کے ساتھ چندروز بہت پر لطف گزرے اور کئی ضیافتوں میں بھی شرکت کا موقع ملا۔

صنعت وسائنس میوزیم

یوں تو پورا امریکہ خاص طور پر وہاں کا ہر بڑا شہر سائنسی ترقیوں اور حیرتناک ایجادوں سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے، جن سے قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے، مثلاً ہر دوکان اور ہر ادارہ میں تمام کام کمپیوٹر کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، حتیٰ کہ لائبریری میں کتابیں بھی کمپیوٹر سے اندراج ہوکر (جو پنسل سے مشابہ ایک برقی آلہ سے انجام پاتا ہے) نکالی جاتی ہیں، اس سے بھی معمولی کاموں میں وہی ذریعہ بنتا ہے؛ لیکن ترقی صرف اسی حد تک محدود نہیں......وہ اہم کام جو سرراہ نظر نہیں آسکتے غالباً ان سے متعارف کرانے — یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی ایک جھلک دکھانے — کے لئے طرح طرح کے (درجنوں قسم کے) میوزیم کھولے گئے ہیں، ایسا ہی ایک میوزم بنام "Museum of Science And Industry" ہے جو صنعتی وسائنسی معلومات فراہم کرتا ہے، اس کے اندر ہوائی جہاز، موٹر، ریل جیسی بہت سی صنعتوں کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ عملی شکل میں بتائی گئی ہے، اس کے علاوہ فلکیات (ستاروں، چاند، سورج کی رفتار وغیرہ) کی بھی تفصیلات دکھائی گئی ہیں، سب سے زیادہ معلومات افزا نیز دلچسپ وہ حصہ ہے جس کے اندر انسانی نشو ونما — بالکل ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخر تک — کا عمل پلاسٹک کی بنی تصویروں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے ایک جگہ صرف قلب (دل) کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کی گئی ہیں، یعنی اس کے مختلف حصوں اور ان کے اعمال کو بھی مجسم کرکے دکھایا گیا ہے، قلب کے اندرونی اجزاء تک کی رونمائی کرانے کا اس طرح سامان کیا گیا ہے کہ ایک چھوٹا سا کمرہ (لٹونما) بالکل دل کی شکل

کا بنایا گیا ہے، اس کے اندر جانے اور آن کے راستے رکھ کر اندرون قلب جھانکنا آسان کر دیا گیا ہے، ایک جگہ آپریشن تھیٹر کا نمونہ دکھایا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے کتنی احتیاطیں ہوتیں اور کس قدر اہتمام کے ساتھ انتظامات کئے جاتے ہیں، اس میوزیم کے تعارف کے لئے ایک خوبصورت مصور کتابچہ بھی قیمتاً ملتا ہے، جو ہمارے میزبان سید احمد محی الدین (جن کے ساتھ میوزیم دیکھا) نے خرید کر میرے حوالہ کیا، موصوف ہی نے وہاں ہر قسم کی رہنمائی کی، واپسی میں میشیگن جھیل کے ساحل پر چہل قدمی اور سیر کی۔

سن سنائی (Cincinnati) کا سفر

شکا گو سے تقریباً چار سو میل کے فاصلہ پر اوسط درجہ کا ایک شہر "Cincinnati" ہے، وہاں ہمارے لکھنؤ کے محترم وہاج الحق صاحب (جو حکومت ہند کے کئی اعلیٰ عہدوں پر —— جن میں فارن سکریٹری کا عہدہ بھی ہے —— فائز رہنے کے بعد اب ریٹائر ہو چکے ہیں) آج کل مقیم ہیں، ان کی بڑی صاحبزادی وہاں کامیاب لیڈی ڈاکٹر ہیں اور داماد بھی (جو شاہ غیاث عالم صاحب مرحوم سابق وقف کنٹرولر کے صاحبزادے ہیں) ایک اچھی سروس میں ہیں ایک دوسری لڑکی بھی وہیں سروس کرتی ہیں، موصوف نے از راہ تعلق مجھے "سن سنائی" آنے کی دعوت دی اور اس کے لئے یہ تقریب پیدا کی کہ وہاں کے مقامی اسلامک سنٹر سے رابطہ قائم کر کے میری تقریر کا ایک پروگرام رکھوایا اور مجھے ہوائی جہاز کا —— آمد و رفت کا —— ٹکٹ بھیج دیا، ان سے دیرینہ رواط کی بنا پر میرے لئے معذرت کرنا مشکل تھا؛ چنانچہ وہاں کا سفر ہوا، جو ان کی محبت اور خلوص کی وجہ سے بڑا پر لطف اور راحت رساں بن گیا وہ نیز ان کے تمام گھر والے بے حد خلوص کے ساتھ میری راحت کے لئے کوشاں رہے۔ **فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔**

یہ شہر بھی چھوٹا "شکا گو" معلوم ہوتا ہے، بازاروں، سڑکوں، پلون، مکانات کا وہی طرز ہے، جس سے اندازہ ہوا کہ امریکہ میں ہر شہر کا یہی طرز ہے، امریکہ کے ہر بڑے شہر

کے مرکزی تجارتی حصہ کو "ڈاؤن ٹاؤن" (Dowin Town) کہتے ہیں، اسی نام سے ایک حصہ "سن سنائی" میں بھی ہے، ویسی ہی اونچی اونچی بلڈنگیں ہیں جیسی شکا گو میں؛ لیکن شکا گو سے اونچائی میں تو کم مگر خوبصورتی میں زیادہ وہاں کی...... مارکیٹیں بھی (جو عموماً ایک لمبی چوڑی، چھت والی، عمارت کے اندر ہوتی ہیں) اسی طرز کی بلکہ شاید کچھ اور زیادہ خوبصورت بنی ہیں کہ بعض میں فوارہ خوبصورت چھوٹا سا دالان اور بیٹھنے کی جگہیں بھی بنی ہیں، یہ زمانہ وہاں خزاں کا تھا؛ لیکن "فصل بہار" معلوم ہو رہی تھی؛ کیوں کہ وہاں کے مختلف درختوں پر خزاں کے زمانے میں پتوں کا رنگ متنوع قسم کا ہو جاتا ہے کہ جس سے ایک خاص طرح کا حسن پیدا ہو جاتا ہے، کسی کا سرخ، کسی کا زرد، کسی کا سفید، پھر علاقے کے اندر نشیب و فراز سے ایسا منظر سامنے آتا ہے کہ بس دیکھا کرے!

کچھ اور قابل ذکر باتیں

پورا امریکہ تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے بالکل یکساں نظر آتا ہے؛ حالاں کہ بعض دیگر (مثلاً رنگ و نسل کے) اعتبارات سے خاصے اختلافات ہیں، کھانے پینے میں میٹھی چیزوں کا استعمال بہت ہے، نمکین چیزیں کھانے کے علاوہ ڈھونڈھنے سے بھی بھی بمشکل ملتی ہیں، حالاں کہ سنا ہے کہ وہاں آجکل میٹھے کی مضرتوں کے بیان اور اس سے احتیاط کے لئے مہم چلی ہوئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہاں کے لوگوں میں موٹاپا اور فربہی، جو وہاں عام ہے، اسی سبب سے ہے اس کی وجہ سے مختلف امراض کا شکار ہوتے ہیں، وہاں کی سڑکوں، پلوں فلائی اُوور، نیز سڑکوں پر لگی علامات اور ٹریفک قوانین کا طرز خلیجی ملکوں (عرب ممالک) کی طرح کا ہے، چنانچہ وہاں چلتے پھرتے ایسا لگا جیسا کہ...... خوشحال عرب ملکوں کی سڑکوں پر چل رہے ہوں، وہاں کے روزنامے، اخبارات بہت ضخیم ہوتے ہیں، ایک سو پچیس، ایک سو پچاس صفحات کے (لیکن سائز یہاں سے نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے) اس کے باوجود قیمت بہت کم ہوتی ہے۔

شکر میں مٹھاس کی کمی

وہاں ایک تجربہ یہ ہوا کہ شکر کی جتنی مقدار، مثلاً ایک پیالی چائے میں، یہاں (ہندوستان میں) ڈالی جاتی ہے اس سے کم از کم دوگنی بلکہ تین گنی مقدار سے وہاں اتنی مٹھاس پیدا ہوتی ہے، یعنی وہاں کی شکر میں مٹھاس کم ہے، سننے میں آیا کہ میٹھے کے استعمال کی مضرتیں کم کرنے کے لئے ایسا قصداً کیا گیا ہے، اصل امریکن کھانے پینے میں ہر چیز کی مقدار زیادہ استعمال کرتے ہیں، چنانچہ وہاں چاے کی پیالیاں تک بہت بڑے سائز کی (ہمارے یہاں سے ڈبل سے بھی زیادہ ہوتی ہیں)۔

قابلِ عبرت!

عورتوں کی ''آزادی'' کے جو قصے یہاں سننے میں آتے ہیں وہ واقعات ہیں، اس نام نہاد آزادی نے وہاں کم عمر لڑکیوں تک کو ایسے ایسے اسباب معیشت اختیار کرنے پر مجبور یا آمادہ کر دیا ہے جس میں انھیں مشغول دیکھ کر ہر سلیم الطبع انسان یہی محسوس کرے گا کہ یہ صنف نازک پر ظلم ہے، نہ کہ ''آزادی''، مثلاً ایک بڑا ڈنر جس میں کم وبیش ایک ہزار افراد شریک تھے، جب ختم ہوا تو ''سرو'' (Serve) کرنے والیاں (چینی کے بنے) چھوٹے برتنوں کا ڈھیر اُٹھا کر چلنے لگیں تو زبان حال سے ان میں کی ہر فرد گویا فریاد کر رہی تھی کہ میں نے ایسی آزادی قبول کر کے اور مردوں کی مساوات کے نعرہ کا شکار ہو کر خود اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے؛ کیوں کہ صنفی نزاکت اس بوجھ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور ہر دیکھنے والے کی زبان پر بے ساختہ یہ مصرع آرہا ہوگا:

دیکھو مجھے دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

وہاں کے قابل تعریف پہلو اور ہماری افسوسناک روش

لیکن وہاں اس طرح کی ہمارے نقطۂ نظر سے خرابیوں کے ساتھ بہت سی خوبیاں بھی ہیں، جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہیں، مثلاً وقت کی پابندی (سنا گیا ہے کہ وہاں ہر کام پر حاضری کے لئے سکنڈوں کو بھی نوٹ کیا جاتا ہے، یعنی سکنڈوں کی تاخیر بھی قابل مؤاخذہ بنتی ہے)

اُصول کی پابندی، صفائی ستھرائی کا اہتمام، تجارتی معاملات میں گندم نمائی و جو فروشی'' سے پرہیز، احساس ذمہ داری، ظاہری رواداری، اپنے کام سے کام، محنت لگن اور جذبہ کے ساتھ مفوضہ کاموں کو پورا کرنا وغیرہ؛ لیکن ہم مشرقی ملکوں کے لوگوں نے ان کی یہ خوبیاں لینے کی کوشش نہیں کی؛ البتہ ان کی خرابیاں اور اخلاقی کمزوریاں اپنانے؛ بلکہ اس میں ان سے آگے بڑھنے، میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، اس پر جتنا افسوس — بلکہ ماتم — کیا جائے کم ہے نتیجہ میں ان کی خوبیوں کے مادی منافع سے محروم اور برائیوں کے نتائج بد کا شکار ہیں۔

ہر چیز سے آمدنی کی فکر ایر پورٹ پر ٹرالی بھی مفت نہیں!

مادیت کے غلبہ نے اصل امریکیوں میں — اب تو شاید ہر جگہ — ایثار اور بغیر کسی لالچ کے کوئی کام کرنے کا تصور ہی گویا ختم کر دیا ہے (الا ماشاء اللہ) سنا گیا ہے کہ وہاں اولاد والدین کے (اور اسی طرح والدین اپنے جوان اولاد کے) بھی کسی کام — بغیر مادی منفعت کے — نہیں آتی، ہر چیز سے دولت یا نفع کمانے کا ذہن عام ہے۔

غالباً اس جذبہ کا یہ بھی اثر ہے کہ وہاں — ہوائی اڈوں پر — سامان اٹھانے والی گاڑیاں (ٹرالیاں) بھی مفت نہیں ملتیں بلکہ وہ ایک لوہے کی راڈ سے چپکی رہتی ہیں، اس کے قریب لگی ایک مشین کے اندر ایک ڈالر ڈال دیا جائے تو فوراً ایک ٹرالی، آزاد ہو جاتی ہے، جسے استعمال کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ہر سڑک پر موٹریں بھی بغیر اجازت کے کھڑی نہیں کی جا سکتیں بلکہ بہت سی جگہ اس کی بھی فیس لی جاتی ہے، جو فٹ پاتھ پر لگی مشین (میٹر) وصول کرتی ہے، وہاں بہت سے کام مشین ہی کرتی ہیں، وہاں پر "Senior Citizene" بعض بوڑھوں کو خاص مراعات حاصل ہیں۔

اپنا کام خود کرنا

وہاں مارکٹوں، ہوٹلوں اور ایسے ہی اکثر عمومی کاموں میں ہر کام خود کرنے کا طریقہ رائج ہے، مارکیٹ سے اپنی پسند کی چیزیں خود خریدی جاتی ہیں، اگر وہ چیز وزن کر کے

فروخت ہونے والی ہے تو اس چیز کے پاس وزن کا کانٹا لگا ہوتا ہے، خریدار خود ہی وزن کرتا پھر مارکٹ کے سرے پر—— دروازے کے قریب—— آکر سب حساب کمپیوٹر کے ذریعہ ہوتا اور قیمت ادا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پٹرول پمپ سے موٹروں میں پٹرول لوگ خود ہی بھرتے اور بعد میں قیمت ادا کرتے ہیں، وہاں بعض پٹرول پمپ پر کچھ دوسری اشیاء بھی مل جاتی ہیں (مثلاً سگریٹ بسکٹ وغیرہ) ایسا عموماً اس جگہ ہوتا ہے جہاں قریب میں مارکٹ نہ ہو۔

دیہات وقصبات Suburbs

وہاں کے ہر دیہات (Suburb) میں شہر کی تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں، مثلاً ٹیلی فون، ڈاکخانہ، بینک، ہسپتال، بڑی بڑی مارکٹ، عمدہ سڑکیں اور پارک وغیرہ؛ لیکن شہر کی بہت سی خرابیوں، مثلاً شورش، بھیڑ بھاڑ، موٹر کے دھویں سے پاک ہوتے ہیں، اس لئے خوشحال لوگ دیہات یا قصبات میں رہنا پسند کرتے ہیں، بعض لوگوں کو تو شہر کی سکونت سے وحشت؛ بلکہ اس میں دہشت ہوتی ہے اور یہ کہتے سنے گئے کہ شہروں میں کالی نسل کے لوگ گھروں کو لوٹ لیتے اور دوسرے قسم کے نقصانات کرڈالتے ہیں۔

کالی نسل کے لوگوں سے وحشت

وہاں عموماً کالی نسل کے لوگوں سے عوام دہشت زدہ معلوم ہوئے، حتیٰ کہ لوکل ٹرینیں اکثر خالی نظر آتی ہیں، اس کی بھی وجہ لوگوں نے یہی بتائی کہ کسی بھی ڈبہ میں کالا آدمی چڑھ کر کوئی بھی حرکت کر بیٹھتا ہے، حکومت بھی اس سے عاجز معلوم ہوتی ہے، مگر یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان قصوں میں کتنی صداقت ہے اور کتنا پروپیگنڈہ!

شکاگو کا موسم

جیسا کہ وہاں کا موسم معلوم ہوا جلد جلد تبدیل ہوتا رہتا ہے، ویسے ہماری موجودگی میں موسم زیادہ تر خوشگوار رہا (جیسا موسم دہلی، لکھنؤ میں آخر نومبر یا دسمبر کے شروع کا ہوتا ہے

) لیکن چند روز کے لئے سخت سردی کی لہر آگئی جس میں برف بھی پڑی اور درجہ حرارت 24,F.H تک گرگیا (یعنی C.G صفر سے بھی نیچے) وہاں کے اعتبار سے یہ ہلکی سردی تھی؛ کیوں کہ سخت سردی میں ٹمپریچر F.H صفر سے بھی دس ڈگری کم ہوجاتا ہے، برف گرنے کی ایک شکل ہلکی بوندوں جیسی ہوتی ہے جسے وہاں ''اسنو'' (Snow) کہتے ہیں، دوسری کہرے، جیسی شکل میں وہ شدید ہوتی ہے، ہماری موجودگی میں ایک رات وہ بھی گری، صبح کو فٹ پاتھ پر روئی کے گالے جیسے نظر آئے، اس لئے وہاں ہر عمارت میں ''ہیٹنگ'' (گرم کرنے کا) نظم قانوناً بھی ضروری ہے اور طبعاً بھی، وہاں فون کا نظم بہت ہے، وہاں کے مخصوص سائز سے لے کر ہندوستانی سائز تک کے ''رسیور'' رائج ہیں، بیک وقت کئی جگہ سے کالیں وصول کرنے والے اور پیغام محفوظ رکھنے والے فون عام ہیں۔

سفر کا ایک تجربہ

شکاگو ایرپورٹ پہنچنے کے بعد جب کسی جگہ پہنچے جہاں سامان جہاز سے اتار کر لایا جاتا ہے تو میرا سوٹ کیس وہاں نہیں تھا، اس جگہ موجود ملازم کی نشاندہی پر خانہ پری کرائی، جس میں ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب نے مدد کی ہندوستان کے بعض تجربات کی بنا پر، ملنے کی اُمید کم ہی تھی؛ لیکن شہر پہنچ کر لوگوں سے ذکر نا انھوں نے اطمینان دلایا کہ یہاں سامان ضائع نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ایر کمپنی والے گھر پہنچادیتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اگلے روز وہ سوٹ کیس ہماری قیامگاہ (ہوٹل) پہنچادیا گیا جہاں سے بآسانی مل گیا، اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔

کچھ سفر کے بارے میں

میرا یہ سفر بڑے تردد اور اخیر تک غیر یقینی حالات کا شکار رہنے کے بعد ہوسکا، اس کے بہت سے اسباب بنے جن کا تذکرہ غیر ضروری ہے، محترم مولانا احمد علی قاسمی صاحب اور نیاز احمد صاحب (سکریٹری وزارت جنگلات) کی سعی سے سفر کے بعض مراحل بآسانی طے ہوئے، پھر واپسی میں بھی خاصی اُلجھن پیش آئی اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ٹکٹ کا روٹ دہلی

سے براہ لندن آمد ورفت دونوں کا تھا، میری خواہش جدہ ہوکر واپس آنے کی تھی تاکہ حرمین شریفین کی زیارت سے بھی مشرف ہوا جائے، ٹکٹ کا روٹ بدلوانا ’’جوئے شیر‘‘ لانے کے برابر مشکل بن گیا، مگر خداوند تعالیٰ اجرعظیم عطا فرمائے، ہمارے مہربان مسٹر سید احمد محی الدین صاحب کو کہ انھوں نے ایک ہفتہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ٹکٹ براہ جدہ کرواہی دیا (اگرچہ اس پر خاصی رقم خرچ ہوئی) حرمین شریفین کی حاضری اور وہاں ایک ہفتہ کا قیام نصیب ہوگیا، (فالحمد للہ ذلک) اس طرح جو سفر ۱۵/اکتوبر ۸۹ء کی صبح لکھنؤ سے شروع ہوا تھا وہ ۴/نومبر ۸۹ء کی صبح لکھنؤ پہنچ کر ختم ہوا۔

☆ ☆ ☆

موجودہ دور میں کارِ نبوت انجام دینے والے

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وإن کانوا من قبل لفی ضلال مبین وآخرین منهم لما یلحقوا بهم وهو العزیز الحکیم۔

بزرگو اور دوستو! جس رشتے نے ہمیں اور آپ کو یہاں اکٹھا کیا وہ دین کا رشتہ ہے، یہ رشتہ اتنا مضبوط اور قوی ہے کہ اس نے ہزاروں میل کی مسافتوں کو قرب میں بدل دیا، اس رشتہ کی بنیاد پر دور کے رہنے والے قریب ہوگئے، یہ رشتہ جتنا مضبوط ہوگا ہم اتنے ہی قریب ہوتے جائیں گے، اس سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین جس نے ہم کو قریب کیا کتنا مضبوط اور طاقتور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ساری اچھی صفات جمع فرمائی اور اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کمالات عطا فرمائے اور کوئی خوبی اور کمال ایسا نہیں جو آپ میں نہ رکھا ہو؛ لیکن ان میں اہم کمالات ان آیات میں ملتا ہے جو ابتداءً پڑھیں، ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات میں یہ تین کمالات یا یہ کہہ لیجئے تین بنیادی ذمہ داریاں اور تین فرائض بیان فرمائے ہیں پہلی بات جو فرمائی ’’یتلوا علیهم آیاته‘‘ یعنی وہ لوگوں کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو جامع کتاب عطا کی ہے،

اس میں ہر شعبۂ زندگی کے متعلق ہدایات ہیں، ہمارے لئے رہنمائیاں ہیں، زندگی کے ہر گوشے سے متعلق روشنی ہے، اس کتاب کی تلاوت کرنا اور اس کتاب کو پڑھ کر سنانا آپ کی پہلی ذمہ داری بتائی گئی ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ سب سے پہلے ہم اس کے محتاج ہیں کہ قرآن مجید کو صحیح پڑھیں اس کی صحیح طریقہ سے تلاوت کریں، یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جن لوگوں کے سامنے براہ راست بھیجا تھا اور جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست مخاطب کیا وہ سب عربی جانتے تھے کوئی ایسا نہ تھا جو عربی سے واقف نہ ہو، عربی ان کی مادری زبان تھی وہ لوگ قرآن مجید کو براہِ راست سمجھتے تھے اور قرآن مجید سمجھنے کے لئے انھیں صرف ونحو پڑھنے کی ضرورت نہ تھی، ان کا لہجہ بھی وہی تھا؛ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ذمہ داریاں عطا فرمائیں ان میں پہلی ذمہ داری ''یتلوا علیهم آیاته'' کی تھی یہ بات قرآن مجید میں کئی جگہ فرمائی گئی اور متعدد احادیث میں بھی ملتی ہے، ایک جگہ امر کے انداز میں ''اُتْلُ'' (اے اللہ کے رسول اس کتاب کی تلاوت کر کے دکھایئے) فرمایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عربی داں ہو، عربی النسل ہو اور جس کی مادری زبان عربی ہو وہ بھی محتاج ہے کہ اس عظیم کتاب کو دوسروں سے پڑھ کر سنے اور پڑھ کر سننے کے بعد ہی وہ اس کی صحیح تلاوت کر سکتا ہے اس کے بغیر قرآن مجید صحیح نہیں پڑھ سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کر کے بتائی عرب اس کتاب کو اچھی طرح سمجھتے تھے؛ کیوں کہ ان کی مادری زبان عربی تھی اور ان کا سارا ماحول عربی تھا، ان پر تلاوت کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

اس وقت ایک واقعہ یاد آیا حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محسن کے صاحبزادے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں پر جو کچھ آپ پر بیتی وہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے اور مسلمانوں کا بڑا طبقہ اس سے واقف ہے عربوں میں اس زمانے کے دستور کے اعتبار سے یہ قانون تھا کہ جو شخص کسی دوسرے کی امان میں رہتے ہوئے اگر مکہ سے نکل کر چلا جاتا تو پہلے جس شخص کی

امان میں تھا وہ امان ختم ہوجاتی پھر دوبارہ اسے امان لینے کی ضرورت پڑتی تب وہ مکہ میں داخل ہوسکتا تھا، جس طرح آج کے ملکی قوانین میں ہے کہ کسی شخص کو کسی ملک کا ویزا ملا ہو تو وہ ایک مرتبہ ملک میں داخل ہوسکتا ہے، اگر داخل ہونے کے بعد اس ملک سے نکل جائے اور دوبارہ داخل ہونا چاہے تو دوبارہ ویزے کی ضرورت ہوتی ہے، تقریباً ایسا ہی کچھ رواج وہاں تھا، بہر حال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس کے امان میں تھے جب آپ مکہ سے باہر تشریف لے گئے تو وہ امان ختم ہوگئی، آپ نے طائف سے مکہ تشریف لانا چاہا تو نئے سرے سے امان کی ضرورت پیش آتی تو جبیر رضی اللہ عنہ کے والد مطعم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع پر امان دی اور گویا آپ کو ممنون احسان کیا ہر شریف آدمی کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ وہ محسن کا احسان مانتا اور اس کی عزت کرتا ہے، جو شخص جتنا زیادہ شریف ہوگا، اتنا ہی ممنونیت کا جذبہ اس میں زیادہ ہوگا، ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ شریف کون ہوسکتا ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو دوسال کے بعد جنگ بدر پیش آئی مجھے تفصیل نہیں سنانا ہے، صرف اتنا بتانا ہے کہ کفار کے ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی پکڑے گئے جو ستر قید کر کے لائے گئے تھے ان کے چھڑانے کے لئے مکہ مکرمہ کے معززین کا ایک وفد مدینہ طیبہ گیا تھا جو لوگ پکڑے گئے تھے وہ صنادید قریش تھے یعنی سب ہی ممتاز لوگ گویا سربراہ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی حیثیت رکھنے والے لوگ تھے، ان ستر آدمیوں کا پکڑا جانا ایسا تھا جس سے گویا پورے مکہ کی ناک کٹ گئی، مرنے والوں کا انھیں زیادہ غم نہیں تھا، جنگ میں مرنا ان کے نزدیک کوئی عیب کی بات نہیں تھی، قید ہونے والوں کا انھیں غم تھا اس کے لئے ایک وفد مدینہ طیبہ گیا تھا اس وفد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محسن مطعم کے بیٹے جبیر تھے، حضرت جبیر کو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور اخلاق کریمانہ کو جانتے تھے مطعم مر چکے تھے، جبیر رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے تھے، مکہ والوں کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سفارش قبول فرمالیں گے، جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں مسجد نبوی کے قریب پہنچا تو مغرب کی نماز ہو رہی تھی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ طور پڑھ رہے تھے اس کی ابتدائی آیات ہیں :

والطور وکتاب مسطور فی رق منشور والبیت
المعمور والسقف المرفوع والبحر المسجور إن
عذاب ربک لواقع ماله من دافع ۔

حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب عذاب آنے ہی والا ہے، بس اب آسمان پھٹ کر گرنے والا ہے، زمین گویا شق ہونے والی ہے وہ کہتے ہیں میرے اوپر ایسا اثر ہوا کہ میں بے چین ہو گیا اور ایسا لگتا تھا کہ دل پھٹ جائے گا، (یہ واقعہ حافظ ابن عبدالبر نے ''الاستیعاب'' میں نقل کیا ہے) جو لوگ کفر میں ڈوبے ہوئے تھے اسلام سے بدکتے اور بھاگتے تھے قرآن نے خود کہا ہے کہ جس طرح شیر کی آواز سے گدھا ڈر کر بھاگتا ہے، ''**كانهم حمر مستنفرة فرت من قسورة**'' اس طرح وہ بدکتے تھے؛ لیکن قرآن مجید سن کر ان کا یہ حال ہوتا تھا اور طبیعتوں پر ایسا اثر پڑتا تھا کہ بے چین ہو جاتے اور اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکتے تھے، تلاوت کی آواز ان کے قلب پر براہ راست اثر انداز ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ جو مخالفین تھے وہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید نہ سننے پائیں، قرآن مجید کی تاثیر کو وہ جادو کہتے تھے؛ کیوں کہ انھوں نے صرف جادو کے الفاظ میں ہی تاثیر دیکھی تھی، قرآن مجید میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ کفار کہا کرتے تھے ''**لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون**'' قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر کوئی سنانے لگے تو) اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو شاید (اس تدبیر سے) تم ہی غالب رہو، وہ چاہتے تھے کہ قرآن مجید پڑھنے والے کی آواز دب جائے ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ قرآن مجید پڑھ کر ان کو سنائیں تو سوچئے کہ ہم لوگوں کو اس کی کتنی ضرورت ہے، جب کہ ہم قرآن مجید کی زبان سے بھی بالعموم واقف نہیں (اس لئے قرآن مجید کی وہ تاثیر بھی ہمارے قلوب میں نہیں ہوتی اور اس کے وہ اثرات ہم پر نہیں پڑتے) عربی زبان کا وہ

ماحول بھی ہم کو نہیں ملا) یاد رکھئے کہ صحیح تلاوت کے سننے سے ہی قرآن مجید صحیح پڑھنا آتا ہے، اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی ذمہ داری یہی تھی کہ آپ قرآن مجید پڑھ کر سنائیں، یہ چھوٹے مدارس و مکاتب جن کو ہم حقیر، معمولی اور ادنیٰ درجے کا سمجھتے ہیں جن میں صرف قرآن مجید کی تعلیم ہوتی ہے، جن میں صرف قاعدہ بغدادی اور ''یسرنا القرآن'' پڑھایا جاتا ہے، قرآن مجید صحیح پڑھنا سکھایا جاتا ہے، وہ کتنا بڑا فریضہ انجام دے رہے ہیں، کہ اللہ کے رسول کی پہلی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں، غور کرنے کا مقام ہے یہ مدارس جن کو سب سے گھٹیا اور حقیر سمجھا جاتا ہے اس لئے تنخواہیں بھی یہاں کم ہوتی ہیں، میں ان مدرسین کو مخاطب کر کے کہتا ہوں جو قرآن مجید پڑھانے میں مصروف ہیں چاہے ان کو دنیاوی زندگی میں حقیر سمجھا جا رہا ہو اور ان کو دنیا والے کم تر سمجھتے ہوں؛ لیکن انھیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہم وہ کام انجام دے رہے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین اور پہلی ذمہ داری تھی، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بایں طور دیا ''**اتل ما اوحی الیک من الكتاب واقم الصلوٰة**'' نماز قائم کرنے کا ذکر تلاوت کے ذکر کے بعد کیا گیا، سب سے پہلے جو بات کہی گئی وہ صحیح تلاوت کرنے کی؛ کیوں کہ نماز اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک قرآن مجید صحیح نہ پڑھا جائے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں اس شخص کو امامت کا زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا جو قرآن مجید زیادہ پڑھنا جانتا ہو، فقہی کتابوں میں یہ بحث آتی ہے کہ امامت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے آیا وہ کہ جو زیادہ مسائل جاننے والا ہو یا وہ جو زیادہ قرآن مجید پڑھنے والا؛ چوں کہ صحابہ کے دور میں تقریباً سب ممتاز صحابہ ضروری مسائل کے عالم تھے، اس لئے ''**اولی الناس بالامامة أقرؤهم**'' (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ: ۵۸۲، ۵۸۴-۵۸۵) آیا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو سب سے زیادہ قرآن مجید جانتا ہو وہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق ہے، اس موقع پر شکایت کے انداز میں نہیں حکایت کے انداز میں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ امامت کا منصب جس کو آج ہم نے سب سے کمتر درجے کا سمجھ رکھا ہے اور امام حضرات بھی کچھ احساس کمتری میں مبتلا

ہوگئے ہیں؛ حالاں کہ یہ منصب سب سے زیادہ افضل، سب سے زیادہ اعلیٰ ہے۔

امام بنانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص سب سے زیادہ بہتر ہے سب سے زیادہ افضل ہے، جب کسی جماعت یا کسی قوم یا محلے کے لوگوں نے کسی کو امام تسلیم کرلیا تو گویا زبان حال سے یہ بات تسلیم کرلی کہ یہ شخص ہم میں سب سے زیادہ بہتر ہے، ہم میں سب سے بالاتر ہے، امام حضرات کو بھی یہ بات سمجھنا چاہئے کہ جب انھیں امام بنالیا تو گویا انھیں افضل تسلیم کرلیا، امامت کا استحقاق قرأت قرآن کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے، (صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۴۳۰۲، ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ: ۵۸۵) ایک واقعہ حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک صحابی بہت بچے تھے دیہات میں ان کا مکان ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے اللہ کے رسول کی خدمت میں جانے والے قافلے گزرتے تھے وہ بچے تھے مگر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قافلے گزرتے اور حاضر ہوکر واپس آتے تو وہ ان سے قرآن مجید سیکھ لیا کرتے تھے، اس وجہ سے ان کو سب سے زیادہ قرآن مجید یاد ہوگیا تھا، مگر ان کی عمر اس وقت ۵ یا ۷ سال تھی؛ لیکن قرآن مجید یاد کرنے میں اپنے قبیلے اور دیہات میں سب سے بڑھ گئے تھے، جب اس گاؤں کے لوگوں کو اللہ نے ایمان کی توفیق دی اور وہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو امام کی تلاش ہوئی تو دیکھا کہ سب سے زیادہ ان ہی کو قرآن مجید یاد ہے ان ہی کو امام بنادیا گیا اور احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ ان کا لباس بھی پوری طرح ساتر نہیں تھا، ایک عورت نے اس پر ٹوکا بھی تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ آیا ایسے بچے کی امامت درست ہوسکتی یا نہیں؟ (یہ واقعہ حدیث کی کتاب سنن ابوداؤد میں بھی ہے) اس وقت تو شرعی احکام تدریجاً نازل ہورہے تھے اور رفتہ رفتہ بتائے جارہے تھے، کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید کا زیادہ حصہ سینوں میں محفوظ ہونا ایسی بڑی دولت تھی کہ اس کی بنیاد پر سب سے افضل مقام دیا جاتا تھا، ہمارے زمانہ میں امامت کا مقام چاہے گھٹیا سمجھا گیا ہو؛ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، صحابہ کے دور میں یہ مقام سب سے افضل شخص کو دیا جاتا تھا، چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب خلیفہ بنایا گیا تو اس تقرر کی سب سے بڑی دلیل یہی تھی کہ اللہ کے

رسول نے اپنی حیات طیبہ میں نماز کی امامت کے لئے آپ کو آگے بڑھایا تھا امامت کا اہل قرار دیا تھا، یہ استحقاق خلافت کی سب سے بڑی اور قوی دلیل سمجھی گئی، امام ہونے کے معنی یہی ہوتے تھے کہ ان لوگوں میں وہ سب سے افضل ہیں۔

اگر کسی نے اپنی اولاد کو یا اپنے زیر سرپرست بچہ کو یا عزیز واقارب کو قرآن مجید کی دولت سے مالا مال کرنے کی کوشش کی تو حدیث میں آتا ہے کہ ایسے لوگ بھی اونچا مقام پائیں گے، ان کے سر پر تاج پہنایا جائے گا، جس طرح تخت نشینی کے وقت بادشاہ کی تاج پوشی کی جاتی ہے، اسی طرح کی تاج پوشی ہوگی اس کی چمک اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کے سامنے چاند، سورج کی روشنی ماند پڑ جائے گی، اگر خدانخواستہ غفلت کی وجہ سے ہماری عمر اتنی ہوگئی کہ اب ہم خود قرآن مجید نہیں پڑھ سکتے، حفظ نہیں کرسکتے یا جتنا کرنا چاہئے تھا اتنا نہیں کرسکتے تو اپنے بچوں کو اپنے متعلقین کو قرآن مجید سیکھنے میں لگائیں اس سے نہ صرف وہ بچہ (طالب علم) اللہ کے یہاں بلند مقام پائے گا؛ بلکہ وہ لوگ بھی بلند مقام پائیں گے جنھوں نے اس سلسلہ میں مدد کی ہوگی یا جنھوں نے اس سلسلہ میں کوشش کی ہوگی، میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ عقلمند انسان وہ سمجھا جاتا ہے جس کی نظر مستقبل پر ہو، جو آئندہ کو سامنے رکھ کر قدم اٹھائے عقلمند اور بے عقل میں، سمجھدار اور ناسمجھ میں اسی سے فرق کیا جاتا ہے، سمجھدار کہتے ہی ہیں اس کو جس کی نظر دور بین ہو وہ صرف حال کو نہ دیکھے بلکہ مستقبل کو زیادہ دیکھے، صرف حال پر نظر رکھنے والے کو کوئی سمجھدار نہیں کہتا، کوئی شخص یہ کہے کہ دوسو روپے لے لو؛ لیکن بعد میں میں تمہیں گولی ماردوں گا یا چھرا ماردوں گا تو دنیا میں معمولی عقل والا بھی یہ برداشت نہیں کرے گا کہ دوسو روپے لے کر بعد میں چھرا کھالے یا گولی کھالے، حال پر نظر رکھنے والا یہ سوچ کر کہ اس وقت دوسو روپے مل رہے ہیں نفع کی چیز ہے اس لئے لیا جائے بعد میں دیکھا جائے گا تو کوی بھی اس کو عقلمندی نہیں کہے گا، عقلمند وہ سمجھا جائے گا جو دوسو روپے کو نظر انداز کردے اور دوسو روپے کا نقصان گوارا کرلے اور اپنے آپ کو مستقبل کی ہلاکت سے بچالے، جس کی نظر دوررس ہو وہی عقلمند سمجھا جاتا ہے، ایک ایماندار کے سامنے

مستقبل کا مفہوم کیا ہے؟ دنیا دار کے سامنے تو مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے دس سال بعد بیس سال بعد پچاس سال بعد، بہت سے بہت اگلی نسل کی فکر کرنا اور سوچنا، مثلاً دنیا میں عقلمند وہ خیال کیا جاتا ہے جو اپنی اولاد کے لئے مکانات چھوڑ جائے، جائداد چھوڑ جائے ان کے لئے ایسی کوئی چیز چھوڑ جائے جس سے وہ فارغ البالی کی زندگی بسر کرسکیں اور اس سے زیادہ عقلمند وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنی قوم ونسل کے لئے کوئی کام کرکے چھوڑ جائے تو گویا مستقبل کو سامنے رکھ کر اقدامات کرنا عقلمندی کی علامت ہے، اسلام نے ہر طبعی چیز کی رعایت کی ہے، اس جذبے کی بھی رعایت کی ہے۔

حدیث میں ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ آتا ہے جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں وہ بیمار پڑے اور ایسے بیمار پڑے کہ انھیں اپنی زندگی سے مایوسی ہوگئی اور اتفاق یہ تھا کہ وہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے اور مہاجرین میں سے تھے ، کسی مہاجر صحابی کا مکہ میں انتقال کرجانا اس وقت بڑی ہی خوفناک اور دینی اعتبار سے خطرناک بات سمجھی جاتی تھی اس کے معنی یہ لئے جاتے تھے کہ ہجرت کا جو اجر تھا وہ ختم ہوگیا، اس کی ہجرت فسخ ہوگئی، انھیں صدمہ تھا کہ کہیں میرا انتقال مکہ میں نہ ہوجائے اسی بیماری میں کبھی کبھی ان پر بے ہوشی طاری ہوجاتی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزاج پرسی کے لئے آئے اور ان کی بے ہوشی ختم ہوگئی اس حالت میں ہم اور آپ ہوتے تو ہمیں فکر پڑتی اپنے بچوں کی اپنی بیوی کی اور اپنے مال وجائداد کی؛ لیکن یہ چوں کہ صحابی رسول تھے ان کے سامنے ایمان والا مستقبل یعنی اصل مستقبل تھا، چنانچہ جب صحابی مذکور کو ہوش آیا تو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ! میرے پاس مال بہت ہے اور اولاد نہیں ہے ......(اس وقت تک ان کے نرینہ اولاد نہیں تھی صرف ایک صاحبزادی تھیں) میں چاہتا ہوں کہ اپنا سارا مال صدقہ کردوں، انھوں نے آخرت کو سامنے رکھا، صدقہ کرنے سے اجر ملے گا وہ ایسے بینک میں جمع ہوجائے گا جس بینک میں ضائع ہونے کا امکان ہی نہیں، جس بینک کے کنگال ہونے ڈر ہی نہیں، جو کبھی دیوالیہ نہیں ہوتا (**وما عندکم ینفد وما عند اللہ باق**)

اگر آخرت پر ایسا یقین ہو جس طرح ہونا چاہئے تو آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرکے اس سے زیادہ خوش ہوگا جتنا بینک بیلنس بڑھا کر خوش ہوتا ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہی چاہا کہ میں اپنا مال اس بینک میں (جس کی صفت گویا خود قرآن نے یہ بیان فرمائی ہے: ''**ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق**'') جمع کردوں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، ایسا ہرگز نہ کرو، حضرت سعد نے کہا کہ پھر آپ مال کا تین حصہ کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے کی اجازت دے دیں، آپ نے منع فرمایا، انھوں نے کہا کہ آدھا مال صدقہ کردوں آدھا چھوڑ جاؤں، انھوں کہا تیسرا حصہ مال اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے کی اجازت دے دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں یہ کرسکتے ہو، ایک تہائی مال اللہ کی راہ میں خرچ کرجاؤ اور (اس کو بھی کم مت سمجھنا) یہ بھی بہت ہے اور اس کے بعد جو بات آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی اس وقت وہ مجھے سنانا ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اسلام نے انسانی جذبات کی رعایت کی ہے اس حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

> آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ بس فقیروں کو ...... اور محتاجوں کو دیا جائے بلکہ جو مال تم عزیز واقارب کے لئے چھوڑوگے تاکہ صحیح طریقے سے تقسیم ہو اور اس کے نتیجے میں وہ فقر وفاقہ سے محفوظ رہیں اور ہاتھ پھیلانے اور بھیک مانگنے سے محفوظ رہیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ تم سارا مال صدقہ کرجاؤ اور تمہارے عزیز واقارب بھیک مانگتے پھریں۔

دیکھئے اسلام نے انسانی فطرت کی کیسی رعایت کی ہے اسی لئے دین اسلام کو دین فطرت کہا جاتا ہے، بہت سے اسباب ہیں دین فطرت کے ہونے کے ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آخرت کو سامنے رکھنا اور آحرت کو سامنے رکھ کر ہی اقدامات کرنے کو ترجیح دی ہے، اسی روایت کے اندر یہ بھی ہے کہ تم اپنے بچوں پر خرچ

کروگے تو یہ بھی صدقہ ہے، حتیٰ کہ تم اپنی بیوی کے منھ میں لقمہ دوگے تو وہ بھی صدقہ ہے، (مسلم، کتاب الوصیۃ: ۴۲۰۹، ۴۲۱۵، ۴۲۱۶، بخاری، کتاب الوصایا: ۲۷۴۲) یہ روایت حدیث کی تمام اہم کتابوں صحیحین میں بھی مذکور ہے۔

چنانچہ ایک ایماندار کے سوچنے کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے جس کام کو غیر مسلم طبیعت کا تقاضہ یا رواج سمجھ کر یا ضرورت سمجھ کر کرتا ہے، ایک صاحبِ ایمان ان کاموں کو دین کا تقاضہ سمجھ کر کرتا ہے جس سے اسے ہر کام میں اجر ملتا ہے اس کی زندگی خیر ہی خیر بن جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

عجباً لامر المومن إن أمره كله خير إن اصابته سراء شكر فكان خيرا له وان أصابته ضراء صبر فكان خيراً له .

اگر اس پر کوئی مصیبت آتی یا افتاد پڑتی تو صبر کرتا ہے اور اجر حاصل کرتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اس کو نعمت عطا فرماتا ہے (جس سے اس کا دل خوش ہوتا ہے) تو وہ شکر کرتا ہے، شکر کر کے اجر حاصل کرتا ہے۔

تو مومن کی زندگی کا ہر پہلو خیر ہے چاہے ظاہری طور پر شر ہو یا خیر ہو، اسلام نے انسانی جذبات کی رعایت کی ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر کام شرعی تقاضے کو ملحوظ رکھ کر کرے اگر شرعی تقاضے کو نظر انداز کر کے کرے گا تو یہ چیز اس کے لئے گناہ کا سبب بن جائے گی، سب کماتے ہیں؛ لیکن مومن کے کمانے کا انداز یہ ہوگا کہ اللہ نے مجھ پر میری اہلیہ اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داری رکھی ہے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے میں کما رہا ہوں گویا اللہ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور ایک فریضہ ادا کر رہا ہوں جب وہ اس جذبے سے کمائے گا تو کوئی ناجائز طریقہ کمائی کا نہیں اختیار کرے گا، اللہ کا حکم سمجھ کر کمائے گا تو اس کا کمانا......اس کی کھیتی باڑی کرنا اجر بن جائے گا، اس کا درخت لگانا اجر بن جائے گا۔(۱)

حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص درخت لگاتا ہے تو جب تک وہ درخت موجود

(۱) بخاري ، كتاب الأدب:۶۰۱۲، ۲۳۲۰۶۔

رہے گا اور جب تک لوگ اور جانور اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے (اس کے پتے جانور کھاتے رہیں گے اس کے ساتھ میں جانور سکون سے حاصل کرتے رہیں گے) اس کے حق میں برابر اجر کا سبب بنتا رہے گا، انشاء اللہ ہمارے مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کا مرض بدنیتی نہیں بے نیتی ہے، بڑی گہری بات ہے، ہم بہت سے کام کرتے ہیں؛ لیکن وہ نیت اور وہ ذہن اس وقت حاضر نہیں رہتا، درخت کتنے لوگ لگاتے ہیں؛ لیکن ذہن میں کتنے لوگوں کے یہ بات حاضر رہتی ہے، اس لئے درخت لگانے اور باغ لگانے کے اجر سے محروم ہوجاتے ہیں، دنیا کے بہت سے کام ایسے ہیں جن سے اجر حاصل کیا جاسکتا ہے اگر اس وقت ہم اپنے ذہن کو ذرا سا حاضر کرلیں تو وہ کام ہمارے لئے اجر کا سبب بن جائیں یعنی نیت صحیح کرلیں جب نیت صحیح ہوگی تو لامحالہ آدمی حرام سے بچے گا۔

اسلام نے فطری جذبات کی جتنی رعایت کی ہے اور ادیان میں اتنی رعایت نہیں کی گئی، دوسرے مذاہب میں انسانی جذبات کو کچلنا اور ان کو بالکل مٹانا خدا کے قریب کرنے کا اور خدا کی خوشنودی کا ذریعہ بتایا گیا ہے، اسلام نے بتایا کہ سارے جذبات اور سارے تقاضے طبیعت کے پورے ہوں؛ لیکن خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ فرمالیا تھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا ذہن کس طرف چل رہا ہے، اللہ کے رسول نے اسے صحیح رُخ پر لگادیا، چنانچہ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی نصیحت کے مطابق عمل کیا اور اپنے مال کا تیسرا حصہ صدقہ کیا، اللہ کے رسول نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ کیا بعید ہے کہ اللہ تمہیں صحت دے اور اللہ تمہیں اولاد دے اور تمہارے ذریعہ کچھ لوگوں کو نفع پہنچے اور کچھ کو ضرر، چنانچہ یہ وہی صحابی ہیں جو فاتح فارس بنے ان کے ذریعہ اللہ نے ایران کے فتح کرانے کا فیصلہ فرمایا اور ان کے اولاد بھی ہوئی،

جو بات میں عرض کر رہا تھا وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے جو ذمہ داریاں اللہ کی طرف سے قبول کیں یا یوں کہہ لیجئے کہ اللہ نے آپ کو سونپیں، ان میں پہلی ذمہ داری تلاوت کرنا اور تلاوت سکھانا تھی، تلاوت سیکھنا ان لوگوں کے لئے بھی ضروری تھا جن کی مادری زبان عربی تھی، ہم لوگ جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے ہمارے لئے تلاوت کا سیکھنا کتنا ضروری ہوگا اس کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں، چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید اگر کسی استاذ سے باقاعدہ نہیں پڑھا ہے وہ چاہے کتنا بڑا عالم ہوجائے وہ قرآن مجید صحیح نہیں پڑھ سکتا، پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جن لوگوں نے قرآن مجید پڑھنا سیکھا انھوں نے دوسروں کو سکھایا اور بحمد اللہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

جن لوگوں نے قرآن سیکھا ہے، ہم اگر ان سے قرآن پڑھنا نہیں سیکھیں گے تو ہم قرآن مجید صحیح نہیں پڑھ سکیں گے، جو لوگ قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کے اندر مشغول ہیں تو آپ سوچئے کہ وہ کتنی بڑی ذمہ داری پوری کررہے ہیں، یعنی وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی ذمہ داری پوری کررہے ہیں اور جو لوگ یہ کام کررہے ہیں وہ کتنے بڑے محسن ہیں دنیا والے اگر ناقدری کریں اور ان کی قدر نہ پہچانیں تو وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں ؛ بلکہ سمجھیں کہ وہ بڑا کام کررہے ہیں، اگر کوئی قیمتی موتی یا قیمتی پتھر آپ کے پاس ہے چاہے کوئی اس کی قدر نہ پہچانے بہرحال وہ قیمتی چیز ہے، اس کی صحیح قیمت نہیں لگ رہی ہے تو گویا اس کو پہچاننے والے نہیں رہے، دوسری ذمہ داری جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی گئی ہے وہ ہے ”**یعلمهم الکتاب والحکمة**“ (یعنی کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا) قرآن مجید میں جہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریاں بیان کی ہیں وہیں ان میں دُعاء ابراہیمی کی قبولیت کا بھی گویا اعلان کیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعاء فرمائی تھی (اپنی اور اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو شامل فرماکر) :

ربنا وابعث فيهم رسولاً منهم يتلوا عليهم آياتك
ويعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم إنك أنت

العزیز الحکیم۔

اے ہمارے پروردگار! اور اس جماعت (میری اور اسماعیل کی ذریت) کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا نبی بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو آسمانی کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیا کرے اور ان کو پاک کرے، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب حکمت والے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاء من وعن قبول فرمائی، یہاں اس موقع پر ایک بات یاد آگئی بعض علماء نے یہ بات لکھی ہے اور قرآن وحدیث کے مطالعہ سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ وہ جب کوئی نعمت عطا کرنا چاہتے ہیں تو بعض اوقات اپنے خاص نبیوں کے دل میں اس کی طلب پہلے پیدا کردیتا ہے، پھر وہ طلب ان کی زبان پر آتی ہے اور وہ خدا سے اس کو مانگتے ہیں اس کے بعد وہ چیز انھیں عطا کی جاتی ہے، قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ طلب پیدا فرمائی کہ وہ بیت اللہ بنائیں اور وہ شہر جس میں بیت اللہ ہے امن والا بنے اور اللہ کی نعمتوں سے مالا مال ہو اللہ چاہتا ہی یہ تھا کہ یہ سب کچھ ہو، اس لئے اللہ نے ان سے پہلے دُعاء کروائی :

رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا الْبَلَدَ آمِناً وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ، رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ، رَّبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ۔ (ابراہیم:۳۵-۳۸)

دیکھئے! صاف معلوم ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے طلب پیدا فرمائی، پھر دُعاء کروائی

اوراس کے بعد دُعاء کی قبولیت کا اعلان فرمایا، اس سے زیادہ واضح مثال ایک یہ ہے کہ جب اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم دینے کا ارادہ فرمایا تو ہجرت کے حکم سے پہلے یہ دُعاء تلقین فرمائی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ دُعاء آئی اور حکم ہوا :

وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج
صدق واجعل لی من لدنک سلطاناً نصیرا ۔

اس دُعاء میں اشارہ تھا کہ دوبارہ یہاں آنا ہے اور یہاں سے جانا مستقل نہیں ہے، آؤ گے انشاء اللہ اور بہتری طریقے پر آؤ گے، چنانچہ ہجرت ہی تمہید بنی فتح مکہ کی، ہجرت نہ ہوتی تو فتح مکہ نہ ہوتا اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جب وہ کوئی اہم نعمت دینا چاہتا ہے تو پہلے طلب پیدا کر دیتا ہے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں پہلے طلب پیدا فرمائی ؛ کیوں کہ اللہ نے ایک ایسے نبی کے پیدا فرمانے کا ارادہ کر لیا تھا وہ عالم الغیب ہے اس کے سامنے حال ماضی اور مستقبل سب یکساں ہیں تو اللہ نے اپنے ایک اہم برگزیدہ نبی سے دُعاء کروائی کہ جو نبی پیدا ہو ان میں یہ صفات ہوں یعنی یہی تین صفات اور ذمہ داریاں کہ وہ تلاوت کریں، کتاب وحکمت سکھائیں اور تزکیہ کریں ؛ لیکن میں بیچ میں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاء میں تزکیہ کا ذکر بعد میں ہے اور تعلیم کا ذکر پہلے ، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں تزکیہ کا ذکر پہلے ہے تعلیم کا ذکر بعد میں، تزکیہ کے معنی دل کی منجھائی، صفائی اور پاکیزگی کے ہیں، اس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ تعلیم سے پہلے تزکیہ کی ضرورت ہے ، پہلے دل منجھ جائے ، پہلے دل صاف ہو تب تعلیم مفید ہوگی ، آپ جانتے ہیں کہ جو گمراہ فرقے گذرے ہیں، ان کے بانی اکثر وہ لوگ تھے جو قرآنی علوم سے واقف اور حدیث سے بھی واقف تھے وہ جاہل نہیں تھے تزکیہ کے بغیر علم ایسا ہی ہے جیسا کہ دوا کتنی ہی قیمتی ہو اگر آپ کسی خراب برتن میں رکھ دیں تو وہ دوا مضر ہو جائے گی، خراب برتن میں وہ دوا زہر بن جائے گی برتن نے مفید شئ کو زہر بنا دیا، اسی طرح کتنی ہی صحیح تعلیم ہو کتنا ہی

صحیح علم ہو کتنی ہی صحیح تشریح ہو ؛ لیکن اگر ظرف صحیح نہیں یعنی قلب صحیح نہیں تو اس میں جا کر وہی اثر ہوتا ہے جو خراب برتن میں رکھی جانے والی دوا کا ہوتا ہے کہ بجائے مفید کے مضر بن جاتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں یہ بات فرمائی کہ پہلے تزکیہ کریں، اللہ کے رسول کی صحبت میں بیٹھ کر تزکیہ ہو رہا تھا، تزکیہ کے لئے بھی اگر چہ عمل کی اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے ؛ لیکن آپ کی صحبت میں بیٹھنے والوں کا تزکیہ محض آپ ﷺ کی صحبت سے ہو رہا تھا۔

سب واقف جانتے ہیں، نیز تمام علماء حقانی کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے برابر کوئی (غیر صحابی) بڑے سے بڑا ولی بھی نہیں ہوسکتا، ولی کے گویا معنی یہی ہیں کہ جس کا دل صاف ہو چکا ہو جس کا جتنا دل صاف ہوگا وہ اتنا ہی بڑا اللہ کا دوست ہوگا، اللہ کے رسول کی صحبت کا ایک لمحہ اگر ایمان کے ساتھ ہو تو اتنا قوی التاثیر ہوتا ہے کہ سو سال مجاہدہ کرنے سے بھی اتنا تزکیہ نہیں ہوسکتا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کو ایمان کے ساتھ دیکھا بعد میں آپ کی صحبت اُٹھائی اس لئے تزکیہ کے لئے کسی اور عمل کی انھیں ضرورت نہیں تھی۔

اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ تلاوت کے معنی ہیں پڑھنا، سنانا یعنی صحیح تلفظ بتانا، صحیح لہجہ بتانا ؛ تا کہ ہم اس طرح پڑھیں جس طرح ہم کو بتایا گیا ہے، تعلیم کے معنی ہیں مفہوم بتانا، مراد متعین کرنا، صرف ترجمہ کرنا نہیں ہیں، ترجمہ تو صحابہ جانتے ہی تھے ان کی زبان عربی تھی، اس لئے ترجمہ کی ان کو ضرورت نہیں تھی (کوئی شخص ترجمہ دیکھ کر قرآن مجید کا اپنے آپ کو عالم کہے تو وہ عالم نہیں) ترجمہ الگ چیز ہے اور تعلیم الگ، قرآن مجید میں آیا ہے: ’’اقیموا الصلوٰۃ‘‘ اس کا لفظی ترجمہ ہے نماز کو سیدھا کرو، سوال پیدا ہوتا ہے نماز کیا کوئی ٹیڑھی چیز ہے جس کو سیدھا کریں، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ پانچ وقت کی نماز اپنے وقت پر ادا کریں جس میں یہ بھی داخل ہے کہ ہم یہ بھی جانیں کہ پانچوں وقت کی نماز کا وقت کب شروع ہوتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب نماز فرض ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور ایک روز ابتدائی وقت میں اور ایک روز انتہائی وقت میں ہر نماز پڑھ کر دکھائی ، (صحیح مسلم، کتاب المساجد: ۱۳۹۱ - ۱۳۹۳) یہ بھی معلوم ہو کہ نماز میں کس طرح کھڑا ہونا چاہئے اور کس طرح بیٹھنا ، یہ سب چیزیں اس حکم میں داخل ہیں ، یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ذمہ داری ہے (تزکیہ کے علاوہ) آپ حضرات غور کریں تو یقیناً اس نتیجہ تک پہنچیں گے کہ یہ لوگ یعنی اہل مدارس اس ذمہ داری کو بھی پورا کررہے ہیں ان ہی کے ساتھ وہ لوگ بھی کتنے خوش قسمت ہیں جو ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے والوں کو یکسوئی فراہم کررہے ہیں اور اس میں کسی بھی طرح کا حصہ لے رہے ہیں، (دامے، درمے، سخنے ان کی مدد کررہے ہیں)
-

مدارس کے یہ لوگ وہ کام کررہے ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل کام تھے، یعنی قرآن مجید میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جو کام بتائے گئے ہیں یہ حضرات وہ کام کررہے ہیں، قرآن مجید پڑھ کر سنانا اور سکھانا اور اس کی تعلیم دینا ان ہی کی ذمہ داری ہے ہمارا ماحول عربی نہیں نہ ہماری مادری زبان عربی ہے اس لئے ہمیں ضرورت ہے کہ ایسے طریقے بتائے جائیں جن سے ہم عربی زبان سیکھ سکیں، یہ بھی کتنا اہم کام ہے اس لئے قرآن مجید کی تعلیم سے پہلے بہت سے علوم سکھائے جاتے ہیں، مثلاً نحو، صرف لغت، بلاغت وغیرہ ان سب کی حیثیت ایسی ہے جیسے کھانے سے پہلے اس کے سب لوازمات کی ہوتی ہے، (جس طرح آدمی کھانے سے پہلے کھانا پکانے کے لئے چولھا بناتا ہے، لکڑیاں اکٹھا کرتا ہے، چولھا جلاتا ہے، دیگر سامان اکٹھا کرتا ہے یہ سب چیزیں ضروری سمجھی جاتی ہیں) اس آیت کے آخر میں ہے ’’وإن کانوا من قبل لفی ضلال مبین‘‘ یعنی یہ لوگ جن میں آپ کو بھیجا گیا بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے آپ کی تشریف آوری سے پہلے ان کی گمراہی دور کرنے کے لئے ہی اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اس کے بعد یہ آیت ہے ’’وآخرین منهم لما يلحقوا بهم‘‘ وہ لوگ جو براہِ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

مخاطب تھے ان کی تربیت آپ نے کی یعنی قرآن مجید پڑھنا سکھایا تزکیہ کیا، کتاب وحکمت کی تعلیم دی؛ لیکن ان لوگوں کے بعد جو لوگ ہوئے ان کو تلاوت سکھانے کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ کی ذمہ داری بعد کے لوگوں پر عائد ہوتی ہے، چنانچہ اسی کے تحت صحابہ نے بھی دوسروں کو تلاوت سکھائی، کتاب وحکمت کی تعلیم دی اور تزکیہ کیا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

جو لوگ بھی اس کام میں مشغول ہیں وہ سب کے سب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام انجام دے رہے ہیں، اس لئے عوام بجا طور پر علماء کو نائبین رسول کہتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ بات لکھی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دو قسم کی نبوتوں کا مجموعہ تھی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوت صرف ایک قسم کی تھی یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریاں دو طرح کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے بھی نبی ہیں جو براہِ راست آپ کے مخاطب تھے اور آپ ان لوگوں کے بھی نبی ہیں جو آپ کے بعد قیامت تک آنے والے ہیں، اللہ کے رسول کی بات، آپ کا پیغام، سلسلہ بسلسلہ علماء کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے صحابہ کے واسطے سے تابعین کو ان کے واسطے سے تبع تابعین کو، اسی طرح بعد کے دوروں میں ہوتا رہا، علماء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں؛ کیوں کہ ان کے ذریعہ آپ کی تعلیم ہم تک پہنچی، اسی طرح قیامت تک ایک ایسی جماعت باقی رہے گی جو اللہ کے نبی کا کام کرتی رہے گی، نبی کے فرائض نبی کی ذمہ داریاں ادا کرتی رہے گی، اسی طرح قیامت تک دنیا میں ایسے جتنے لوگ بھی آئیں گے جو سب اللہ کے رسول کی تعلیم سے فیض اُٹھانے والے ہوں گے جو کتاب کا علم سکھانے والے بنیں گے اور دیگر وہ کام انجام دیں گے جو اللہ کے رسول کے ذمہ تھے تو وہ اللہ کے رسول کے نائب اور سفیر ہوں گے، نائب وسفیر کا مقام وہی ہوتا ہے جو اپنے ملک میں وہاں کے سربراہ کا ہوتا ہے مثلاً ہندوستان میں یورپ، عرب، امریکہ اور روس وغیرہ ملکوں کے سفراء ہیں، یہاں ان کی یہ حیثیت ہے کہ اگر کوئی ان سفیروں کی توہین کردے یا کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو گویا اس ملک کے

بادشاہ یا اس کے سربراہ کے ساتھ بدسلوکی کی جس کے یہ نمائندہ ہیں، امریکہ کے سفیر کے ساتھ بدسلوکی کی تو گویا امریکہ کے سربراہ کے ساتھ بدسلوکی ہوئی؛ چنانچہ جو علماء تلاوتِ قرآن میں یعنی سیکھنے سکھانے میں مشغول ہیں گویا سفیر ہیں، اللہ کے رسول کے، ان کی توہین کرنا، ان کے حق میں کوئی نازیبا بات کہنا اور ان کو حقیر سمجھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کے برابر ہے، یہ بات اگرچہ بہت نازک ہے؛ لیکن سمجھنے کی ہے، ایک تیسری بات جو اس آیت میں فرمائی گئی تزکیہ کی، اس کی طرف اتنا اشارہ کرکے آگے بڑھنا چاہوں گا کہ تزکیہ اللہ کے رسول کی خدمت میں خود بخود ہوجاتا تھا، اسی طرح صحابہ وتابعین وغیرہ کے دور میں بھی، بعد میں چوں کہ وہ قوت اور تاثیر نہیں رہی اس لئے تزکیہ کے لئے بھی عمل کی ضرورت محسوس کی گئی اگرچہ ہمارے حضرات اکابر جن کے فیض سے ہم لوگ مستفیض ہورہے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہوئے کہ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے کا ایک حد تک تزکیہ بھی ہوجاتا تھا، مثلاً حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ اور بعض دیگر علماء کرام جنھیں اللہ تعالیٰ نے ...... مختلف کمالات عطا کئے تھے، ان کی خدمت میں رہنے والا بڑے درجے کا عالم بھی بن جاتا تھا اور ان حضرات کی تاثیر اور ان کی انابت الی اللہ اور ان کے اخلاص وتقویٰ کا ایسا اثر پڑتا تھا کہ اکثر شاگردوں کے نفس بھی مزکی ہوجاتے ان سے پڑھنے والوں میں سے بعض کا حال یہ ہوجاتا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کا اللہ والا بن جاتا، حضرت سید احمد شہیدؒ کی جب تحریک بظاہر ناکام ہوگئی اور ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے پھانسی پر چڑھا دیئے گئے ان کے مکانات کو مسمار اور ہموار کردیا گیا اور بعض ساتھیوں کو قید کردیا گیا وہ جیلوں میں ڈالے گئے تاریخ کا صحیح واقعہ ہے کہ ان کے ایک خلیفہ (مولانا یحییٰ علی) جیل میں ڈالے گئے، ان کو زیادہ تکلیف پہنچانے کے لئے ایسی کوٹھری میں رکھا گیا، جہاں ایک بہت ہی سنگین مجرم قید تھا اس سے سارے لوگ گھبراتے تھے وہ جیل میں بھی جرائم کرتا تھا، اس کے پاس کوئی قیدی رہنا گوارا نہیں کرتا تھا ایک رات وہ بزرگ اس شخص کے ساتھ جیل میں رہے، اس جرائم پیشہ قیدی کا حال یہ ہوگیا کہ وہ تہجد گزار بن گیا، وہ شخص شب بیدار بن

گیا جس سے لوگ پناہ مانگتے تھے جس سے جیلر تک پریشان تھے صرف ایک رات ان کے ساتھ رہنے کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف وہ جرائم سے تائب ہوا؛ بلکہ تہجد گزار، متقی اور پرہیزگار بن گیا، ان حضرات کی صحبت کا بڑا اثر ہوتا تھا اس کے اسباب بتانا بہت مشکل کام ہے کہ اب یہ صورت حال کیوں نہ رہی اس وقت تزکیہ کیوں نہیں ہوتا۔

بہرحال اب تزکیہ کے لئے بھی الگ سے عمل کی ضرورت ہے؛ چنانچہ ہمارے بزرگ تجویز کیا کرتے تھے کہ رسمی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کسی بزرگ کے یہاں جاکر رہیں اس کے لئے یکسوئی چاہئے، اس کے لئے بہت سی شرطیں ہیں جن کا نباہنا مشکل ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آسان شکل تزکیہ کی آجکل پیدا فرمادی ہے وہ یہ کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کو ایک خاص طریقہ عطا فرمایا اس سے ایک حد تک تزکیہ ہوجاتا ہے، بہرحال تزکیہ کا بھی خاص مقام ہے، اس کی بھی خاص ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ذمہ داریوں میں سے دو یعنی تلاوتِ کتاب اور تعلیم کتاب وحکمت، مدرسوں میں یہ دو کام تو ہورہے ہیں؛ لیکن تزکیہ کا کام مدارس میں ہونا کم ہوگیا ہے، میں یہ تو نہیں کہتا کہ بند ہوگیا ہے؛ لیکن بہت کم ہوگیا ہے، اس کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے، اس کے بغیر تعلیم نفع بخش ہونے کے بجائے بعض دفعہ نقصاندہ ہوجاتی ہے؛ چنانچہ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے مدارس کے ممتاز فضلاء ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوتا ہے معلوم ہوا کہ ان کا تزکیہ نہیں ہوا، بس اسی پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

آخر میں درخواست ہے کہ آپ میرے لئے بھی دُعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کہنے والے کو بھی فائدہ پہنچائے اور جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے سننے والوں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ آمین

☆ ☆ ☆

ردِ قادیانیت پر علماء حق کی تصنیفی خدمات

الحمد لله رب العالمین والصلوٰة والسلام علی رسوله
الامین خاتم النبیین محمد وآله واصحابه اجمعین
ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم وحکمت کے تقاضہ سے ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں کم وبیش چھ سو سال کے طویل فترہ (وقفہ) کے بعد، پھر وحی آسمانی اور ملائکہ رَبانی اپنے ایک مقرب ترین بندے اور رسول جناب محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب الہاشمی (علیہ الف الف صلاۃ وسلام) کے پاس بھیجے اور تقریباً ۲۳ سال تک یہ آمد وشد جاری رکھنے کے بعد اکمالِ دین واتمام نعمت کا اعلان فرما کر ہمیشہ کے لئے یہ سلسلہ بند کردیا؛ کیوں کہ اس میں نہ پھر تبدیلی کی ضرورت تھی نہ اضافہ کی گنجائش۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا احمد بن عبدالرحیم المعروف بشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے اپنے حکیمانہ اُسلوب میں فرمایا ہے کہ آخری شریعت کا مادہ فطرت انسانی کے عین مطابق بنایا گیا ہے، یا بالفاظِ دیگر قامت انسانی کے لئے ایسا جامہ عطا کردیا گیا ہے جو ہر طرح لائق ومناسب نیز پائیدار ہے تو پھر اس میں کتر بیونت یا پیوندکاری اور تبدیلی فضول کام ہی قرار

پائے گا، (جس سے اللہ تعالیٰ، جو حکیم وخبیر بھی ہے، کی ذات پاک ہے) البتہ یہ ضرورت بہرحال تھی کہ وہ ''جامہ'' ربودگی وفرسودگی سے محفوظ اور صحیح وسالم رہے؛ چنانچہ اس کی ذمہ داری بھی اسی علیم وقدیر نے خود لے کر اس کا اعلان بھی ہمیشہ باقی رہنے والی اپنی کتاب میں فرمایا ''وإنا له لحافظون''؛ لیکن عالم اسباب میں جس طرح اس کی صفت ربوبیت ورزاقیت کبھی شفقت مادری کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی زمین سے روئیدگی کی صورت میں، اسی طرح اس نے اپنے خاص بندوں کو توفیق بخش کر دین قیم کی حفاظت کا سامان کیا، جس کی اطلاع اسی کے صادق ومصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں دی؛ مثلاً ایک موقع پر فرمایا:

یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه
تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین ۔ (۱)

ایک اور ارشاد ہے کہ:

لا تزال طائفة من اُمتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم
من خذلهم حتی یاتی امر الله ۔ (۲)

چنانچہ یہ ''عدول'' اور ''طائفہ منصورہ'' ہر اس موقع پر کبھی سر بکف اور کبھی دست بقلم میدان میں آیا، جب بھی دین کامل کو تحریف یا اور کسی طرح کا خطرہ پیش آیا اس پر اُمت مسلمہ کی پوری تاریخ گواہ ہے، خواہ وہ خطرہ صدر اول میں مسیلمہ کذاب کی شکل میں آیا ہو یا چودہویں صدی کے مسیلمہ پنجاب کی صورت میں۔

اس وقت، وقت کی قلت کی بناء پر پوری تاریخ تو کیا اس کا مختصر ترین حصہ بھی بیان نہیں کیا جاسکتا؛ البتہ آخر الذکر فتنہ کے ظہور کے بعد سے اس مؤید ومنصور جماعت کے چند افراد کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کر کے سعادت دارین کا سامان اپنے لئے فراہم کرنا مقصود اصلی ہے، (یہاں یہ بتانا بھی غیر ضروری ہی معلوم ہورہا ہے کہ اس مختصر سے وقت میں چند افراد کے تمام کارناموں کا بھی مکمل جائزہ لینا مشکل بلکہ ناممکن ہے)۔

زیر نظر مقالہ میں اگرچہ اصالۃً محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی خدمات کو موضوع بحث نہیں بنایا گیا ہے؛ بلکہ ان کے تلامذہ کی قادیانیت کے بارے میں مساعی کا تذکرہ اصلاً مقصود ہے؛ لیکن تیمن اور تفاؤل کے طور پر مقالہ کی ابتداء علامہ کشمیری ہی کے بعض اہم علمی

(۱) مشکوۃ المصابیح:۱/۳۶، ط:اصح المطابع دهلی بحواله بیهقی۔

(۲) مسلم: ۲/۱۴۳، ط: مکتبہ رشیدیہ، دہلی۔

کارناموں سے کی گئی ہے کہ اسی ایک چراغ سے اوروں میں بھی روشنی آئی ہے، '' یک چراغ است......''۔

عام طور پر یہ بات واقف لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ دفعتاً نہیں کیا؛ بلکہ اس میں چالاکی سے ایک خاص ترتیب وتدریج ملحوظ رکھی؛ چنانچہ پہلے ولایت ومجددیت، نیز محدثیت ومہدویت کا دعویٰ کیا جو پھر شبہ مسیحیت کے مراحل سے گزرتا ہوا بالآخر کامل رسول و نبی بلکہ افضل الرسل کے برابر ہونے کے انجام تک پہنچا اس ابتدا وانتہا کے درمیان خاصا زمانی فاصلہ ہے، جس کی تفصیل الیاس برنی (پروفیسر سلاح الدین محمد الیاس) صاحب کی لاجواب کتاب، قادیانی مذہب میں مدلل ومفصل طور پر بیان کردی گئی ہے (قادیانیت کی پوری حقیقت جاننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید بلکہ ضروری ہے) مرزا جی نے جیسے ہی اپنے دعوؤں کا سلسلہ شروع کیا، مومنانہ فراست رکھنے والوں نے ان کی تردید کا فرض کفایہ بھی ادا کرنا شروع کردیا۔

مرزائی دعوؤں کے ابطال کے لئے اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ مرزا اوران کے اعوان وانصار کی طرف سے مغالطہ انگیز اور نام نہاد علمی انداز میں پیش کئے گئے اقوال سلف کی صحیح توجیہ ہو اور شبہات کا ازالہ کیا جائے کہ پھر کسی مخلص طالب حق کے لئے غلط فہمی میں مبتلا ہونا اور مرزا کے بچھائے اور پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنا ممکن نہ رہ جائے

اس اہم کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا اور اسے توفیق بخشی جس سے زیادہ اہل اور موزوں اس خدمت کے لئے کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا تھا، ''وللہ جنود السموات والارض ، اذا اراد شيئاً ان يقول له كن فيكون''یوں تو موصوف نے اپنے بے پایاں مطالعہ اور قابل رشک ذہانت کے ذریعہ بہت سے اشکالات رفع فرمائے اور مرزائی مغالطوں کا پردہ چاک کیا کہ ان سب کا ذکر کسی مقالہ کا نہیں کسی کتاب کا موضوع بن سکتا ہے؛ لیکن بعض اشکال ایسے بھی رفع کئے جو اکابر سلف کے اقوال سے پیدا ہونے کی بنا پر اچھے اچھے اہل علم کے لئے بھی موجب پریشانی اور باعث تشویش بنے ہوئے تھے اور جن کی موجودگی میں مرزا اور مرزائیوں پر کفر کا فتویٰ لگانا مشکل ہو رہا تھا، مثلاً امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا گیا ہے (ان ہی کی طرف منسوب کتاب فقہ اکبر کی شرح ملا علی قاری میں) یہ قول کہ امام فرماتے تھے''لا نكفر احدا من اهل القبلة ......'' یا اسی میں شرح مواقف کے حوالہ سے ذکر شدہ یہ تصریح''ان جمهور المتكلمين والفقهاء على أنه لا يكفر احد من اهل القبلة ...... ''۔(شرح فقہ اکبر، ملا علی قاری:۱۸۶)

اس طرح کی بکثرت عبارتیں عقائد وکلام کی دیگر کتابوں میں بھی بعض اکابر علماء کی طرف منسوب ملتی ہیں، مثلاً امام غزالی کی شہرہ آفاق کتاب''فیصل التفرقه بين الاسلام والزندقة''میں ہے :

امـا الـوصيـة فـان تـكف لسـانـک عـن اهل القبلة ما امـكـنـک مـا دامـوا قائلين لا اله الا الله محمد رسول الله عـلـيـه وسـلـم بـعـذر او بـغير عذر فان التكفير فيه خطر والسكوت لا خطر فيه ۔ (فيصل التفرقه:۵۶)

امام ابوحنیفہ کی طرف یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے قول میں ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال اسلام کا، تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔(مقدمه اكفار الملحدين، مقدمہ از مولانا محمد یوسف بنوری مصنف علامہ کشمیری)

یہ اور اس جیسی دیگر عبارتوں اور مسلمات کے درجہ میں پیش کئے جانے والے اقوال کی بنا پر عام اہل علم مدتوں غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کے بارے میں محتاط رویہ اپنائے رہے، جس سے یہ فرقہ ناجائز فائدہ اٹھا کر بھولے مسلمانوں کو دام فریب میں گرفتار کرنے بلکہ بہتوں سے مرزائی نبوت کا اعتراف کرا لینے میں کامیاب ہوتا رہا، اس لئے شدید ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسی کوئی شخصیت میدان میں آئے جس کی نہ علمی برتری میں کوئی شبہ ہو، نہ تقویٰ و دیانت داری میں، جو اس موضوع پر ایسے انداز میں بحث وگفتگو اور مواد فراہم کرے جس کے بعد پھر کسی جویائے حق کے لئے عذر باقی نہ رہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وحکمت سے صحیح وقت پر ایسے ہی ایک عظیم شخص کو اس کام کی توفیق بخشی یعنی امام عصر محدث جلیل، ماہر منقول ومعقول حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نے یہ خدمت بطریق احسن انجام دی کہ اپنے وسیع وعمیق مطالعہ اور بے نظیر حافظہ کی مدد سے اس موضوع پر اتنا مواد جمع کر دیا کہ جو مرزائی عمارت کی تمام دیواروں کو شکستہ ومنہدم کرنے کے لئے بالکل کافی ہے اور بعد میں اس راہ پر چلنے والوں کے لئے مزید تحقیق کی حاجت نہ چھوڑی۔

حضرت علامہ موصوف نے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں خالص علمی انداز پر لکھیں جن میں ’’اکفار الملحدین‘‘ کا تو گویا خاص موضوع ہی مذکورہ بالا قسم کے اقوال اور کلامی عبارتوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب مذکور بالا اقوال ’’لا نکفر احد من اهل القبلة‘‘ کے بارے میں متعدد ومعتبر کتابوں کے حوالوں کے ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

وسياقها عن ابى حنيفه ولا نكفر اهل القبلة بذنب ، فقيد بالذنب وهى فى رد المعتزله والخوارج لا غير اذ صورة العبارة تعريض لمن يكفر اهل القبلة بغير ما يوجب الكفر وهو الذنب واما كلمات الكفر فان لم يكفر بها فليقل انها ليست بكلمات كفر وهو سفسطه ۔

پھر اس کے بعد شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب الایمان سے اپنی تائید میں یہ عبارت پیش فرمائی :

نحن اذا قلنا اهل السنة متفقون على انه لا يكفر بالذنب فانما نريد به المعاصى كالزنا والشرب ۔

پھر فرمایا :

واوضحه القونوى فى شرح العقيدة الطحاويه انا لا نكفر هم بذنب كما يفعله الخوارج قال القونوى وفى قوله بذنب اشارة الى تكفيره بفساد اعتقاد كفساد اعتقاد المجسمة والمشبهة ونحوهم لان ذلك لا يسمى ذنباً ۔ (اكفار الملحدين:۲۳)

امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ایک قول (ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک اسلام کا تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا) کے ذریعہ پھیلائی جانے والی غلط فہمی کے ازالہ کی غرض سے ہی غالباً حسب ذیل افادات ’’تنبیہ‘‘ کے عنوان سے قلم بند فرماتے ہیں :

اتفقوا فى بعض الافعال على انها كفر مع انه يمكن فيها ان لا ينسلخ من التصديق لانها افعال الجوارح لا القلب ، ذالک كالهزل بلفظ كفر وان لم يعتقده ، وكالسجود لصنم ، وكقتل نبى والاستخفاف به ......

واختلفوا فى وجه الكفر بها بعد الاتفاق على التفكير ۔

پھر اس تحقیق کی تائید وتوجہ کے لئے متعدد ممتاز علماء وفقہاء مثلاً امام ابوالحسن اشعری علامہ ابن تیمیہ، علامہ قاسم (المسایرۃ کے حاشیہ نگار) اور علامہ شامی کی کتابوں اور اقوال سے حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں :

وبالجملة يكفر ببعض الافعال ايضا اتفاقا وان لم ينسلخ من التصديق اللغوى القلبى وقال القاضى

ابـوبـكـر الـبـاقـلانی كما فی الشفاء والمسايرة ، فان
عـصـی بـقول او فعل نص الله تعالٰی ورسوله أو اجمع
الـمسـلـمـون انـه لا يوجد الا من كافره او يقوم دليل
عـلـی ذلک ، فـقـد كـفـر وقال ابو البقاء فی كلياته :
والكفر قد يحصل بالقول تارة وبالفعل اخری والقول
الـمـوجـب للكفر انكار مجمع عليه فيه نص ولا فرق
بين ان يصدر عن اعتقاد او عناد اواستهزاء ۔ (۱)

(۱) اکفار الملحدین:۶۸-۶۹۔

اسی کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے ان اُمور کی تفصیل بہت شرح وبسط کے ساتھ فرمائی جن کا نام علماء شریعت کی اصطلاح میں ''ضروریات دین'' ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور کسی ایک کا بھی انکار کفر کا موجب ہوجاتا ہے، یہ بحث خاصی طویل ہے اختصاراً اسے یہاں پیش نہیں کیا جارہا ہے۔

قادیانی عمارت کو سہارا دینے کے لئے متکلمین کے اس اُصول سے بھی مرزائی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''کسی نص کی تاویل یا تاویل سے انکار کی بنا پر کوئی شخص کافر نہیں ہوجاتا علامہ موصوف نے اسی اُصول کی تشریح فرما کر بتایا کہ وہ کونسی تاویل ہے جس سے معذور ٹھہرایا جاسکتا ہے یا نہیں، فرماتے ہیں :

والشـارع لـم يـعـذر قـط ، فـی تاويل باطل ، فقال فی
عبد الله بـن حـذافة امير سريه من تحته بدخول النار ،
لو دخلوها ماخرجوا منها الی يوم القيامة ، انما الطاعة
فـی معروف ...... وغير ذٰلک من الوقائع ...... مما كان
التاويل فيها فی غير محله وعلی تعبير الفقهاء فی فصل
غيـر مـجتهد فيه (ای لم يكن التاويل فيه قطعی البطلان

كما يظهر من كلامه بعد سطرين) ۔ (۱)

اس کے بعد علامہ تفتازانی کی مشہور کتاب ''مقاصد الطالبین فی اصول الدین'' سے حسب ذیل عبارت شاہ صاحب نے بطور تائید نقل فرمائی :

الكافر ان اظهر الايمان خص باسم المنافق وان ابطن
عقائد هی كفر بالاتفاق فبالزنديق ۔

پھر اس کی مزید توضیح بایں طور کی :

قـال فـی شرحه قد ظهر ان الكافر وان كان من اعترافه
بـنبـوة النبی صلی الله عليه وسلم واظهار شعائر الاسلام

(۱) مسلم ، کتاب الإمارة:۴۷۶۵-۴۷۶۶۔

يبطـن عقائد هی كفر بالاتفاق خص باسم الزنديق ......
فالـمراد بابطال بعض عقائد الكفر ليس هو الكتمان
مـن الـناس بل المراد ان يعتقد بعض ما يخالف عقائد
الاسلام مـع ادعـائـه اياه ، وهو المراد بقولهم يبطن
الكـفر ای يخلط كما فی فتح الباری وحكم المجموع
من حيث المجموع الكفر لا غير ۔ (۱)

قادیانی عمارت کا اہم ستون حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مغالطہ انگیز اور پر فریب تاویلات ہے، جن میں غالبًا سب سے اہم یہ فریب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر موت طاری کی جاچکی ہے اس لئے اب ان کا دوبارہ دنیا میں واپس آنا ممکن نہیں ہے اور قادیانی اپنے اس مغالطہ میں وزن پیدا کرنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی دوبارہ آمد کے عقیدہ سے (ختم نبوت عقیدہ پر زد پڑتی ہے؛ حالاں کہ خود صراحتاً نبوت کا دعویٰ کرکے ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں ''چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد'') اس قسم کی فریب دہی کے ذریعہ دراصل وہ بزعم خویش یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث نبویہ میں

جس مسیح کی آمد کی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اس کا مصداق وہ خود مرزا جی ہیں (العیاذ باللہ) نہ کہ مشہور اسرائیلی پیغمبر (چنانچہ قادیانی اُمتان مرزا جی کو ہی مسیح مدعود کہتی ہے) مرزائیوں کا یہ دعویٰ اگرچہ اس درجہ لغو اور باطل ہے کہ اس کی تردید تو کیا تذکرہ کی بھی ضرورت نہیں ہونی چاہئے تھی؛ لیکن اسے زمانہ کی ستم ظریفی کہئے یا بقول ایک مفکر ''انتشار فکر وخیال کے اس دور کی کمزوری'' کا نام دیجئے کہ ایسا لغو بلکہ بیہودہ دعویٰ نہ صرف قابل غور ٹھہرا بلکہ بہت سے ضعیف العقل لوگ اس کا شکار ہوگئے۔

اس لئے یہ بھی بہت ضروری تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھالئے جانے اور دوبارہ دنیا میں واپس آنے سے متعلق جو احادیث صحیحہ اور قرآنی آیات سے حقائق ثابت ہوتے

(۱) اکفار الملحدین: ۱۲-۱۴۔

ہیں وہ سامنے لائے جائیں؛ تاکہ پھر کسی طالب حق کے لئے فریب خوردگی کا امکان نہ رہے اس غرض سے شاہ صاحبؒ نے ایک طرف خود عقیدۃ الاسلام، وتحیۃ الاسلام کے نام سے گرانقدر علمی مواد اور کثیر الجہات نیز پرمغز مباحث پر مشتمل ایک قیمتی کتاب تصنیف فرمائی دوسری طرف اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے اپنی رہنمائی ونگرانی میں ''**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**'' نامی کتاب مرتب کرائی جس میں تقریباً ستر حدیثیں ہیں، جس میں چالیس سے زیادہ صحیح وحسن کے درجہ کے ہیں، ان احادیث کو مختلف معتبر، متداول وغیر متداول ماخذ سے جمع کرکے ثابت کیا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول یعنی دنیا میں قیامت کے قریب دوبارہ تشریف لانے کا مسئلہ احادیث متواترہ سے ماخوذ اور اجماعی ہے جس پر ہر دور کے اہل سنت (صحابہ سے لے کر آج تک) متفق رہے ہیں، مزید یہ کہ قادیانی اُمت نے اپنی عادت کے موافق جن حضرات علماء سلف پر یہ افتراء کیا کہ وہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مرزائیوں جیسا عقیدہ رکھتے تھے (کہ ان کی موت ہوچکی ہے؛ لہٰذا دوبارہ آمد کا گویا امکان نہیں) موصوف نے اس غلط بیانی کا پردہ چاک

کر کے مدلل طریقے اور مکمل حوالوں کے ساتھ واضح کیا کہ وہ حضرات بھی دیگر علماء اہل سنت کی طرح ان کی دوبارہ آمد کے قائل تھے، اس بارے میں ان کی تصریحات معتبر ماخذ کے حوالوں سے نقل کی ہیں، جس سے ان حضرات کے دامن کا اس الزام سے پاک صاف ہونا منقح ہوکر سامنے آجاتا ہے، یہ کتابیں دراصل اہل علم کے استفادہ کی غرض سے لکھی گئی ہیں (اسی وجہ سے عربی زبان میں ہیں) اور ان کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ بھی اہل علم ہی کرسکتے ہیں۔

ان کے علاوہ شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک کتاب فارسی زبان میں بھی ''خاتم النبیین''، جو دراصل انھوں نے اپنے اہل وطن کشمیریوں اور بلوچستان کے رہنے والوں کے واسطے لکھی ہیں؛ کیوں کہ ان علاقوں میں فارسی بھی عام طور سے مقامی زبانوں کے علاوہ سمجھی جاتی ہے (جیسا کہ کتاب کے مقدمہ نگار علامہ کے شاگرد مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے تصریح کی ہے) اس میں مصنف کے بیان کے مطابق قرآن مجید کی سورہ احزاب کی آیت ''خاتم النبیین'' کی صحیح تفسیر وتشریح احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ وتابعین، نیز جمہور اُمت کی آراء کی روشنی میں کی گئی ہے کہ اس سے مرزائیوں کی غلط توجیہات اور باطل تاویلات کا پردہ چاک ہوجاتا ہے مرزائیوں نے مذکورہ آیت کی ایسی ایسی رکیک اور مضحکہ خیز تاویلات کی ہیں کہ سن کر ان کے علم وفہم نیز ان کی عقل وخرد پر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے خود مصنف علیہ الرحمہ نے لکھا:

> این مقالہ رسالہ ایست در ختم نبوت، تفسیر آیت کریمہ، خاتم النبیین، کہ در درالحاد وزندقہ وکفر وارتداد قادیانی علیہ ماعلیہ صورت تحریر بست۔ (مقدمہ خاتم النبیین)

علامہ کشمیری کے بعض تلامیذ کی مساعی

حضرت شاہ صاحب کے نزدیک اس فتنہ قادیانیت کی کس قدر اہمیت تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہے کہ موصوف نے اپنے ذوق ومزاج کے خلاف،

اور دیگر کثیر علمی مشاغل میں اشتغال اور قلت فرصت کے باوجود نہ صرف یہ کہ خود گرانقدر علمی ذخیرہ جمع کر کے اس فتنہ کے قلع قمع کرنے کی فکر کی؛ بلکہ اپنے متعدد ممتاز تلامیذ کو بھی اس راہ پر لگایا؛ چنانچہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق احادیث جمع کرنے کا کام اپنی رہنمائی اور نگرانی میں انجام دلوایا، جس کے نتیجہ میں ''**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**''، جیسی جیسی عظیم ونافع کتاب وجود میں آئی، اس کتاب کو بعد میں محقق عصر ومحدث روزگار شیخ عبدالفتاح ابوغدہ شامیؒ، استاذ جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) نے نہایت اہتمام سے شائع کرکے اس کے حسن معنوی وصوری میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ **فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔**

اس کے علاوہ مفتی صاحب نے ایک کتاب سلیس اُردو زبان میں ''ختم النبوۃ'' کے نام سے لکھی جو تین حصوں میں مکمل ہوئی، پہلے حصہ ''ختم النبوۃ فی القرآن'' میں نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ آیت ''خاتم النبیین'' کی عالمانہ تفسیر وتشریح ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد مرزائی باطل توجیہات اور رکیک تاویلات کا تار پود بکھر کر رہ جاتا ہے، موصوف نے اس حصہ میں پوری ایک سو آیتوں سے آنحضرت ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوجانا ثابت کیا ہے۔

دوسرے حصہ میں مصنف کے بیان کے مطابق دو سو دس احادیث ختم نبوت کے اثبات میں جمع کرکے پیش کی گئی ہیں، تیسرے اور آخری حصہ میں دلائل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ مسئلہ ختم نبوت ان مسائل میں سے ہے، جن پر صحابہ کرام، تابعین، وائمہ مجتہدین اور جمہور کا اجماع اور اتفاق رہا ہے، نیز یہ کہ ان چیزوں میں سے ہے، جنھیں ضروریات دین کا درجہ حاصل ہے اس بارے میں خود مصنف کے الفاظ یہ ہیں، ''یہ مسئلہ ملت اسلامیہ کے ان ضروریات میں سے ہے کہ جس پر آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر آج تیرہ سو سال تک تمام اُمت اسلامیہ کے افراد کا قطعی اجماع واتفاق رہا ہے، جس نے کسی مسلمان گھرانے میں پرورش پائی ہو وہ کبھی اس مسئلہ میں شبہ یا تاویل کے درپے نہیں ہوسکتا''۔ (ختم نبوت: ۱/۳۰)

علامہ کشمیری ہی کے ایک دوسرے ممتاز شاگرد جن کی سعی وتوجہ سے علامہ کی بخاری شریف کی درسی تقریر ''فیض الباری'' کے نام سے عربی کا جامہ پہن کر اور زیور طبع سے آراستہ ہوکر زندۂ جاوید بن گئی، یعنی حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم المدنیؒ کے بھی اس سلسلہ میں گرانقدر نقوش ہیں، جن میں ان کا ایک رسالہ ''آوازِ حق'' جب منظر عام پر آیا تو اہل نظر نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا؛ چنانچہ پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس برنی جن کی تصنیف ''قادیانی مذہب'' اس موضوع پر سنگ میل کا درجہ رکھنے والی ایسی کتاب ہے جس سے قادیانیت پر کام کرنے والا کوئی شخص بے نیاز نہیں رہ سکتا انھوں نے اپنی اسی کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ ''قادیانی صاحبان کی یہ غیر معمولی یورش اور سرگرمیاں دیکھ کر بالآخر مسلمانوں میں بھی توجہ، حرکت پیدا ہوئی، تحقیق کا شوق پھیلا چنانچہ ختم نبوت کے مسئلہ پر مسلمانوں کی طرف سے بھی رسالے نکلنے شروع ہوئے؛ لیکن اس سلسلہ میں سب سے مدلل اور جامع رسالہ ''آوازِ حق'' نکلا جو مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی استاذ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا علمی کرشمہ ہے......اور حیدرآباد میں شائع ہوا''۔ (قادیانی مذہب: ۳)

اس کے علاوہ مولانا مرحوم نے اپنی گرانقدر بلکہ شاہکار تصنیف ''ترجمان السنۃ'' کے حصہ سوم کے مستقل ایک باب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر تشریف لے جانے اور قیامت کے قریب پھر آسمان سے تشریف لانے پر احادیث نبویہ نیز دلائل عقلیہ سے استدلال کرکے اسے ثابت کیا ہے مولانا نے مسئلہ نزول عیسیٰ علیہ السلام پر اتنی تفصیل کے ساتھ کلام، قادیانی تلبیسات کا اچھی طرح جائزہ لے کر برافگندہ نقاب کیا ہے اسی لئے یہ باب کتابی شکل میں مصنف کے پیش لفظ کے ساتھ ''نزول عیسیٰ علیہ السلام'' کے نام سے پاکستان کے ایک ادارہ (ادارہ نشریات اسلام، رحیم یارخاں) نے علاحدہ شائع کردیا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص محققانہ اُسلوب میں بہت بصیرت افروز اور علمی طریقہ پر نزول مسیح کے بارے میں اہل سنت کے عقیدہ کا اثبات اور مرزائی دعوائے مسیحیت کا ابطال کیا ہے، موصوف نے بحث کا آغاز ہی ایک نسبتاً اچھوتے اور موثر انداز میں کیا ہے، فرماتے

ہیں ’’حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع ونزول بے شک عالم کے عام دستور کے خلاف ہے‘‘ لیکن ذرا اس پر غور کیجئے کہ ان کی ولادت کیا عالم کے عام دستور کے موافق ہے؟ ان کا نزول، عالم کے درمیانی واقعات میں سے نہیں ہے؛ بلکہ عالم کی تخریب کی علامت میں شمار ہے اور ’’تخریب عالم‘‘ یعنی قیامت کی بڑی علامات میں سے ایک علامت بھی ایسی نہیں جو عالم کے عام دستور کے موافق ہو‘‘۔ (نزولِ عیسیٰ:۶)

اس بارے علامہ کشمیری کے ایک اور شاگرد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی قلمی کاوشوں کا ذکر نہ کرنا موضوع کے ساتھ ناانصافی ہوگی، مولانا نعمانیؒ کے قلم کی سادگی اور پرکاری عوام، بالخصوص بے پڑھے لکھے یا بہت کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے جس درجہ مفید اور مؤثر ہوتی ہے اس کا مقابلہ نیز دلوں میں اُتر جانے والے ان کے انداز تحریر کا اثر عام لوگ جتنا لیتے ہیں اس کی برابری کم سے کم موجودہ فضلاء دارالعلوم (دیوبند) میں شاید ہی کوئی کر سکے، مولانا محترم کے اپنے اسی خاص طرز میں مختصر مگر نہایت جامع اور مؤثر دو رسالے، ’’قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ‘‘ اور ’’قادیانی کیوں مسلمان نہیں‘‘ عام طور پر قادیانیت کے توڑ میں جتنے مفید بلکہ سم قادیانیت کے بارے میں عوام کے لئے جس درجہ اکسیر ہیں اس میں غالباً اس درجہ کی کسی اور کتاب کا نام لینا مشکل ہوگا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ’’قادیانیت‘‘ خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے مرزائیت کے زہر کا تریاق فراہم کرتی ہے، مولانائے محترم نے اس گروہ کی نفسیات اور ان کی ذہنی سطح و مذاق کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے عصری اُسلوب میں یہ کتاب لکھی ہے اور ایک خاص بات یہ تحریر فرمائی ہے، جس کے لئے بعض غیر مسلم ہندوستانیوں کے مضامین بطور حوالہ پیش کئے ہیں کہ قادیانیوں کو ہندو قومیت کے علمبردار ذہین لوگوں کی تائید حمایت بھی حاصل رہی ہے؛ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قادیانی نبوت پر ایمان لانے والوں کا قبلہ ہندوستان ہوگا نہ کہ حجاز اور اس ’’تحویل قبلہ‘‘ کے جو دوررس نتائج

ہو سکتے ہیں وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ (دیکھئے: قادیانیت:۱۷۵، ط: لاہور ۱۳۸۶ھ)

مولانا علی میاں صاحب ہی نے ایک دوسری کتاب ’’النبی الخاتم‘‘ بھی لکھی ہے، جس میں اس فتنہ کے بعض اور اہم پہلو بھی سامنے لائے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ ’’ختم نبوت‘‘ کا عقیدہ جن ملتوں میں نہیں ہے (مثلاً عیسائیت) وہ اس درجہ انتشار اور پراگندگی کا شکار بنیں کہ ہر روز نت نئے پیغمبروں سے تنگ آ کر وہ ان سب کی تکذیب ہی میں عافیت سمجھنے لگیں، اس پر مولانا نے ان ملتوں کے بعض ذہین لوگوں کی تصانیف شہادت میں پیش کیں۔(۱)

آخر میں اس عظیم شخصیت کا ذکر آنا ضروری ہے جس نے نہ صرف زبان وقلم سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا؛ بلکہ اس کی سرکوبی کے لئے سربکف میدان میں اُتر پڑا اور پھر جس کی جرأت قلندرانہ کی بنا پر ان فتنہ سامانوں کا عرصہ حیات اسی سرزمین میں تنگ ہوگیا جو سب سے زیادہ ان کے لئے فراخ اور اپنے سینہ میں وسعت رکھتی تھی، میری مراد تحریک تحفظ ختم نبوت کے قافلہ سالار حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ سے ہے کہ

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: النبی الخاتم:۵۵-۵۴۔

اس مرد قلندر کے ذکر خیر کے بغیر بات نامکمل رہے گی ان کی مساعی جمیلہ اور تحریک ’’تحفظ ختم نبوت‘‘ (کہ جس کے آخری اور فیصلہ کن دور میں وہ قائد تھے) کی بدولت پہلے پاکستان میں اور پھر اس کی اتباع میں عالم اسلام کے دیگر ملکوں میں قادیانیوں کو غیر مسلم اور کافر قرار دیا گیا
۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد از هدیتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب ۔

۱- مشہور مصری عالم علامہ خضری (صاحب تصانیف کثیرہ) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ’’تاریخ التشریع الاسلامی‘‘ صفحہ ۶، ۵ میں قول راجح اسے قرار دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کا نزول ۱۷؍رمضان المبارک کو ہوا اور آخری آیت ۹؍ذی الحجہ کو نازل ہوئی، اس طرح کل مدت وحی ۲۲ سال ۲ ماہ ۲۲ دن ہوتی ہے۔(۱)

۲- شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

واذا كان كذالك وجب ان تكون سادة شريعته ما هو بمنزلة المذهب الطبيعي ۔ (حجۃ اللہ البالغۃ:۱۱۸،ط:مصر)

☆ ☆ ☆

(۱) تاریخ التشریع الاسلامی:۶-۵،ط:مصر۔

رب کریم کے فضل خاص کے تین ہفتے

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد رسول اللہ والہ ومن والاہ ۔

بچپن سے یہ مثل سننے میں آتی رہی ہے ــــ "جب خدا کسی کو دینا چاہتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے" ــــ بلاشبہ اس مثل کے پیچھے سینکڑوں واقعات شہادت دینے کے لئے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں، اسی طرح کا ایک واقعہ حقیر راقم سطور کے ساتھ گذشتہ دنوں پیش آیا، کہ اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے (بغیر کسی تواضع اور انکسار کے عرض ہے کہ

بالکل بلا استحقاق) ایک ناکارہ اور مادی وسائل واسباب سے قطعاً محروم بندہ کو اس نعمت عظمیٰ سے نوازا جس کی تمنا میں ہزاروں بندگانِ خدا عمریں ختم کر کے دارالبقا کی طرف روانہ ہوگئے اور یہ حقیر بھی عمر عزیز کی چار دہائیاں بلکہ اس سے بھی زیادہ گزار چکا تھا اور آئندہ مزید کتنی مدت اسی حسرت وآس میں گزرتی ؟ اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس عظیم دولت کے حصول کا ذریعہ مخدومنا حضرت مولانا علی میاں صاحب (۱) کی سراپا شفقت ذات گرامی بنی، فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء، ہوا یہ کہ **البینک الاسلامی للتنمیا**، جدہ (Islamie Developmeni Bank Jeddah) کے ڈائریکٹر یز ایکسی لینسی ڈاکٹر احمد محمد علی کا تار آیا جس میں بینک کی طرف سے منعقد ہونے والی ایک نہایت اہم میٹنگ میں شرکت کی دعوت مولانا کو یا ان کے معتمد نمائندہ کو جس کی علوم شرعیہ پر گہری نظر ہو، دی گئی تھی اور تمام مشغولیتوں پر اس کو ترجیح دینے کی پرزور اپیل بھی تھی تار کے جواب میں مولانائے محترم نے از راہ حسن ظن اس ناچیز کا نام بھیجنے کی فیصلہ فرما کر یہ خوش

(۱) افسوس! مولانا موصوف ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ، مطابق: ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء وفات پاگئے رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

آئند بلکہ مبارک خبر راقم سطور کو بھی سنائی، اگرچہ یہ خبر زندگی کی سب سے اہم اور دیرینہ تمنا پورا ہونے کا وسیلہ بننے کی بنا پر نہایت مبارک خبر تھی، مگر چوں کہ وقت بہت کم تھا اس لئے یہ خوف بھی تھا کہ تاخیر ہوجانے یا کسی قانونی رکاوٹ کے پیش آجانے کی وجہ سے کہیں یہ اُمید حسرت میں نہ بدل جائے، اس وجہ سے عجب اُمید وبیم کی کیفیت ان دنوں رہی جس کا صحیح اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو اس طرح کی صورتِ حال سے کبھی دوچار ہوچکے ہوں ؛ لیکن اس قادر مطلق (جس کے قبضہ میں سب کے قلوب ہیں) کا شکر کس طرح ادا ہو کہ اس نے ایسا کرم فرمایا کہ حیرت انگیز طریقہ پر بسہولت وبعجلت تمام رکاوٹیں دور ہوتی اور مختلف پیچیدہ اور قانونی اور فنی دشواریاں یوں حل ہوتی چلی گئیں کہ ایسا بہت کم ہوتے دیکھا گیا ہے۔ **فالحمد للہ علی ذلک حمداً کثیراً ۔**

بالآخر ۳؍فروری ۱۹۷۹ء بروز شنبہ کو وہ ساعت سعدی آہی گئی جس میں ''سوئے حرم اُڑ کر جانے'' کی قدیم شاعرانہ آرزو مجازی نہیں حقیقی معنی میں پورا ہوتے دیکھنے کی سعادت اس بے بال و پر کو میسر آئی، چنانچہ تاریخ مذکور پر شام کی فلائٹ سے لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہوا اور سفر اچھی طرح گویا شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پتہ چلا منزل آئی، لکھنؤ اور دہلی کا فاصلہ جیسے کبھی دس، بارہ گھنٹے سے کم میں طے کرنے کا تجربہ ہی نہ تھا، صرف پون گھنٹہ میں طے ہوتے اس دن ان آنکھوں نے بھی دیکھ لیا۔

دہلی سے اگلے دن ۴؍فروری کو ہوائی جہاز سے ہی ممبئی کے لئے روانگی ہوئی (جہاز کی روانگی میں ڈھائی گھنٹہ کی تاخیر ہو جانے کی وجہ سے) عصر کے قریب ممبئی پہنچنا ہوا، دہلی اور ممبئی کی طویل مسافت دو گھنٹہ سے بھی کم وقت میں طے ہوگئی، اس موقعہ پر ممبئی کے مشہور دیندار تاجر اور علم دین سے وابستگی رکھنے والوں کے مستقل میزبان جناب صوفی عبدالرحمٰن صاحب (خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم (۱) اور ان کے سعادت مند فرزندوں کے مخلصانہ برتاؤ اور بیرونی سفر کے سلسلہ میں پیش آنے والی مختلف دشواریاں (ممبئی و جدہ دونوں جگہ) حل کرانے کے بارے میں ان کی جدوجہد کا ذکر نہ کیا جانا بڑی ناسپاسی ہوگی —— واقعہ یہ ہے کہ صوفی صاحب اور ان کے سعادت مند صاحبزادگان کی مخلصانہ مساعی، ہر طرح کی سہولت پہنچانے کا ان میں دلی جذبہ (جو بے شک خداوند تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک اہم انعام ہے) نہ ہوتا تو مجھ جیسے ناتجربہ کار اور بیرونی سفر کی دشواریوں سے ناآشنا کے لئے یہ سفر بہت دشوار ہو جاتا (جو بلا مبالغہ ظاہری و جسمانی لحاظ سے بھی زندگی کا سب سے زیادہ آرام و راحت والا سفر تھا) اللہ تعالیٰ ان سب کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

اس کے دو روز بعد ۶؍فروری روز سہ شنبہ ممبئی سے جدہ کی طرف پرواز تھی، خدا خدا

(۱) افسوس کہ یہ دونوں (مرشد و مسترشد) بھی وفات پاچکے ہیں رحمہا اللہ واسعہ ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء مرشد اور ۱۷؍جولائی ۲۰۰۴ء مسترشد رُخصت ہوئے۔

کر کے وہ مبارک ساعت بھی آگئی جس کے لئے دن گنے جا رہے تھے اور خدا کی توفیق سے عمر میں پہلی مرتبہ اس مقدس لباس میں ملبوس ہونے کی سعادت کا وقت (صوفی صاحب ہی کے دولت کدہ پر بعد فجر غسل مسنون کر کے) آیا، جسے احرام کا پاکیزہ نام پاک ذات ہی کی طرف سے عطا ہوا ہے، خدا کی شان کبریائی اور اس کی قدرت کی کارفرمائی نظر آئی، جس نے اپنے نہایت ضعیف و حقیر اور گناہ گار بندہ کو یہ موقعہ عطا فرمایا کہ وہ مُحرِم بنے اور درِ اقدس پر حاضر ہونے کی تیاری کرے، جس کی تمنا میں نہ جانے کتنے قدسی صفات و برگزیدہ انسان حسرت لئے دنیا سے رُخصت ہو گئے، جہاز کو اگرچہ ڈیڑھ بجے دن پرواز کرنا تھی؛ لیکن ہمیں حکم یہ ملا کہ ساڑھے نو بجے صبح ہی ایئرپورٹ پہنچ جائیں (شاید جذبۂ دل کا امتحان مقصود تھا) چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، وہاں پہنچ کر کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد وہ مبارک وقت آیا کہ سوئے حرم اُڑ کر جانا نصیب ہوا اور :

...... چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

کے مصداق جوں جوں منزل قریب آتی گئی ویسے ہی دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار تیز ہوتی گئی اور شاید ہوا بازوں کو ہمارے صبر و انتظار کا مزید امتحان مقصود تھا کہ انھوں نے طویل راستہ اختیار کیا یعنی کویت میں تقریباً پون گھنٹے ٹھہرنے کے بعد جدہ کی طرف جہاز اُڑایا، مغرب بعد (حجاز مقدس) کے تقریباً ساڑھے چھ بجے شام اور ہندوستانی وقت کے ۹ بجے رات اور سعودی کلینڈر کے مطابق ۹؍ربیع الاول جہاز اس سرزمین پر اُترا جسے حرم کے مسافروں کی میزبانی اور پیشوائی کا اس سے بڑھ کر ''باب حرم'' ہونے کا شرف حاصل ہے، بیرونی سفروں کا جن لوگوں کو سابقہ پڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ جہاز کا ایئرپورٹ پر بخیر اُتر جانا ہی مسافر کا منزل پر پہنچ جانا نہیں ہوتا بلکہ ''ابھی ......امتحان اور بھی ہیں'' —— کا بعض مرتبہ تکلیف دہ حد تک منظر سامنے آتا ہے، پاسپورٹ اور ویزا کی چیکنگ، ہیلتھ سرٹیفکیٹ کا معائنہ اور سب سے بڑھ کر کسٹم آفیسر کی میز پر ہونے والا، امتحان (جس کا صحیح تصور دینی

ہے، نہ کہ شنیدنی) لیکن اس قادر وقیوم کا کیوں کر شکر ادا نہ ہو کہ اس نے یہ ہفت خواں (بلکہ کہنا چاہئے میدان حشر قبل از حشر کا مرحلہ) بھی گھنٹوں میں نہیں منٹوں میں طے کرا دیا، جس کا ظاہری سبب، اسی مسبب الاسباب نے یہ بنا دیا کہ محترم میزبان کی طرف سے مجھے لینے کے واسطے بھیجے گئے، ایک عرب نمائندہ جو عربی لباس میں تھے (خلاف معمول بلکہ شاید، خلاف قاعدہ) اندر وہیں پہنچ گئے، جہاں یہ حشر بپا تھا اور پہلے سے کسی تعاون کے بغیر وہ اس تپاک اور خوش اخلاقی سے ملے؛ بلکہ بغل گیر ہوگئے جو عربوں کا خاصہ ہے، پھر تو وہ ساری دہشت ووحشت دور ہوگئی جو حشر کا سا سماں دیکھ کر مجھے ہو رہی تھی اور کچھ تو ان کی تجربہ کاری اور کچھ آفسروں سے ان کی شناسائی کی بنا پر گویا چشم زدن میں ''ارض الحساب'' سے چھٹکارا نصیب ہوگیا۔

جیسے ہی باہر پہنچے، وہاں میزبان کی طرف سے بھیجے گئے ایک معزز ومحترم شخصیت استاذ بہجہ مصری سے ملاقات ہوگئی، موصوف بھی اسی گرمجوشی سے ملے، جس کے بعد یہ احساس ہی جاتا رہا کہ میں کسی اجنبی جگہ ہوں، انھوں نے جب مجھے احرام کی حالت میں دیکھا توسوال کیا کہ کیا اسی وقت عمرہ کرنا ہے؟ میرا جواب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا تھا کہ ''جی ہاں !ارادہ اور دلی خواہش تو یہی ہے''۔

میرے ایک سوال کے جواب میں موصوف نے یہ بھی بتایا کہ جس میٹنگ میں شرکت کے لئے یہاں آنا ہوا ہے اس کا پہلا جلسہ کل صبح ۹ بجے سے ہے، اس لئے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رات ہی میں (یا زیادہ سے زیادہ علی الصباح) مکہ معظّمہ حاضر ہوکر عمرہ ادا کرلیا جائے، خیر اس وقت تو ایرپورٹ سے سیدھے کانٹی نینٹل سطح کے مشہور ہوٹل ،قصر الکندرہ(Kandra Place Hotel) میں وہ حضرات مجھے موٹر سے لے گئے، راستہ میں موٹر کے اندر ہی مجھے ایک بڑا سا لفافہ دیا جس پر میرا نام لکھا تھا، اندر کھول کر دیکھا تو اس میں بیرونی مہمانوں کے اعزاز میں دیئے جانے والے ''لنچ'' کا دعوت نامہ تھا، اس کے علاوہ سائیکلو اسٹائل کیا ہوا جلسہ کا پروگرام اور مدعوین کے نام مختصر تعارف کے ساتھ تھے،

(مدعوین کی فہرست میں احقر کا نام بھی مکتوب تھا) اس کے ساتھ مشہور شافعی فقیہ مصطفیٰ الزرقاء کا تیار کردہ وہ نوٹ بھی تھا جس پر بحث ہونا تھی، ہوٹل پہنچ کر مستقل کمرہ (جو میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا) میں ٹھہرایا گیا، استاذ بہجہ نے ہوٹل پہنچنے کے ساتھ ہی یہ بھی اطمینان دلایا کہ اسی وقت موٹر کا انتظام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ رات ہی میں عمرہ سے فارغ ہوکر آجانا ممکن ہو—— چنانچہ چند ہی منٹ بعد عربی لباس میں ملبوس ایک موٹر ڈرائیور کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ یہ آدھ گھنٹہ بعد آکر مکہ مکرمہ لے جائیں گے، تم اتنے وقت میں تیاری کرلو۔

میں ہوٹل کے کمرہ میں تیاری کر ہی رہا تھا کہ ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد کمرہ میں لگے فون کی گھنٹی بجی، رسیور اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ لے جانے کے واسطے موٹر آگئی ہے—— چنانچہ جلد ہی بریف کیس میں پاسپورٹ اور مختصر سامان لے کر رات کے نو یا دس بجے کے درمیان سوئے حرم روانہ ہوگیا۔

جدہ سے مکہ مکرمہ کے درمیان ۷۵ کلومیٹر کا فاصلہ (تقریباً ۴۶ یا ۴۷ میل) عمدہ موٹر اور اچھی سڑک سے عموماً ایک گھنٹہ سے کم میں طے ہوجاتا ہے، مگر ہمارا ڈرائیور چند منٹ اپنے مکان ٹھہرتا ہوا (غالبًا گھر والوں کو مطلع کرنے کی غرض سے) روانہ ہوا، اس لئے ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ وقت گذرنے کے بعد باب السلام کے قریب موٹر نے چھوڑا اس کے بعد ''بیت عتیق'' کی دید سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کا وہ مبارک وقت آیا جس کے لئے نہ جانے کتنی مرتبہ دل نے بے قرار اور کتنی بار آنکھوں نے اشک بار ہوکر رب البیت کی بارگاہ میں درخواست پیش کی تھی، سچ تو یہ ہے کہ تنہا ایک اسی احسان وانعام کی خوشی میں جان بھی قبول کرلی جاتی تو کم ہوتی مگر یہ نصیب ہمارے کہاں! بس اشک ندامت کے چند قطرے ہی نذر کئے جاسکتے تھے، کتب فقہ وحدیث کے درس وتدریس میں بیس یا پچیس سالہ مشغولیت کی بنا پر گمان تھا کہ بغیر کسی راہ نما کے بآسانی عمرہ کی ادائیگی مسنون طریقہ پر کی جاسکے گی، مگر وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ تنہا کتابی علم نہ صرف کافی نہیں بلکہ عملی نمونہ کے بغیر علم

سفینہ بھی بے راہ ہی نہیں گمراہ بھی بنا سکتا ہے (اسی سے خداوند تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہوا کہ اس نے کبھی صرف آسمانی صحیفہ بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ ہمیشہ کسی نہ کسی نبی کو کتاب کے ساتھ نمونۂ عمل بنا کر بھیجا)۔

مگر اس ہادئ مطلق کی شان کے قربان جس نے وہاں تک پہنچایا تھا، بھلا وہ عین وقت پر بھٹکتا کیوں کر چھوڑ دیتا، اس نے نہ جانے کتنے نمونے ہم جیسے ناواقف کے لئے وہاں ہر وقت موجود رہنے کا انتظام فرما رکھا ہے؛ البتہ پہلے ہی مرحلہ میں درس وتدریس کی وجہ سے ''واقفیت'' کا پندار جو پیدا ہو گیا تھا وہ رخصت اور ''جہول'' ہونے کا ازلی وصف آشکارا ہو گیا، جس طرح نابینا کسی بینا کی انگلی کے ہی سہارے منزلیں طے کر سکتا ہے، میں بھی اسی کا محتاج تھا، مگر خدا کے فضل سے نہ جانے کتنے ''بینا'' وہاں دست گیری کے واسطے موجود تھے، جس کی رہنمائی میں عمرہ کے تمام افعال بحمد للہ تعالیٰ ادا کرنے کی توفیق ملی، آخری مرحلہ جس پر افعال عمرہ کا اختتام ہوتا ہے حلق یا قصر (سر کے بال منڈوانے یا کتروانے) کا رہ گیا، اس کے لئے عملی رہنمائی بھی کافی نہیں تھی جب تک مالی (اور مالی بھی وہ جسے وہاں مال سمجھ کر بآسانی قبول کیا جا سکے) سرمایہ نہ ہو اور اس وقت میرے پاس سعودی عرب کا کوئی بھی سکہ نہ تھا، ہاں امریکی ڈالر موجود تھے (جو ممبئی ایر پورٹ پر قانونی حد کے اندر بہت تھوڑی مقدار میں ہندوستانی سکہ کے بدلے دیئے گئے تھے) ایسی مشکل برصغیر کے جیسے کسی ملک میں پیش آتی تو نہ جانے کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا؛ لیکن وہ جگہ جس کو ''مثابة للناس'' (تمام دنیا کے لوگوں کی پناہ گاہ) کہا گیا ہے اور جس کی طرف سے تمام انسانوں کے دلوں کو جھکایا گیا ہے (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم سے یہ دُعاء کی تھی: ''**فاجعل افئدة من الناس تهوی اليهم**'') بھلا اس جگہ کسی بھی ملک یا کسی بھی رنگ ونسل کا انسان ایسی معمولی دشواری میں زیادہ عرصہ کیسے پھنسا رہ سکتا تھا؟ چنانچہ ایسا فوری حل سامنے آیا کہ وجدان رقص کرنے لگا اور ''**بلد امين و امٰن**'' (امن وامانت کا شہر) اور اس کے خالق کی عظمت کا یقین تازہ ہو گیا۔

اللہ اللہ امن وامانت کا یہ عالم کہ معمولی پیشہ ور ایک بالکل اجنبی اور نووارد پر ایسا اطمینان کر لے کہ وہ بے محابا کہہ دے ''اچھا ریال پھر دے جانا'' اور شاید پھر ''دے جانے'' کی بات بھی اس نے نووارد ہی کی عزت نفس کا پاس کرتے ہوئے کہی، ورنہ بعید نہیں کہ اس کا ضمیر بالکل بلا اُجرت لئے ہی، حلق یا قصر کرنے پر اسے آمادہ کر رہا ہو، مگر اس نے اپنے ضمیر کے تقاضے پر اجنبی مسافر کے جذبہ کو ترجیح دے کر ایثار کی ایک لطیف واعلیٰ صورت اختیار کی ہو (واللہ اعلم) مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ ضروری نہیں قرار دیا کہ مجھے ہی آ کر دینا؛ بلکہ اس نے کہا ''میرے کسی بھی ہم پیشہ کو میرا نام بتا کر دے دینا تا کہ وہ مجھے پہنچا دے'' سوچئے! کیا بلد امین کے علاوہ کسی اور مقام پر ایسے اعتمادِ امانت کا آج کے جیسے خود غرضی کے ماحول میں تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارے اپنے ملک کے کسی بڑے شہر میں کسی ٹیکسی ڈرائیور پر سابقہ تعارف کے بغیر یہ اطمینان کیا ہی نہیں جا سکتا کہ کوئی اجنبی مسافر تنہا رات کی تاریکی میں، سامان کے ساتھ بعافیت ٹیکسی میں اتنا لمبا سفر کر لے، مگر وہاں یہ روزمرہ کا معمول ہے کہ لوگ نہ صرف تنہا سفر کرتے ہیں؛ بلکہ سامان کی نگرانی کا کام بھی اجنبی ڈرائیور ہی کو سونپ کر اپنے مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں، چنانچہ میں نے بھی اپنا بریف کیس ڈرائیور کے ہی مشورہ پر بغیر ادنیٰ خطرہ محسوس کئے موٹر ہی کے اندر چھوڑا اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹہ کے بعد عمرہ کے تمام افعال سے باطمینان فراغت کے بعد جب واپسی کا ارادہ کیا تو وہ ٹھیک اسی طرح موٹر میں رکھا ہوا پایا جس طرح چھوڑ کر گیا تھا۔

غرضیکہ حج اصغر (عمرہ) کی ادائیگی سے فارغ ہو کر رات کو ایک بجے کے قریب جدہ کے لئے تنہا اسی ڈرائیور کے ساتھ واپسی ہوئی، رات کا باقی ماندہ حصہ اپنی قیامگاہ (قصر الکندرہ) میں گذرا نیند تو برائے نام ہی آئی تھی صبح صادق نمودار ہوتے ہیں اذان فجر سنائی دی یہ غالباً پہلی اذان تھی جو ارض عرب پر میرے کانوں نے سنی مسجد تلاش کرنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ جب مسجد پہنچا تو وہاں سلام پھر چکا تھا (عالم عرب میں نماز فجر بالکل ابتدائی وقت

ہوتی ہے، جیسے ہمارے یہاں رمضان المبارک میں اکثر مساجد کے اندر) —— یہ نماز ہوٹل ہی کی مسجد میں پڑھی جو وہاں کی عام مسجدوں کی طرح سائبان نما سپاٹ چھت کی تھی —— یہ دیکھ کر قلق ہوا کہ مسجد میں بیشتر نمازی ہوٹل کے شاگرد پیشہ ملازم (اکبر الہ آبادی مرحوم کی ظریفانہ تعبیر کے مطابق جمن) معلوم ہو رہے تھے، حالاں کہ ایسے شاندار ہوٹل میں اونچی سطح کے مقیمین کی تعداد بھی یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہوگی (اگر چہ یہ واقعہ ہے کہ پورے عالم عرب میں عموماً اور سعودی عرب میں خصوصاً نمازیوں کا تناسب غالباً ۹۰/۶۵ فیصدی ہے، جب کہ ہمارے برصغیر میں مشکل سے ۱۵/۱۰ فیصد)۔

۷؍فروری ۷۹ء مطابق ۱۰؍ربیع الاول ۹۹ھ یوم چہار شنبہ چند گھنٹہ بعد اس میٹنگ میں شرکت کے لئے جانا تھا، جس کے طفیل یہ تمام سعادتیں نصیب ہوئیں نو بجے جلسہ گاہ جو اسلامی بینک کی شاندار بلڈنگ کا میٹنگ ہال تھا، پہنچنا تھا جس کے لئے ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل کی زمینی منزل میں بنے ایک ہال کے اندر پہنچ گیا، وہاں استاذ بہجہ مصری پہلے سے خوش آمدید کہنے اور جلسہ گاہ لے چلنے کے لئے منتظر موجود تھے، رفتہ رفتہ تمام مدعوئین اسی جگہ اکٹھا ہوگئے اور وہیں ہر ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا۔

جلسہ میں سعودی عرب، شام، مصر، اُردن، عراق، ہندوستان، الجزائر کے علماء تھے (سعودی عرب کے علاوہ ہر ملک سے ایک ایک تھے) باہر سے آنے والوں میں شیخ مصطفیٰ زرقاء اور جامعہ ازہر کی کلیہ شریعہ وقانون کے ذمہ دار ڈاکٹر حسن علی شاذلی سب سے ممتاز تھے، مؤخر الذکر نے ہی جلسہ کی صدارت کی اور پھر اجتماعی طور پر موٹروں کے قافلہ میں ہر موٹر میں دو نفر اسلامی بینک کی بلڈنگ کی طرف روانہ ہوئے جو ہوٹل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھی، موٹروں کا یہ قافلہ نہایت شاندار، کشادہ سڑکوں سے گزرتا ہوا ایک سر بفلک امریکی طرز کی جدید وعظیم عمارت جس پر مختلف ملکوں کے قومی جھنڈے لہرا رہے تھے کہ وسیع دالان میں داخل ہوا اور وہاں سب لوگ موٹروں سے اُتر کر بلڈنگ کے بلوریں صدر دروازے سے گذرتے ہوئے پہلی منزل پر بنے ایک ہال میں اکٹھے ہوئے، وہاں اپنے

میزبان اور بینک کے صدر جناب ڈاکٹر احمد محمد علی کی نہایت متواضع اور خلیق ودیندار شخصیت سے ملاقات ہوئی، اگر چہ موصوف سے پہلی بار ملنا ہو رہا تھا، مگر ان کی ذہانت اور بلند اخلاقی نے اس کا احساس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ کسی نو وارد یا اجنبی سے مل رہے ہیں اور نہ یہ اندازہ ہوا کہ ایک معمولی پوزیشن کسی صاحب السعادۃ (ہز ایکسی لینسی) یعنی وزیر کی سطح کے قابل احترام اور مملکت کے ایک اہم شخص سے مخاطب ہے اور یہ وہ امتیاز ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کے لوگوں کو خصوصی طور پر نوازا ہے، جسے اس نے اپنے آخری وابدی پیغام کا حامل وامین بنایا، ظاہر ہے اس امانت کی ادائیگی بغیر تواضع اور حقیقی مساوات کے ممکن ہی نہ تھی، چنانچہ یہ وصف (تواضع، حقیقی مساوات اور اونچ نیچ کا فقدان) تمام عربوں میں کم وبیش پایا جاتا ہے، اسی کا یہ ثمرہ ہے کہ وہاں افسر وماتحت، چپراسی اور سیکریٹری کے درمیان ظاہری طور پر کوئی فرق نظر نہیں آتا، مثلاً ہر ایک دوسرے کو سلام کرتا اور ہر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر بے تکلف کھاتا پیتا ہے، دفاتر میں نشستوں کا بھی کوئی خاص امتیاز دیکھنے میں نہیں آیا، پس اگر فرق ہے تو کام میں یا مشاہروں میں، ظاہر ہے کہ یہ چیز کسی ہندوستانی کے لئے ایک خوش آئند انکشاف ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور میں تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے عربوں کی اس خصوصی وصف سے قریبی آگہی بخش کر ایمان تازگی کا ایک مزید موقع عطا فرمایا۔

اوپر یہ بات ذکر میں آنے سے رہ گئی کہ جب اسلامی بینک جدہ کی دعوت پر میرا وہاں بھیجا جانا طے کیا گیا تو اس وقت تھوڑی سی فکر اور ذہنی اُلجھن اس لئے ہوئی کہ موجودہ بینک سسٹم کے فنی مسائل سے تو میں ناآشنا ہوں، پھر وہاں بحث میں حصہ کس طرح لے سکوں گا؟ مگر اس منعم حقیقی کی کس کس نعمت کا شکر ادا ہو کہ اس فکر اور ذہنی اُلجھن کو چند روز (شاید ہفتہ عشرہ) ہی گزرے تھے کہ ڈاک کے ذریعہ بینک کی طرف سے بھیجے ہوئے موضوع بحث سے متعلق کاغذات موصول ہوئے جس کے بعد سارا تردد رفع ہوگیا؛ بلکہ بہت خوشی ہوئی (اور اسے نیک فال جانا)؛ کیوں کہ وہاں بحث کے لئے ایسا موضوع مقرر

کیا گیا تھا، جو میری خاص دلچسپی کا تھا، یا کم سے کم یہ کہ اس سے مجھے تھوڑی بہت مناسبت تھی، جلسہ کی تفصیلی روئداد اور اس میں کی گئی بحثوں کو تو انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں قلمبند کروں گا، اس وقت سر دست یہ بتا دینے ہی پر اکتفاء کرتا ہوں کہ اسلامی بینک جس کا تمام کاروبار غیر سودی ہے اور ربا (سود) کے بجائے ربح (یعنی تجارتی طریقہ پر حاصل ہونے والے منافع) کے اُصول پر نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، کی کامیابی کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ چھتیس (۱) ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں (مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی مرکزی حکومت کے ایک مسلم وزیر صاحب نے پارلیمنٹ میں یہ ارشاد فرمایا کہ غیر سودی بینکوں کا چلنا ممکن نہیں ہے) اور وہ تمام ہی خدمات انجام دے رہا ہے جو عصری بینک انجام دیتے ہیں؛ لیکن اس بینک کے لئے بعض مصالح کی بنا پر اپنا سرمایہ اجنبی بینکوں (سودی بینکوں) رکھنا بھی ناگزیر ہے، ظاہر ہے کہ سودی بینک اپنے اُصول کی رو سے جمع شدہ سرمایہ پر سود دیتے ہیں، اس طرح اسلامی بینک کے سرمایہ پر جمع ہونے والی سود کی رقم اتنی خطیر ہو گئی جس کا ہندوستان جیسے غریب ملک کے باشندوں کے لئے تصور بھی تعجب انگیز ہے، یعنی گزشتہ رجب تک اس رقم کی میزان ۶۳ ملین امریکی ڈالر تک ہو چکی تھی (تقریباً ساٹھ کروڑ

(۱) یہ ۱۹۷۹ء کی روئداد ہے، بعد میں تو نہ جانے کتنے ملکوں میں شاخیں قائم ہو گئیں۔

ہندوستانی روپے) جس نے اسلامی بینک کے دیندار ذمہ داروں کے لئے مسئلہ پیدا کر دیا اور وہ مجبور ہوئے کہ علماء عصر سے دریافت کریں کہ اس رقم کا مصرف کیا ہو؟ بس اسی گتھی کو سلجھانے کے لئے تقریباً سارے عالم اسلام کے گنے چنے مگر ممتاز علماء وفقہاء کو جمع کیا گیا تھا، اس بارے میں اسلامی بینک کے فہیم و بالغ نظر رئیس ڈاکٹر احمد محمد علی صاحب (جو اپنی دینداری میں بھی نمایاں حیثیت کے حامل معلوم ہوئے) نے یہ دانشمندانہ اقدام پہلے کیا کہ عالم اسلام کے مشہور نادرۂ روزگار فقیہ یعنی شامی عالم شیخ مصطفیٰ الزرقاء صاحب سے اس موضوع پر ایک علمی وفقہی بحث کا مسودہ تیار کروا کر —— جو فل اسکیپ سائز کے ۱۸ صفحات پر پھیلا ہوا تھا، مدعوئین کے پاس کافی پہلے سے بھیج دیا تھا؛ تاکہ تمام شرکاء تیاری کر کے بحث

میں حصہ لے سکیں اور کسی نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، چنانچہ اس دور اندیشی کا یہ کھلا فائدہ نظر آیا کہ ایسے اہم اور پیچیدہ مسئلہ پر مختلف فکر وخیال اور نقطۂ نظر رکھنے والے ممتاز علماء ایک ہی دن کے سنجیدہ مذاکرہ کے بعد حل پر متفق ہو گئے اور غیر متعلق مباحث میں اُلجھنے سے بچ گئے، بعض شرکاء موضوع سے متعلق اپنے افکار وخیالات (عربی میں) قلم بند کر کے لائے تھے (ان ہی میں راقم سطور تھا(۱)) ہر ایک تحریر کی فوٹو کاپی کروا کر تمام شرکاء کے پاس پہنچا دیا گیا اور بعض نے بحث وتمحیص میں صرف زبانی حصہ لیا۔

ہم سب ہندوستانیوں کے لئے مسرت وخوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے بالغ نظر علماء نصف صدی سے زائد عرصہ سے جو نقطۂ نظر اس طرح کی رقموں کے بارے میں اپنائے ہوئے ہیں اور اس کے مطابق عرصۂ دراز سے فتویٰ دے رہے ہیں اس کو وہاں اختیار کیا گیا، جب احقر نے اپنے مقالہ میں ہندوستانی علماء کے اس دیرینہ فتویٰ کا ذکر کیا تو وہاں تعجب آمیز خوشی کے ساتھ اُسے سنا گیا؛ چنانچہ بعد میں بینک کے صدر صاحب نے حضرت

(۱) مصطفیٰ زرقاء صاحب کی اس فاضلانہ بحث کی تفصیل، اس پر اپنی مفروضات کا خلاصہ انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر شاید پیش کیا جا سکے، راقم الحروف کا قلم بند کردہ مضمون مختلف رسالوں وغیرہ میں شائع ہوا، پھر اس کا معتد بہ حصہ کتابی شکل میں (عربی) کتاب ''قضایا فقہیہ معاصرۃ'' میں شائع ہوا نیز اُردو میں ''جدید مسائل کا شرعی حل'' نامی کتاب میں۔

مولانا علی میاں صاحب مدظلہ سے اس کا زبانی تذکرہ بھی کیا، اس بات سے قدرتی طور پر، ہندوستانی ہونے کے ناطے، نیز علماء کے اس گروہ کی طرف انتساب کی وجہ سے، مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کے ساتھ اپنے اکابر کی بالغ نظری پر یقین میں اور اضافہ ہو گیا —— یہاں یہ تذکرہ شاید بے محل نہ ہو کہ راقم سطور جب حجاز سے واپسی پر دہلی میں جناب محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (۱) سے ملا اور ان کے سامنے جلسہ کی مختصر روئداد بیان کرتے ہوئے وہاں کے اس فیصلہ کا ذکر کیا تو موصوف نے بھی خوشی کا اظہار فرمایا اور اس کے ساتھ اپنے والد ماجد (عارف باللہ مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ) اور اس عصر کے بعض اکابر علماء کے اس فتویٰ کا پس منظر بتایا، گویا ان حضرات کی دور اندیشی و بالغ نظری اور اصابت

رائے کا نقش تازہ کیا۔ **فرحمهم الله رحمة واسعة وادخلهم النعيم المقيم۔**

پہلی نشست تقریباً ڈیڑھ بجے دن ختم ہوئی اس کے بعد تمام شرکاء جدہ کے ایک بڑے ہوٹل ''جدہ پیلس'' گئے، جہاں بینک کے صدر کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں پُر تکلف ظہرانہ کا انتظام تھا، اس میں بیرونی مہمانوں کے علاوہ مقامی ممتاز اشخاص بھی مدعو تھے، اسی تقریب سے، سرزمین عرب پر قدم رکھنے کے بیس گھنٹے کے اندر ہی عربوں کے اخلاق و تمدن، ان کی روایتی مہمان نوازی کے ساتھ وہاں عصر حاضر کی پیدا کردہ پرتکلف تہذیب کی جھلک بھی دیکھنے کا سنہرا موقعہ ہاتھ آ گیا —— کھانے کی مختلف قسم کی آٹھ دس چیزیں، تقریباً اتنی ہی پھلوں کی انواع دسترخوان پر تھیں —— خاصی ترتیب سے، ہوٹل کے خدام —— ایک ایک چیز لاتے اور ہر چیز کے لئے علاحدہ پلیٹ وغیرہ بھی آتی (اور پہلی پلیٹ اُٹھالی جاتی) اس طرح کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹہ لذت کام و دہن کی نذر رہا، مگر اس دوران علمی مذاکرہ بھی چلتا رہا، گویا مجلس طعام، 'جسم' کے لئے ہی نہیں 'علم' کے لئے بھی برپا تھی —— اس بناء پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روح و جسم دونوں شادکام ہو رہے تھے، کھانے سے فارغ ہو کر موٹروں ہی میں (ہر دو نفر کو ایک موٹر پوری مدت قیام کے لئے مستقل دی دی گئی تھی) اپنی قیام گاہ پہنچے۔

(۱) مفتی صاحب موصوف بھی وفات پا چکے ہیں، ۱۱ر مئی ۱۹۸۴ء کو۔

مغرب بعد پھر نشست تھی جو رات کو تقریباً ۱۲ بجے تک چلی، اس نشست کے اختتام پر گویا کام ختم ہو چکا تھا، بس اب اگلے دن کے لئے صرف تجویز مرتب کر کے پاس کر دینے کی رسمی کارروائی ہی باقی رہ گئی تھی (تجویز کے لئے ایک مختصر سی کمیٹی بنا دی گئی تھی) بحسن اتفاق حضرت مولانا علی میاں صاحب بھی جدہ پہنچ گئے، بینک کے صدر صاحب کو موصوف کی آمد کی اطلاع ملی تو انھوں نے باصرار آخری نشست میں شرکت کی دعوت مولانائے محترم کو دی، جسے مولانا محترم نے از راہ کرم منظور فرما لیا، چنانچہ ''**ختامه مسک**'' کا مصداق ۸ر فروری ۷۹ء کو جلسہ کا اختتام ڈیڑھ بجے دن دُعاء پر ہوا، حضرت مولانا مدظلہ کے اعزاز میں اس وقت (دوپہر) کی دعوت مولانا کے جدہ کے مستقل میزبان (وہاں کے دیندار رئیس

اور ملک التجار) شیخ محمد نور عبدالغنی نورولی صاحب کے یہاں تھی موصوف نے راقم سطور سے بھی کھانے میں شرکت کرنے کے لئے اصرار کیا تھا، چنانچہ مولانا مدظلہ کے ہمراہ اپنے معزز میزبان سے اجازت لے کر بلکہ ان سے گویا رخصت ہو کر میں بھی (مولانا کی قیامگاہ) آ گیا، پھر تو ایک ہفتہ شرف معیت حاصل رہا جس کا بیشتر حصہ ''**البلد الامين**'' (**مکہ مکرمہ**) میں گزرا اس سفر میں احقر پر خداوند تعالیٰ کے جو بے شمار انعامات ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بالکل خلافِ توقع حضرت مولانا اور مولانا کے خواہرزادہ محترم مولانا محمد رابع صاحب زید کرمہ کی رفاقت اتنی مدت حاصل رہی جس سے دینی نفع بھی ہوا اور سہولتیں بھی پہنچیں، ہر نو وارد کی طرح میں بھی کسی شفیق راہنما کی دستگیری کا محتاج تھا، اللہ تعالیٰ کی شان کرم، اس نے ایسے ہی راہنماؤں کا انتظام فرما دیا جس کا پہلے سے تصور بھی نہیں تھا۔ **فالحمد لله على ذلك۔**

اگلے دن علی الصباح ۹ر فروری مطابق ۱۲ر ربیع الاول یوم جمعہ کو حضرت مولانا کے ساتھ ایک مختصر سا قافلہ کئی موٹروں میں (عمرہ کا احرام باندھے ہوئے) مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوا، جس میں راقم سطور کو بھی شمولیت کا شرف حاصل رہا اور پہلی بار دن کی روشنی میں، ان مقدس و متبرک مقامات و آثار کی دید سے آنکھیں ٹھنڈا کرنے کا موقعہ ملا جن کا تصور ہی ایمان افروز اور روح پرور ہے اور جس کی تمنا ہر صاحب ایمان کے دل میں رہتی؛ بلکہ اسی آس میں زندگی گذرتی ہے، بھلا جس نعمت کا خواب میں پالینا بھی عظیم دولت اور خوش بختی کی علامت ہے، وہ بیداری میں میسر آ جائے تو گناہ گار آنکھوں کی یہ جرأت کہاں کہ بغیر غسل کے تاب نظارہ لاسکیں یا تازہ بہ تازہ موتیوں کا سرمہ لگائے بغیر تابانی برداشت کر سکیں! بہر حال جوں جوں ''اُم القریٰ'' سے قرب ہوتا گیا ''فرزندوں'' کے دل کی بے تابی بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ مقام آ گیا، جہاں سے باادب ہو کر ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے، اس سے کچھ ہی پہلے ایک ایسے تاریخی میدان سے گزرنا نصیب ہوا، جہاں پندرہ سو قدسی صفات جاں نثاروں نے جان سپاری کا عہد اس دست مبارک پر کیا تھا، جس سے زیادہ پاک و مقدس ہاتھ خالق نے نہیں بنایا اور ذہن نارسا کی رسائی اور بلند پروازی دیکھئے کہ آن کی آن میں

چودہ صدی پیچھے کی طرف لے جا کر چشم تصور کے سامنے ۶ ھ کے وہ تمام واقعات لا کر کھڑے کرنے لگا، جو اس میدان میں پیش آ چکے تھے، بہرحال دماغ کا سفر پیچھے کی جانب اور موٹر کا آگے کی سمت برابر جاری رہا اور اس کے ساتھ دل برابر چٹکیاں لیتا اور ضمیر اس پر ملامت کرتا رہا کہ جو جگہ سر کے بل چلنے کی تھی وہ موٹر کے ذریعہ طے کی جارہی ہے، قلب وذہن کی کشمکش سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک آنکھیں اسی بیت مکرم کے دیدار سے شرفیاب ہونے لگیں، جس کا وجود تمام انسانوں کی عزت وحرمت ہی کا نہیں ان کے جود وبقا(۱) کا بھی سبب ہے، اس کے ساتھ طواف کا دل آویز اور ایمان افروز منظر بھی سامنے آیا کہ مالک حقیقی کے بیت کے چاروں طرف اس کے بندے نجات کی تلاش مسلسل میں مشغول ہیں (صدیاں گزر گئیں مگر اس تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا) اور ۲۴ گھنٹوں میں کوئی لمحہ (بجز جماعت کے اوقات کے) ایسا نہیں ہوتا جس میں بندے اپنے مولا کو راضی کرنے کی فکر میں رواں دواں نظر نہ آتے ہوں اس سے بھی زیادہ روح پرور سماں، ملتزم پر ہر دم نظر آتا ہے کہ بچوں کی طرح بلک بلک کر اور گڑ گڑا کر مانگنے والا، دینے والے سے وہ سب کچھ مانگتے اور طلب کرتے ہیں جو مانگا یا طلب کیا جا سکتا ہے اور یہ یقین لے کر ہی ہٹتے ہیں کہ دینے

(۱) قرآن مجید میں کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے ”جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیام اللناس“۔(مائدۃ)

والا جس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں، بس اب دینے ہی والا ہے، لاکھوں نہیں، کروڑوں انسان اپنے اپنے دامن مراد بھر چکے ہیں اور برابر بھرتے ہی چلے جارہے ہیں، مگر نہ تو دینے والا ہی اکتاتا ہے اور نہ مانگنے والے ہی وہاں تھکتے نظر آتے ہیں، بعض سائلوں کے نالہ وفریاد جب قریب کھڑے ہونے والوں کے دلوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتے ہیں گویا پتھر کو بھی موم بنا دیتے ہیں تو بھلا وہ ”الرؤف الرحیم“ کیوں نہ ان کی التجائیں سنے گا، جس نے اپنی ایک صفت مجیب دعوۃ المضطرین بتائی (بے قراروں کی فریاد سننے والا) اور حجر اسود پر انسانوں کا ٹوٹ پڑنا جس نے دیکھا ہے، پروانوں کا شمع پر نثار ہونا اس کی نظر میں مجاز بن

جاتا ہے، ان کیف آور اور روح پرور نظاروں سے قلب ونگاہ، جسم وجان کا ہٹانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اگر کسی طرح اس مشکل پر قابو پالیا گیا تو وہاں سے کچھ فاصلہ پر کھڑی صفاء ومروہ نامی دو چھوٹی پہاڑیوں (جنھیں دیکھ کر آج یہ باور کرنا ہی مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ پہاڑیاں تھیں) کے درمیان ہونے والی مسلسل تگ ودو اللہ کی ایک برگزیدہ بندی کی داستان وفا سناتی دکھائی دے گی، خلاصہ یہ کہ ان تمام نعمتوں سے بقدر ظرف حصہ پاتے، آخر میں حلاق (حجام) کی دوکان پر جا بیٹھے اور رفتہ رفتہ تمام شرکاء میر قافلہ کے پیچھے، وہیں اکٹھے ہوگئے، یہاں سے فارغ ہوکر، حضرت مولانا اپنے شاگرد رشید اور مخلص قدیم مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی زاد مجدہ (استاذ ادب عربی جامعہ ملک عبد العزیز) جنھیں مکہ مکرمہ میں مولانا کا مستقل میزبان ہونے کی سعادت حاصل ہے، کے وسیع اور آرام دہ مکان کی طرف روانہ ہوگئے، بعد میں دوسرے رفقاء بھی وہیں پہنچ گئے، یہاں اس کا ذکر نہ کرنا حقیقت کو چھپانا ہوگا کہ مولانا عبد اللہ عباس نے نہ صرف اپنے استاد محترم بلکہ ان کے خدام ورفقاء کی بھی میزبانی کا حق ادا کر دیا۔**فجزاہ اللہ احسن الجزاء**۔

جمعہ کا مبارک دن پہلی بار اس بابرکت سرزمین پر مجھے نصیب ہورہا تھا، اس لئے خواہش وکوشش تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو تیاری کر کے حرم شریف پہنچنے کی سعادت حاصل کی جائے؛ چنانچہ ممکنہ عجلت کے ساتھ تیاری کی، پھر موٹروں ہی میں سب لوگ (جن میں راقم سطور بھی تھا) حرم محترم حاضر ہوگئے، میر کارواں باب الملک عبد العزیز کے محاذی وسطی دالان میں تشریف فرما ہوئے اور سب خدام ورفقاء بھی اسی جگہ پہنچ گئے، (عجب حسن اتفاق ہے کہ وہاں جمعہ کی ۱۲ ربیع الاول تھی گویا جو تاریخ، بقول مشہور دنیا کی قسمت جاگنے کی تھی، اس میں عاصی کا بخت خفتہ بھی بیدار ہورہا تھا ”**صلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد والہ وصحبہ اجمعین**“ پہلی بار یہ گناہ گار آنکھیں ”**اینما تولوا فثم وجہ اللہ**“(۱) کی پُر کیف اور نرالی تفسیر کا مشاہدہ کررہی تھی کہ ہر سو خدا کے بندے خدا کے حضور سر بہ سجود تھے،

سمت کا کوئی تعین نہ تھا؛ البتہ سب کا قبلۂ سجود وہ بیت تھا جس کی لفظی نسبت بھی جاہلی دور تک میں صرف ''اللہ'' ہی کی طرف رہی اور آج بھی بیت اللہ کے علاوہ کوئی اور قلب معروف اس کا نہیں ہے، جماعت کے اختتام پر خاص انداز کا اعلان ہوتے ہی (جو ہر نو وارد کے لئے غالبًا نا قابل فہم سا ہوتا ہے، پھر تمام نمازی صف بستہ ہوگئے، میری حیرانی دیکھ کر فوراً ہی حضرت مولانا نے متنبہ فرماتے ہوئے، نماز جنازہ ہونے کی خبر دی، چنانچہ ہزاروں ہزار خدا کے بندوں نے بیت اللہ کے سامنے (ایک یا چند خوش قسمت بندگانِ خدا کی) نماز جنازہ پڑھی، میرا بلکہ شاید سب کا یقین یہی تھا کہ یہ ایسی موت تھی جس پر ہزاروں زندگیوں کو رشک آیا ہوگا، نماز کے بعد وہاں سے موٹر ہی کے ذریعہ حضرت مولانا کے ہمراہ قیام گاہ واپسی ہوئی، پھر فوراً قریب ہی میں ایک صاحب وجاہت وثروت شخصیت محترم سعدی صاحب (۲) کے یہاں حضرت مولانا کے ہمراہ پر تکلف عربی کھانا کھایا، جس کا اہتمام مولانا کے اعزاز میں سعدی صاحب نے کیا تھا، اس میں بہت سی اہم شخصیتیں مدعو تھیں۔

پھر تو تقریباً ایک ہفتہ مسلسل حرم محترم کی نورانی فضاؤں میں وقت گزارنے اور نمازیں پڑھنے کی توفیق ملتی رہی، (**فالحمد للہ علی ذالک**) یوں تو اس مقام کا ہر لمحہ رشک عید

(۱) جدھر بھی اپنا رُخ کرلو اُدھر ہی اللہ کی ذات (کی خوشنودی اور تجلی مل سکتی) ہے۔ (۲) یہ سعدی صاحب اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں، جس کی یادگار مکہ معظّمہ کا مدرسہ صولتیہ ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے، مولانا محمد شمیم صاحب کیرانوی مکی موجودہ ناظم مدرسہ صولتیہ کے حقیقی چچازاد بھائی ہیں، (سعدی صاحب کی بھی وفات ہوگئی)۔

وشب برأت ہے؛ لیکن ہم جیسے ظاہر بینوں کو سب سے زیادہ پُر لطف اور روح پرور منظر بعد مغرب اور قبل فجر کا معلوم ہوا، قیام گاہ اور حرم شریف کے درمیان خاصا فاصلہ ہونے کی وجہ سے خطرہ تھا کہ کہیں نماز فجر میں حضوریٔ حرم سے محرومی نہ ہوجائے، مگر اس سفر میں اللہ تعالیٰ کے جو خاص انعامات رہے ان میں یہ بھی ہے کہ روز کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہوجاتی جس کی وجہ سے حاضری نصیب ہوجاتی (ایسا بھی ہوا کہ قیام گاہ سے پیدل ہی چل پڑے،

راستہ میں کسی موٹر نشین ملے، بغیر کسی تعارف کے اپنی موٹر میں خود بٹھا کر حرم شریف پہنچا دیا، ہندوستان میں یہ بات چاہے جتنی تعجب خیز نظر آئے، مگر وہاں رہنے والوں کے لئے اس طرح کے واقعات میں کوئی ندرت نہیں ہے) اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، عزیز مکرم مولوی سید سلمان حسینی ندوی سلمہ اللہ کو کہ ان کی ہمت ورفاقت نے بھی اس دشواری کو بہت آسان بنادیا تھا۔

مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ۱۱رفروری یکشنبہ کو منیٰ، مزدلفہ اور جنت المعلیٰ کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا، اسی کے ساتھ مسجد خیف، مسجد نمرہ اور جبل رحمت کی بھی (فالحمد للہ علی ذالک) اسی درمیان ہندوستانی سفیر مامور سعودی عرب (جناب عبدالقادر حافظ صاحب) نے حضرت مولانا کو دیرینہ مخلصانہ تعلق کی وجہ سے ۱۲رفروری یوم دوشنبہ کو دوپہر کے کھانے پر اپنی قیام گاہ (جدہ) مدعو کیا، مولانا کے ہمراہ احقر اور مولانا رابع صاحب وغیرہ بھی مدعو اور شریک طعام تھے، اسی دن شام کو قبل از مغرب مکہ مکرمہ واپسی ہوگئی، اسی بہانے اللہ تعالیٰ نے ایک اور عمرہ کی توفیق عطا فرمادی، اگلے روز اپنے ویزا کی توسیع کے سلسلہ میں پھر جدہ جانا ہوا، سعودی عرب کے (نئی دہلی میں) سفارت خانے کی طرف سے ایک ہفتہ کا ویزا دیا گیا تھا، وہاں جاکر مزید دو ہفتے کی توسیع ہوسکی، خدا کے فضل وکرم سے (بینک کے صدر محترم کی توجہ، نیز محترم بشیر احمد صاحب انجینئر حیدرآبادی کی تگ ودو کی بدولت، چند گھنٹوں ہی میں کام ہوگیا اور بعد عصر مکہ مکرمہ واپسی ہوگئی، اس دن بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے عمرہ کی سعادت پھر نصیب ہوگئی، اسی شب میں ۱۳رفروری ۷۹ء جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی زاد مجدہ نے حضرت مولانا کے اعزاز میں پُر تکلف عشائیہ (ڈنر) دیا جس میں تمام وُ جہائے مکہ خاص طور پر ممتاز علماء مدعو کئے گئے تھے، اس تقریب سے اللہ تعالیٰ نے بسہولت ''بلد طیب'' کے علماء واشراف سے ملاقات کا شرف عطا فرمادیا اس کے اگلی شب میں ۱۴رفروری ۷۹ء مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا محمد شمیم صاحب (خلف الرشید حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہما) نے بھی مدرسہ صولتیہ کے ہال میں حضرت مولانا علی میاں

صاحب مدظلہ کے اعزاز میں عشائیہ دیا، اس موقعہ پر مزید صلحاء وشرفاء سے نیاز حاصل کرنے کی سعادت ملی، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کی قدیم ترین تعلیم گاہ ہے، ایک صدی قبل جسے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (مصنف اظہار الحق) مہاجر مکی نے ۱۲۹۲ھ میں قائم فرمایا جس کے بقاء وقیام میں ہندوستان کے اصحابِ خیر اور ذی وجاہت حضرات کی بہترین مساعی شامل رہی ہیں، اس لئے ہندوستانیوں، بالخصوص علماء کو اس سے بڑا جذباتی لگاؤ ہے اور مدرسہ کے ذمہ داروں نے بھی ہمیشہ اس ربط وتعلق کی قدر فرمائی ہے، چنانچہ بیشتر ہندی علماء کا قیام (زمانۂ حج میں) وہیں رہتا ہے، راقم سطور کے لئے اس عمومی وجہ کے علاوہ جذباتی لگاؤ کا ایک اور سبب بھی ہے، وہ یہ کہ احقر کے والد ماجدؒ قاری حمید الدین سنبھلیؒ تقریباً ۴۵، ۴۶ سال (قبل) اس مدرسہ کے طالب علم رہ چکے ہیں، جہاں انھوں نے استاذ القرأ مولانا قاری عبداللطیف صاحبؒ مکی سے قرأت عشرہ کی تکمیل کی تھی، چنانچہ محترم مولانا محمد شمیم صاحب (۱) نے جو والد صاحبؒ سے اچھی طرح واقف ہیں، اسی رشتہ سے احقر کے ساتھ خاص شفقت اور عنایت کا معاملہ کیا اور اس جگہ کی زیارت بھی کرائی، جہاں والد صاحبؒ قاری عبداللطیف صاحبؒ سے مستفید ہوتے تھے (وہ کمرہ آج کل روحانی کے بجائے، مادی غذا کے طور پر استعمال ہو رہا ہے) اور مجھے مدرسہ میں ہی قیام کرنے کا حکم فرمایا (فجزاہ اللہ خیر الجزاء) اگر حضرت مولانا صاحب کی رفاقت کے شرف سے محرومی کا خیال نہ ہوتو ضرور تعمیل حکم کی جاتی؛ بلکہ ہندوستان سے روانگی کے وقت وہیں قیام کا ارادہ تھا (اسی لئے مخدومی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے تعارفی خط میں بھی عنایت فرمایا تھا۔)

(۱) مولانا محمد شمیم صاحب بھی انتقال فرما گئے (یکم مارچ ۱۹۹۲ء مطابق اواخر شعبان ۱۴۲۱ھ)۔

غرضیکہ اس طرح ابھی ایک ہفتہ ہی مکہ مکرمہ کے قیام پر گذرا تھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی حجاز سے واپسی کا وقت آ گیا، اس لئے سب خدام اور رفقاء مولانا کے ہمراہ جدہ تودیع کی غرض سے گئے اور ۱۵ر فروری یوم پنجشنبہ کو جدہ ایر پورٹ پر مولانا کو ساڑھے بارہ بجے دن رُخصت کرکے احقر تو مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

بلد اللہ الحرام سے مدینۃ الرسول کی طرف

جدہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ تقریباً ڈھائی سو میل ہے؛ لیکن عمدہ موٹروں اور اس سے بھی عمدہ سڑک کی وجہ سے عموماً پانچ گھنٹہ میں اس طرح طے کرلیا جاتا ہے کہ راستہ میں ایک دو جگہ کافی دیر ٹھہر کر ستا لینے اور کھانے پینے کا موقع بھی مل جاتا ہے، چنانچہ ہماری ٹیکسی بھی دو جگہ ٹھہرتی اور رابغ میں سمندری مچھلی کھانے اور عصر کی نماز ادا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہوئی تقریباً ساڑھے چھ بجے یعنی غروب آفتاب کے کوئی ۲۰ یا ۲۵ منٹ بعد مسجد نبوی کے محاذات میں پہنچ گئی، مغرب کی نماز باجماعت اول وقت میں ذوالحلیفہ سے کچھ پہلے ادا کی گئی۔

راستہ میں ٹیکسی جیسے ہی بدر کے کے قریب پہنچی، ذہن نے ماضی کی طرف تیزی سے پھر سفر شروع کردیا، جوں جوں ٹیکسی آگے بڑھتی، قلب ودماغ کی حالت متغیر ہوتی جاتی، بدر اور اصحابِ بدر کے تذکرے نہ جانے کتنی مدت تک کانوں کی راہ سے قلب ودماغ میں اپنا نورانی اثر چھوڑتے رہے تھے، مگر یہ گناہ گار آنکھیں اس خطۂ مہر ووفا کی جھلک اب تک دیکھنے سے محروم تھیں، سو آج خدا نے ان کی فریاد بھی سن لی تھی، تو بھلا اس پاکیزہ سرزمین کا طواف اور اس کے ایک گوشے کی زیارت سے اپنی ٹھنڈک کا سامان فراہم کرنے میں نگاہ کیوں کوتاہی کرتی، مگر یہ حسرت پھر بھی باقی رہ گئی کہ مرکب (سائق کے نہیں) راکب کے اختیار میں ہوتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی، اس لئے بزبانِ حال یہ کہتے گزرنا پڑا:

میرے ارماں ...... پھر بھی کم نکلے

ارض حرم کی طرح ارض طیبہ کی حاضری بھی تنہا ہی ہو رہی تھی ہر اجنبی مسافر کو نئی جگہ پہنچنے سے پہلے عموماً نادیدہ خدشات کے تصور سے دوچار ہونا پڑتا ہے، قدرتی طور پر تھوڑی دیر کے لئے مجھے بھی ہونا پڑا، مگر اس ہادیٔ مطلق اور منعم حقیقی کی کس کس نعمت کا شکر ادا ہو، اس نے ایسا انتظام فرمایا کہ ہر قدم پر یوں محسوس ہوا کہ رہنما اور رہنمائی جیسے پہلے ہی سے انتظار میں ہو، چنانچہ جوں ہی ٹیکسی سے اپنے مقررہ مقام پر چھوڑا فوراً ہی ایک صاحب نظر

آئے، ان سے جب اپنی متوقع قیام گاہ کا پتہ پوچھا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ وہاں تک پہنچنے کی آسان تدبیر زبانی بتائی، بلکہ فوراً وہاں کے لئے ٹیکسی بلا کر کھڑی کر دی، سامان رکھ کر میں اس پر بیٹھا تو دیکھا ایک اور صاحب بھی (بلالی شکل وصورت کے نہایت سفید لباس میں ملبوس) اس میں بیٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں، فطرۃً ابتداء میں تھوڑی سی گرانی ہوئی، مگر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا، ٹیکسی روانہ ہوئی اور چند ہی منٹ بعد منزل کے قریب جا کر رکی، جہاں سے آگے جانا قانوناً اس کے اختیار میں نہ تھا، ہماری منزل ابھی تھوڑی دور تھی، سامان بھی اتنا ساتھ تھا جس کا اٹھانا تنہا میرے بس کا کام نہ تھا، دیکھا کہ وہی بلالی صاحب سب سے زیادہ وزن والا عدد اُٹھائے ہوئے ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے؛ بلکہ باصرار ایک اور چیز بھی اُٹھا لینے پر آمادہ ٹیکسی والے کو اُجرت دینا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہی صاحب اس میں بھی سبقت کر چکے ہیں، وہاں سے راونہ ہو کر مدرسہ علوم شرعیہ جا کر اسباب رکھا، ابھی عشاء کا وقت شروع ہونے میں اتنی گنجائش تھی کہ غسل کیا جا سکے، چنانچہ غسل خانہ چلا گیا وہاں جاتے ہوئے ان صاحب کو وضو کرتے ہوئے چھوڑا تھا، مگر جب غسل کر کے باہر نکلا تو وہ غائب تھے، پھر اس کے بعد انھیں آنکھیں تلاش ہی کرتی رہیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں، اسی وقت حضرت اقدس شیخ الحدیث (۱) کی خدمت میں باریابی نصیب ہوگئی حضرت والا طویل علالت اور بے حد ضعف کی وجہ سے بہ تکلف بہت ہی آہستہ آواز میں گفتگو فرما رہے تھے، مگر لفظ لفظ سے شفقت چمک رہی تھی، تھوڑی ہی دیر بعد حضرت کے خادم خاص مولانا حبیب اللہ صاحب

(۱) افسوس یہ بابرکت شخصیت بھی یکم شعبان ۱۴۰۲ھ م ۲۵ر مئی ۱۹۸۲ء، دوشنبہ میں رحلت کر گئی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

کے ساتھ مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں باب جبرئیل سے پہلی بار حاضری نصیب ہوئی اور روضۂ اطہر کے بائیں حصۂ مسجد میں عشاء کی نماز باجماعت پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، نماز سے فارغ ہو کر مواجہہ شریف میں حاضری کی بے بہا دولت ملی، جس کی آرزو میں نہ جانے کتنے اللہ کے برگزیدہ بندے تڑپ تڑپ کر جان دے چکے مگر مراد بر نہ

آسکی، خدا تعالیٰ کا اس ضعیف وناتواں بندے پر کرم دیکھئے کہ اس نے بلا استحقاق واہلیت اس آستانہ پر پہنچا دیا، جسے کسی عارف نے ''عرش سے نازک تر'' بتایا (کسی عارف نے ہی نہیں متعدد فقہاء نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے، مثلاً فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

ومكة افضل منها (المدينة) على الراجح الا ما ضم أعضاؤه عليه الصلوٰة والسلام فإنه أفضل مطلقا حتى من الكعبة والعرش والكرسى۔

اس کے شارح علامہ ابن عابدینؒ نے نقل کیا ہے:

الضريح افضل من المسجد الحرام وقد نقل القاضى عياض وغيره الإجماع على تفضيله على الكعبة ...... ونقل عن ابن عقيل الحنبلى ان تلك البقعة أفضل من العرش۔ (ردالمحتار: ۲/۲۵۷، ط: دیوبند)

—— لیکن شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اس میں کلام میں کیا ہے، اس موضوع پر سیر حاصل بحث علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم کی شرح (فتح الملہم: ۳/ ۴۲۲-۴۱۷) میں کی ہے، تفصیل کے طالب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اور جہاں جنید وبایزید، جیسے مقبولان بارگاہ بھی ادباً دم بخود ہو جاتے ہیں، وہاں لقب وروح کی جو حالت ہوتی ہے اس کے اظہار کے لئے بڑی سے بڑی قدرتِ بیان بھی ناکافی ہے، بہر حال اژدہام کی وجہ سے دور ہی کھڑے ہو کر چند ساعتیں (جنھیں زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھنا بے جا نہ ہوگا) درود وسلام میں بسر ہوئیں، چوں کہ حضرت شیخ مدظلہ العالی کے انتظار فرمانے کا خیال عجلت پر آمادہ کر رہا تھا، اس لئے اس وقت جلد ہی وہاں سے واپسی پر دل کو آمادہ کر لیا، پھر مولانا حبیب اللہ صاحب ہی کی نشاندہی پر ''روضة الجنة'' یعنی جس کے بارے میں زبانِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''ما بين بيتى ومنبرى روضة من رياض الجنة'' (میرے گھر اور میرے

منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے) میں حاضر ہوکر دو رکعت پڑھنے کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ شرعیہ آ گیا (جہاں حضرت اقدس کا قیام ہے) پہنچتے ہی حضرت شیخ دامت برکاتہم کے بعض خدام نے بتایا کہ حضرت والا انتظار فرما رہے ہیں اور ایک صاحب کو مسجد شریف تمہیں دیکھنے اور بلانے بھیجا تھا، اس نوازش وکرم نے عرق عرق کردیا، خدمت میں حاضر ہوا تو دسترخوان بچھا اور حضرت کے چند خاص احباب کے ساتھ ہم طعامی کا شرف حاصل ہوا، حضرت خود تو بس روحانی غذا کے سہارے ہی جی رہے ہیں، مادی غذا کی مقدار تو شاید تولے سے ماشوں میں آ گئی ہے اور پھر جب تک احقر کا قیام وہاں رہا روزانہ بعد عشاء کا یہی معمول رہا، یہ رات وہیں گزری، اوپر یہ تذکرہ رہ گیا کہ لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت مخدومی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (مولانا بھی ۳؍مئی ۱۹۹۷ء کو رحلت فرمائے گئے، غفراللہ لہ) نے اپنی گراں مایہ تصنیف ”آپ حج کیسے کریں“ عنایت فرمادی تھی، اس کتاب سے غیر معمولی نفع پہنچا، گویا اس نے خاموش گائیڈ کا کام کیا (کتاب کے بہت سے مقامات تو آنسوؤں کے سیل رواں میں تیر کر ہی پار کئے جاسکتے ہیں) اس کتاب میں مواجہہ شریف کا سب سے پُرسکون اور کم ہجوم وقت اذان سحر (جس وقت مسجد شریف کے دروازے کھلتے ہیں) کے متصل بتایا گیا ہے، چنانچہ راقم سطور نے اس شب ایسا ہی کیا؛ لیکن پروانوں کی تعداد میں اس وقت بھی کوئی غیر معمولی فرق نہ پایا (البتہ بعد عشاء کے مقابلہ کچھ کمی ضرور تھی) لیکن وقت چوں کہ ”جوف اللیل الآخر“ (رات کا آخر) تھا اس لئے بہت اچھا لگا اور اللہ نے جتنی دیر توفیق بخشی حضوری کے شرف سے روضۂ اقدس کی سنہری جالیوں کے قریب ہی کھڑے ہوکر مشرف ہونے کی سعادت نصیب رہی، اس وقت خود اپنی قسمت پر نازاں تھا؛ لیکن ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا، کہیں کوئی شعوری یا غیر شعوری بے ادبی، حبط اعمال (نیکیوں کی بربادی) کا سبب نہ بن جائے، سنہری حروف میں جالیوں کے اوپر لکھی آیت: ”**لا ترفعوا اصواتکم ...... ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون**“ (اے ایمان والو! اپنی آوازیں بلند نہ کرو...... ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ تمہاری ساری نیکیاں برباد ہوجائیں اور

تمہیں پتہ بھی نہ چلے) ہر زائر کو ”باادب“ رہنے کا حکم دے رہی تھی، اس کے علاوہ مسجد شریف کے مختلف حصوں، بالخصوص دیوار قبلہ میں مکتوب بہت سی اور آیتیں بھی ”مقام محمدی“ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خبردار کررہی تھیں، مزید برآں یہ کہ ادب کے جذبہ سے ہونے والی ”بے ادبیوں“ پر تنبیہ کرنے کے لئے کعبۃ اللہ کی طرف یہاں بھی مخصوص افراد (خاص پولیس کا عملہ) مامور ہیں، جنھیں مسلسل اپنا فرض منصبی انجام دینا پڑتا ہے، اس کے بعد جنت کی کیاری (روضۃ الجنہ) میں بآسانی خدا کے فضل سے نماز پڑھنے کی جگہ مل گئی (بلکہ خدا کے فضل سے زمانۂ قیام کی اکثر نمازیں اسی میں پڑھنا نصیب ہوئیں اس طرح محراب النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ نماز پڑھنے کی توفیق ملی، حالاں کہ وہاں ہر وقت ہجوم رہتا ہے اور لوگ لائن لگائے کھڑے رہتے ہیں) پھر وہیں اشراق تک مشغول رہنے کی توفیق ارزاں ہوئی (فالحمد للہ علی ذالک) روضۂ اطہر کے ٹھیک شمال میں چند گز کے فاصلہ پر بنا چبوترہ (صفہ) ان پاکباز اور علم کوش حضرات کی یاد دلاتا ہے، جنھوں نے فاقہ کرکے اور مصیبتیں اُٹھا کر علم کی قدردانی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت شعاری کے نقوش قائم کئے (فرضی اللہ عنہم) اس پر اللہ کے بندے مسلسل قرآن خوانی کرکے قرآن کے اولین طالب علموں کی گویا یاد تازہ کرتے رہتے ہیں، یہاں سے پھر مدرسہ شرعیہ آیا، رات ہی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ عصر وعشاء کے بعد کے علاوہ اور کسی وقت حضرت شیخ رحمۃ اللہ سے ملاقات نہیں ہوسکتی، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس وقت احباب سے ملنے کی کوشش کی جائے، جن میں سے بعض کے پتے بھی میرے پاس تھے، سب سے قریب قیام گاہ عزیزان مولوی علی احمد ندوی (۱) ومولوی افتخار حسین ندوی سلمہما کی تھی؛ چنانچہ وہیں پہنچا (یہ دونوں منتظر بھی تھے) پھر ان کی خواہش پر ان ہی کے یہاں گویا مستقل قیام رہا۔

(۱) مولوی علی احمد بعد میں ماشاء اللہ علمی ترقی کے زینوں پر چڑھتے رہے یہاں تک کہ ڈاکٹر (پی، ایچ، ڈی) ہوئے اور ۲۰۰۴ء میں ”فیصل ایوارڈ“ سے سرفراز ہوئے (اللہم زدفزد)۔

۱۹؍ربیع الاول مطابق ۱۶؍فروری یہ جمعہ کا دن تھا، وہیں غسل اور جمعہ کی تیاری کر کے مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) حاضر ہو گیا، نماز کے بعد پھر یہیں آنا اور کھانا ہوا اس وقت نیز عصر بعد اور بھی کئی عزیزانِ ندوہ سے ملاقات ہوئی (پھر تو اکثر سے بعد عصر روزانہ ملاقات ہوتی رہی) جس میں مولوی معاذ ندوی سلمہ بھی تھے، یہ جب تک میں وہاں رہا مستقل ساتھ رہے ان عزیزوں نے بہت ہی راحت وسہولت پہنچائی، باجودیکہ ان لوگوں کا ششماہی امتحان قریب تھا، اور اس کی تیاری کی فکر ومشغولیت تھی، مگر مہمان نوازی کے ساتھ ہر اہم جگہ کی زیارت میں رفاقت کرتے رہے جس کی وجہ سے بآسانی اکثر آثر کی زیارت نصیب ہوگئی (اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ وہ ان سب کو بہتر سے بہتر جزاء عطا فرمائے، اپنی مرضیات پر چلائے اور علم وعمل کی دولتیں نیز دارین میں فلاح نصیب فرمائے)۔

اگلے دن ۱۷؍فروری روز شنبہ بعد نماز فجر متصلاً مسجد قبا جانے کی سعادت حاصل ہوئی، ہفتہ کے دن صبح کے وقت وہاں پیدل جانا مسنون اور بہت ہی اجر وبرکت کا باعث ہے، (۱) اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے ایسے ہی وقت میں پیادہ پا حاضری نصیب فرمائی، وہاں سے واپسی میں اسکے قریب مسجد الجمعہ (جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا جمعہ پڑھا تھا) (۲) میں بھی حاضری کی سعادت ملی، پھر قیام گاہ واپس آ کر اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد مسجد نبوی حاضر ہو گیا، آجکل یہ وقت عموماً روضۂ اطہر پر ہجوم کی کمی کا ہوتا ہے (اسی طرح عصر کے بعد کا وقت بھی اللہ تعالیٰ جنھیں توفیق

(۱) بخاری، کتاب فضل الصلاۃ فی مسجد مکہ و المدینۃ:۱۱۹۱، ۱۱۹۳-۱۱۹۴۔

(۲) فأدركت رسول الله صلى الله عليه وسلم الجمعة فى بن سالم بن عوف، فصلاها فى المسجد الذى فى بطن الوادى، فكان أولى جمعة صلاها بالمدينة (البدایہ والنہایۃ لابن کثیر: ۱۹۸/۳، ط: مکتبۃ المعارف، بیروت)۔

دیتا ہے وہ اس فرصت کو غنیمت جان کو مواجہہ شریف میں حاضری دیتے اور درود وسلام کے

تحفے پیش کر کے شاد کام ہوتے ہیں۔

اگلی صبح کو فجر کے بعد ۱۸؍فروری یکشنبہ مسجد نبوی میں عزیز گرامی قدر مولوی خلیل الرحمٰن سجاد ندوی سلمہ (فرزند ارجمند مولانا محمد منظور نعمانی) بھی مل گئے، جو اسی شب میں جدہ سے واپس آئے تھے، اس کے بعد عزیز موصوف بھی پوری مدت قیام ساتھ ہی رہے اور ان کے وہاں طویل قیام نیز حلقۂ تعارف کی وسعت کے سبب بعض اہم شخصیتوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا (جس سے علمی و دینی نفع پہنچا) اسی دن بعد فجر جبل اُحد حضرت سید الشہداء اور دیگر شہدائے اُحد کے مزرات، نیز بیر عثمان (بیر رومہ) جامعہ اسلامیہ اور مسجد غمامہ کی زیارات نصیب ہوئیں، اس میں اتنا وقت لگ گیا کہ مسجد نبوی میں ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ہی قیام گاہ واپسی ہوسکی، اس درمیان بہت سے اس سے ملتے جلتے اہم آثار دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، خاص طور پر جبل احد کا وہ شگاف جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی ہونے کے بعد آرام فرمایا تھا (۱) (اور یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے شگاف کو جس میں صرف ایک ہی شخص کی گنجائش ہے، اسی کام کے لئے اور صرف اسی دن کے لئے وجود بخشا تھا) جب دیکھنے کی سعادت میسر آئی تو اس لحاظ سے یہی سب سے بڑی نعمت معلوم ہوئی کہ غالبًا (مدینہ طیبہ) میں یہی ایسی جگہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی تغیر نہیں ہوا، (یا اگر ہوا بھی ہوگا تو بہت ہی معمولی) شہداء اُحد، خاص طور پر سید الشہداء حضرت حمزہ اور حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہم) کی مبارک آرام گاہوں پر حاضری نے ''**من المومنين رجال صدقوا ما عاهدو الله عليه فمنهم من قضى نحبه**'' (مطلب ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اُترے، پھر بعض تو ان

(۱) کئی واقعات امام ابن کثیرؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''البدایہ والنہایہ'': ۲۸/۳-۳۸ سے مستفاد ہوتے ہیں، ط: مکتبہ المعارف، بیروت ۱۹۸۸ء۔

میں وہ ہیں جو زندگی کی نذر پیش کر کے اس عہد کو پورا کر چکے) کی عملی تفسیروں کے اوراق سامنے کھول دیئے، مہر و وفا کے ایسے نمونے جب چشم سر کے سامنے آئیں (جن سے زیادہ بہتر چشم فلک کو بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئے) تو دل کے دریا میں تلاطم برپا ہو کر آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلنے پر تعجب کیوں ہو؟

بیر عثمان نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس ایثار و قربانی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دی جو انھوں نے یہ کنواں خرید کر وقف عام کیا تھا،(۱) اسی کے ساتھ ان کی اس بے بسی (اور اعداء کی قساوت قلبی اور ظلم و جفا کا نقشہ بھی نگاہوں کے سامنے آ گیا جب انھیں محصور کر کے اسی کنویں کے ایک قطرہ پانی تک سے محروم کر دیا گیا تھا۔(۲)

مسجد غمامہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کا دوگانہ ادا فرمایا تھا (جیسا کہ بعض کتابوں میں ملتا ہے اگرچہ پوری تحقیق نہیں ہے) یہ مسجد نبوی سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہی ہے، جامعہ اسلامیہ (مدینہ مسلم یونیورسٹی) وادی عقیق میں گورنر کے محل کے متصل وسیع احاطہ اور شاندار عمارتوں کا مجموعہ ہونے کے علاوہ اپنی اپنی خصوصیات میں پوری مملکت کے اندر ممتاز مقام رکھتی ہے، مگر اندازہ ہوا کہ ابھی تعمیر و تکمیل کے مراحل ہی میں ہے، خاص طور پر لائبریری جس کے لئے اگرچہ عمارت شاندار بن چکی ہے مگر وہ تو بالکل متوسط بلکہ کتابوں کے ذخیرہ اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے اس سے بھی کم درجہ کی نظر آئی، البتہ اقامت خانوں کی نشان اور ان میں راحت و آرام کا سامان دیکھ کر بے ساختہ ندوی عزیزوں کے سامنے اس طرح کا جملہ زبان سے نکلا '' ایسی آسائش میں کسی کو پڑھنے لکھنے اور علم کوشی کی عادت کی توفیق کامل جانا بہت ہی غیر معمولی بات ہے''۔

اس کے بعد اور ایک دن صرف اساتذہ اور ذمہ داروں سے ملاقات کرنے کی غرض سے

(۱) ترمذی، ابواب المناقب، مناقب عثمان: ۳۶۹۹، ۳۷۰۳۔

(۲) مسجد غمامہ اور دیگر مقامات مقدسہ کے حوالوں سے دیکھئے: '' آئینہ حرم'' مرتب محی الدین قادری الرزاقی (رزاقیہ کتاب گھر بانسہ ضلع بارہ بنکی)۔

جامعہ جانا ہوا تو نائب الرئیس (وائس چانسلر) شیخ محسن بن عباد اور الامین العام (جنرل سکریٹری) شیخ عمر محمد فلاتہ سے شرف ملاقات نصیب ہوا، ہر دو بزرگ بہت محبت و اخلاص اور عربوں کی روایتی گرمجوشی کے ساتھ ملے اور اظہار تعلق کی باتیں کرتے رہے، اس مختصر ملاقات ہی میں شیخ محسن بن عباد کے تیقظ اور قوت حفظ کا بھی اندازہ ہوا، ان کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور دیگر ذمہ داروں سے ملاقات اس لئے نہ ہوسکی کہ ان دنوں امتحان ششماہی کی تیاری کے لئے تعطیل چل رہی تھی، (اسی وجہ سے وہاں کے دروس میں شرکت کی تمنا بھی دل میں ہی رہ گئی) اس بار واپسی میں مسجد القبلتین (جہاں نماز پڑھتے ہوئے قبلہ بدلنے کا حکم نازل ہوا تھا) '' **واذکر غیر واحد من المفسرین وغیر ھو ، أن تحویل القبلة نزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ، وقد صلی رکعتین من الظھر ، وذلک فی مسجد بنی سلمة فیسمی مسجد القبلتین** ''(۱) کی زیارت بھی کی، یہ بات میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ عربوں میں ایک بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ (جو سارے عالم میں اور کسی جگہ ملنا مشکل ہے) کہ بڑے سے بڑا آدمی اتنی تواضع اور بے تکلفی کے ساتھ ہر چھوٹے سے چھوٹے شخص سے بھی ملتا ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ بڑا شخص ہے اور ہر شخص سے بآسانی ملاقات بھی کی جاسکتی ہے، چنانچہ اسی سے حوصلہ پا کر خیال ہوا کہ مدینہ طیبہ کی عدالت شرعیہ کے قاضی القضاۃ (مدینہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس) شیخ عبد العزیز الصالح جو مسجد نبوی کے امام اکبر بھی ہیں، سے شرف ملاقات حاصل کیا جائے، چنانچہ ایک دن بعد مغرب (غالباً ۱۹ر فروری دوشنبہ کو) ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے، موصوف توقع سے کہیں زیادہ محبت و خلوص سے ملے اور شفقت آمیز گفتگو فرمائی، ان کے تدوین و تقویٰ نیز ذکر و شغل کے نورانی آثار نمایاں ہونے کا اعتراف سب اہل نظر کو ہے، مختصر سی ملاقات میں بھی موصوف کو برابر ذکر میں مشغول دیکھا، چنانچہ ہم جیسے بے بصیرتوں پر بھی موصوف کی ان صفات کا گہرا نقش قائم ہوا اور مجلس کے بعد بھی برابر

(۱) تفسیر ابن کثیر المجلد الاول تحت الآیة '' قد نری تقلب وجھک فی السماء الخ''۔

ذکر اللہ میں مشغول رہے رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ موصوف سے ایک مرتبہ ایک عدالت کے کمرہ میں جب کہ وہ جج کی کرسی پر تھے ملاقات کی۔

اسی طرح ایک اور پر اثر دینی و علمی شخصیت استاذ عطیہ سالم سے نیاز حاصل کر کے طبیعت پر ان کی دقتِ نظر وسعت مطالعہ اور اصابت فکر کے ساتھ للّٰہیت اور تواضع کا اثر پڑا، موصوف حرمِ نبوی میں بعد مغرب (مؤطا امام مالک کا) فاضلانہ درس بھی دیتے ہیں (جس میں شرکت کی سعادت بھی راقم سطور کو ایک بار سے زیادہ حاصل ہوئی) اور عدالت عالیہ شرعیہ کے نائب القاضی (ہائیکورٹ کے جج) بھی ہیں ان کی بلند اخلاقی دیکھ کر یہ جرأت ہوئی کہ موصوف سے ہم نے عدالت میں حاضر ہونے اور اس کا طریقۂ کار دیکھنے کی فرمائش اور خواہش ظاہر کی (عزیز مکرم مولوی سجاد ندوی سلمہ اللہ کے توسط سے) جسے انھوں نے بطیّب خاطر منظور فرما لیا اور اس کے لئے (۲۴ر فروری یوم شنبہ صبح ساڑھے نو بجے کے بعد) وقت بھی طے ہو گیا، چنانچہ احقر اور مولوی سجاد سلمہ وقت مقررہ پر عدالت پہنچے تھوڑی دیر بعد استاذ موصوف بھی وہاں پہنچ کر جج کی کرسی پر تشریف فرما ہو گئے اور از راہِ عنایت اس حقیر کو اپنے برابر والی کرسی پر بٹھایا (چائے سے تواضع بھی کی) اور مقدمہ کی سماعت شروع کر دی، اس وقت دوکان کے انخلاء کا ایک مقدمہ زیر سماعت تھا اور اس کی غالباً پہلی پیشی تھی، مدعی اور مدعا علیہ کے بیانات سب کے سامنے ہی سن کر جج صاحب قریب ہی میں بیٹھے پیشکار (جسے وہاں کی اصطلاح میں ''کاتب العدل'' کہتے ہیں) کو املا کراتے رہے (اس کے بعد مجھے کارروائی دکھائی اور وہاں کا قانون انخلاء اور طریق حکم بھی زبانی بتایا) سب سے زیادہ اہم اور قابل تقلید بات وہاں کے عدالتی نظام کی سادگی اور فریقین کے عزت نفس کا لحاظ ہے، ہمارے ملک کی طرح وہاں کے جج اپنے آپ کو دوسری مخلوق نہیں سمجھتے، بلکہ حاضر عدالت ہونے والا جو شخص بھی چاہے جج سے (سلام مسنون کے بعد) مصافحہ بلا تکلف کر سکتا ہے؛ کیوں کہ جج کو مقدمہ کے کسی فریق کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے اور ان کے درمیان کسی آڑ اور روکاوٹ کا کھڑا کرنا (جیسی ہمارے ملکوں میں رہتی ہیں) ضروری

نہیں سمجھتے؛ بلکہ کرسی پر آمنے سامنے بیٹھتے ہیں، نہ وکلا کی لمبی چوڑی لاطائل بحثوں میں وقت ضائع کیا جاتا ہے اور نہ پیشی کے وقت آواز لگائی جاتی ہے (جو واقعتا فریقین کی عزت نفس پر حملہ اور گویا انھیں مجرم سمجھنے کے مترادف ہے؛ لیکن ہندوستان میں غلامی کے زمانہ کی اسی قبیح رسم کے سب مقدمہ باز ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کی قباحت کا احساس بھی جاتا رہا) بلکہ وہاں جس کے لئے جو تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے اس پر وہ حاضر عدالت ہو جاتا ہے اگر اس وقت کسی اور کا مقدمہ زیر سماعت ہوا تو دروازہ پر کھڑے شخص سے پتہ چل جاتا ہے اور وہ اطمینان سے عدالت کے اندر پڑی کرسی پر — اگر جگہ ہو گی ورنہ — باہر بیٹھ کر انتظار کرتا ہے، پھر جب جج کو فارغ پاتا ہے حاضر ہو جاتا ہے (شاید آنے والوں کی ترتیب سے ہی مقدمات کی سماعت ہوتی رہتی ہے)۔

میرے نزدیک پوری مملکت سعودیہ کی سب سے بڑی خصوصیت امن و اطمینان اور ایک کا دوسرے پر اعتماد اور عملی مساوات ہے، اس وصف کی بنا پر بہت ہی راحت اور بہت سی غیر ضروری مشغولیتوں اور زائد اخراجات سے حفاظتی انتظامات اور مقدمات کی بھر مار وغیرہ جیسے کاموں سے وہاں کے عوام کو نجات ملی ہوئی ہے، بڑی سے بڑی دوکان پر جس میں خواہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کا سامان موجود ہو — یوں ہی کپڑے کا پردہ ڈال کر بعض دوکاندار رات کو گھر جا کر اطمینان سے سو جاتے ہیں اور نماز کے لئے پردہ ڈال کر چلے جانا تو بیشتر دوکانداروں کا معمول ہے، بس اسٹینڈ یا کسی بھی عوامی جگہ پر یوں ہی فٹ پاتھ پر کسی بھی جگہ سامان چھوڑ کر چلا جانا اور گھنٹوں غائب رہنا وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں، (۱) (خود راقم سطور بھی مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ واپسی کے وقت موقف (ٹیکسی اسٹینڈ) کے فٹ پاتھ پر سامان چھوڑ کر نماز کے لئے چلا گیا اور واپس آ کر سامان جوں کا توں پایا) اسی اعتماد، اکرام ضیف اور احترام آدمیت کا ایسا اچھوتا نمونہ بھی راقم سطور نے دیکھا جس سے خوشی ہی نہیں روح کو تازگی بھی ملی، اس واقعہ کا ذکر پہلے کرنا چاہئے تھا، مگر افسوس ہے کہ اب تک

(۱) یقیناً یہ راحت نتیجہ ہے اسلامی اخلاق اور شرعی قوانین کے نفاذ کا، جس کے اجراء کی توفیق وہاں کی حکومت کو ملی ہوئی ہے۔

نہ کیا جاسکا وہ یہ کہ سعودی عرب کے ایک نہایت معزز وممتاز خاندان کے مشہور ذی وجاہت اور صاحب ثروت شخص جن کا مدینہ طیبہ میں ہی زیادہ تر قیام رہتا ہے اور وہاں ایک بڑے ہوٹل کے علاوہ ان کی شاندار رہنے کے لئے بلڈنگ بھی ہے (اس کے علاوہ ریاض وغیرہ میں بھی عمارتیں ہیں) میری مراد شیخ صالح الحصین سے ہے جو مملکت کے وزیر بھی رہ چکے ہیں اور اب بھی بہت سے بڑے اور اہم اداروں مثلاً جامعہ اسلامیہ کے رکن رکین ہیں، جدہ اسلامی بینک کی طرف سے منعقد کردہ اس میٹنگ کے اندر بھی شریک تھے، جس کے لئے راقم سطور حاضر ہوا تھا، ان کا وہاں بھی یہ طرز عمل دیکھا کہ وہ مجھ جیسے قلیل البضاعت وصغیر السن کو آتے جاتے آگے ہی رکھنے کی کوشش کرتے، پھر مدینہ طیبہ کا اپنا پتہ دے کر اصرار کیا کہ میں وہاں ان سے ضرور ملوں، چنانچہ مدینہ شریف حاضر ہونے کے بعد اس پتہ پر گیا جو موصوف نے دیا تھا، مگر اس وقت ان سے ملاقات ان کے ریاض چلے جانے کی وجہ سے نہ ہوسکی، میں اپنا ویزیٹنگ کارڈ چھوڑ آیا اور اس کی پشت پر مدینہ طیبہ میں اپنی قیام گاہ کا پتہ بھی لکھ دیا، ایک روز زیارات سے فارغ ہوکر میں قیام گاہ جو پہنچا تو معلوم ہوا کہ موصوف تشریف لائے تھے اور کوئی ڈیڑھ گھنٹہ انتظار فرماتے رہے اور عزیز مولوی احمد علی ندوی سے اپنے دولت خانہ پر میرے قیام کے لئے اصرار کرتے رہے، یہ سن کر تعجب آمیز خوشی اور اس کے ساتھ ان کی زحمت فرمانے پر ندامت ہوئی، چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اس طرح کی تلافی کا ارادہ کیا، خوش قسمتی سے اس مرتبہ ملاقات ہوگئی تو اس قدر اکرام واعزاز کا معاملہ کیا کہ مجھے حیرت کے ساتھ ندامت بھی ہوئی اور اپنے محل نما مکان میں ٹھہرانے کے لئے بہت اصرار کیا اور اس کی ترغیب میں بہت سی وجوہ ترجیح دیر تک بیان کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باصرار اس عظیم الشان مکان کی کنجی یہ کہتے ہوئے میرے حوالہ کردی کہ تم اگر مستقل نہیں ~~ٹھہرتے تو جب ضرورت ہو یہاں آجایا کرنا اور~~ یہاں موجود سہولتوں سے فائدہ اٹھالیا کرنا؛ چنانچہ موصوف کی اس غیر معمولی عنایت کی وجہ سے ایک شب ان کے دولت خانہ پر گزارنے کی عزت حاصل کی، مگر میں اس وقت وہاں پہنچا جب موصوف اپنی رات کی آرام

گاہ تشریف لے جاچکے تھے (اللہ تعالیٰ انھیں بہت بہت جزائے خیر دے اور ان کی عزت و کرامت میں روز افزوں ترقی فرمائے)۔

مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں کی خاصی تعداد ہے، ان میں سے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان حضرات نے تعلق خاطر کا اظہار کیا، جن میں مولوی سلمان صاحب شمسی ندوی (جو وہاں سینئر افسر ہیں) اور محترم بھائی طارق عسکری صاحب (ٹیلیفون انجینئر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مؤخر الذکر نے تو اپنی عنایات وکرم فرمائیوں سے غیر معمولی طور پر نوازا۔

غرضیکہ مدینہ طیبہ کے ایسے پُر کیف اور ایمان افروز ماحول میں ۹، ۱۰ دن ایسے گزر گئے جیسے چند گھنٹے اور روانگی کا وقت آ گیا، اللہ تعالیٰ کا ہزاروں ہزار شکر ہے کہ اس کی توفیق سے مسجد نبوی میں ۴۳ فرض نمازیں باجماعت پڑھنا نصیب ہوگئیں (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ میری عمر کا بھی ۴۳ سال چل رہا ہے) زیارات وآرام کے اوقات چھوڑ کر معتد بہ حصہ مسجد نبوی اور مواجہہ شریف ہی کی نورانی فضاؤں میں بسر ہوا (فالحمد للہ حمداً کثیراً) اس سفر میں اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار انعامات و احسانات ہوئے ان میں ایک بہت بڑا انعام یہ بھی ہے کہ اپنے مرشد وشیخ کی غیر معمولی شفقتیں اور توجہات بلا استحقاق واہلیت منعطف رہیں اور بعض اوقات تو حضرت والا کی شفقتوں کا عملی وزبانی ایسا ظہور ہوتا کہ یہ حقیر ندامت سے پانی پانی ہوجاتا، خاص طور پر رخصت کرتے وقت جس طرح نوازا اپنے لئے یہ حقیر اسے وسیلۂ نجات اور ذخیرۂ آخرت سمجھتا ہے (حضرت اقدس نے از راہ ذرہ نوازی اپنی تمام تصانیف بھی جو وہاں موجود تھیں مرحمت فرمائیں) اللہ تعالیٰ حضرت کے فیوض سے مستفیض ہوتے رہنے کی توفیق دے، حضرت کے فرزند ارجمند محترم بھائی مولانا طلحہ صاحب زادمجدہ اور معتمد خاص جناب محترم

قاضی عبدالقادر صاحب وصوفی اقبال صاحب (۱) وغیرہم کیا الطاف وعنایات بھی اس خادم کے حال پر بہت رہے (فجزاہم اللہ خیرالجزاء) حضرت کے معالج خاص ڈاکٹر اسماعیل صاحب کی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوا کہ اتنے عظیم اور ماہر فن ڈاکٹر ہونے کے باوجود مولوی ہی نہیں صوفی معلوم ہوتے ہیں (اور اربابِ نظر کو یہ کہتے بھی سنا گیا کہ باطن ظاہر سے بھی اعلیٰ ہے) (۲) خدا کے فضل سے مدینہ طیبہ میں دو جمعے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد ۲۴/فروری ۱۹۹۷ء کو اس محبوب ودل آویز شہر سے بادل ناخواستہ بعد عصر روانہ ہونا پڑا؛ کیوں کہ ویزا کی مدت ختم ہونے میں صرف تین روز باقی رہ گئے تھے، ۲۷/فروری کی فلائٹ سے ممبئی کے لئے رزرویشن بھی ہو چکا تھا۔

مدینہ طیبہ کی آمد کی طرح وہاں سے روانگی بھی تنہا ہو رہی تھی اور رات کے گیارہ بجے کے بعد بظاہر مکہ مکرمہ پہنچنا تھا، اس لئے ذرا فکر تھی کہ ایسے وقت سامان کے ساتھ قیام گاہ تک (جو کہ گلیوں میں تھی جہاں کسی سواری کا پہنچنا بھی ممکن نہ تھا) کس طرح پہنچا جائے گا، مگر خدا کا فضل وکرم اس موقع پر بھی شامل حال رہا کہ مولانا قاری سیف الدین صاحب ملتانی (شاگرد رشید مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہ) جن کا مستقل قیام مکہ معظّمہ میں ہے) ہم سفر ہوگئے اور مکہ مکرمہ میں میری قیام گاہ تک پہنچا کر ہی اپنے دولت خانہ تشریف لے گئے، راستہ میں ایک اور دیندار نادیدہ شخص سامان اُٹھا کر لے جانے میں معین ہوگئے (فجزاہ اللہ خیرالجزاء) بلد امین کے مکینوں کو اللہ تعالیٰ وہ ظرف اور میزبانی کا وہ جذبہ عنایت فرمایا ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آتا، کیسے ہی ناوقت مہمان آجائے وہ گرانی تو کیا محسوس کرتے، بے حد خوش ہوتے ہیں، چنانچہ ہمارے اس وقت کے میزبان قاری محمد سلمان صاحب زادمجدہ میرے ایسے ناوقت پہنچنے پر بھی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ میزبانی کے تقاضے پورے

(۱) قاضی صاحب وصوفی صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کے انتقال فرما جانے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(۲) ڈاکٹر اسماعیل صاحب حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کے خواص مسترشدین میں سے ہیں اور مجاز بھی ہیں۔

کرنے لگے (فجزاہ اللہ احسن الجزاء) اور جتنی مدت ان کے پاس قیام رہا، بہت ہی عنایت ومحبت کا معاملہ کرتے رہے اور ہر قسم کی سہولت پہنچاتے رہے، اللہ کی توفیق نے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ آمد کے موقع پر بھی ایک عمرہ نصیب فرمایا اور اس طرح اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک خاص شرف حاصل ہوگیا، قاری صاحب موصوف کا مکان حرم شریف سے قریب ہونے کی وجہ سے ہر نماز بلکہ ہر وقت کی حاضری میں بہت سہولت ہوئی۔

۲۶/فروری دوشنبہ کو حسب قرار داد بھائی اسماعیل صاحب (پسر صوفی عبدالرحمٰن صاحب) مجھے جدہ لے جانے کے لئے مکہ مکرمہ موٹر لے کر آگئے اور ظہر کی نماز حرم شریف میں پڑھ کر اور طوافِ وداع کر کے سرزمین حرم سے باحسرت ویاس روانگی ہوگئی، ادھر بھائی محمد صدیق صاحب نے (پسر صوفی عبدالرحمٰن صاحب) رزرویشن اور سفر کے دیگر تمام مراحل طے کرانے میں بہت ہی دل سوزی اور اخلاص سے کام کیا، سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی وہاں موجودگی کم سے کم اس حقیر کے لئے خداوند تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی، کہ ہر دشواری اور ضرورت کا حل نکالنے میں پیش پیش رہے اور میں بھی بے تکلف ہر ضرورت کا اظہار کر دیتا (ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے، بس خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعاء ہوں کہ وہ انھیں شایانِ شان صلہ عطا فرمائے)۔

اور پھر ۲۷/فروی ۱۹۷۹ء یوم سہ شنبہ کو وہ وقت بھی آ گیا جس میں بعد مغرب جدہ سے ممبئی کے لئے ہماری جہاز پرواز کی — اور خدا کی شان جو مسافت ہفتوں بلکہ مہینوں میں طے ہوا کرتی تھی وہ صرف چار گھنٹہ میں طے ہوگئی۔

رات کو (ہندوستانی وقت سے ڈھائی بجے ممبئی پہنچنا ہوا اور صبح ساڑھے چھ بجے والے جہاز سے جو اس دن ایک گھنٹہ لیٹ ہوگیا تھا) ممبئی سے دہلی روانگی ہوئی پونے دو گھنٹہ بعد دہلی ایرپورٹ پہنچ گئے۔

دو راتیں دہلی میں گزار کر تیسری شب ٹرین سے روانہ ہو کر اگلی صبح ۳/مارچ یوم شنبہ بخیر وعافیت لکھنؤ پہنچنا ہوگیا۔

اس طرح ٹھیک ایک مہینہ بعد پھر وہی لیل ونہار شروع ہوگئے، جس میں برسوں سے زندگی گزر رہی ہے۔

آخر میں ان دوسوں، عزیزوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے میرے آنے جانے کے وقت مختلف جگہ کے ہوائی اڈوں پر آکر، یا سفر کے کسی بھی مرحلہ میں میری خاطر تکلیف اُٹھائی، ان سب کے واسطے بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

☆ ☆ ☆

ایک مبارک سفر کی کچھ خوشگوار یادیں!

ایک خنک شام کو ’’عمرہ مبارک ہو‘‘ کی دلنواز صدا اچانک کانوں میں رس گھلتی، دل کی گہرائی میں اُترتی اور رُواں رُواں کھلاتی چلی گئی۔

ہوا یہ کہ غالباً نومبر ۱۹۸۵ء کا مہینہ تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے ساتھ راقم سطور، مسلم پرسنل لا کی ورکنگ کمیٹی کی دہلی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے، حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی، نظام الدین میں مقیم اور نماز عصر کی تیاری میں مشغول تھا، حضرت مولانا مدظلہ نماز گاہ ہم لوگوں سے پہلے پہنچ گئے تھے، راقم تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچا تو داخل ہوتے ہی ...... یہ جانفزا اور روح پرور کلمات مولانا مدظلہ نے راقم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اور استعجاب رفع کرتے ہوئے، یا اس اجمال کی تفصیل بتاتے ہوئے، فرمایا کہ ابھی ابھی جدہ سے ’’البنک الاسلامی‘‘ کے اہم کارکن کا فون آیا تھا، جس پر انھوں نے بتایا کہ ایک اہم مسئلہ (جس کی تعیین بھی کی، تفصیل آگے رہی ہے) پر غور وفکر کرنے کے لئے عنقریب ’’البنک الاسلامی‘‘ جدہ میں علماء اسلام کا اجتماع کرنے والا ہے آپ (مولانا مدظلہ) اس میں شرکت کے لئے نام دیجئے، جواباً مولانا موصوف نے از راہ حسن وذرہ نوازی راقم کا نام بتادیا۔

بس اس دن سے برابر انتظار رہنے لگا کہ دیکھئے وہ ساعت سعید کب آتی ہے، جس میں حرمین شریفین کی زیارت سے یہ گناہ گار، اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور گناہوں کے داغ و دھبے دھوکر آنکھوں کی راہ سے میل کچیل نکالے! بتانے کی ضرورت نہیں کہ انتظار کی گھڑیاں کتنی تلخ اور دراز ہوجاتی ہیں اور پھر جب ان کا طول اندازہ کے زمانی پیمانہ سے بڑھ جائے تو کرب واضطراب کا صحیح تصور وہی کرسکتا ہے جسے کبھی اس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا ہو۔

یہ مژدۂ جانفزا یا شیریں خواب، تعبیر ظاہر ہونے میں دیر لگنے کی وجہ سے جاں گسل حسرت میں تبدیل ہوتا نظر آنے لگا تھا کہ اچانک ایک تپتی دوپہر مارچ کے نصف آخر میں قاصد (پوسٹ مین) نوید مسرت (دعوت نامہ) لے کر پہنچ ہی گیا، جس کی ٹھنڈک سے دوپہر کی گرم ہوا نسیم صبح کی سی خوشگوار فضا میں بدلی محسوس ہونے لگی، کہ اسی وقت بستر استراحت چھوڑا، سفر کی تیاری کے لئے مستعد و مشغول بنا دیا، سب سے پہلا کام دعوت کی منظور جلد از جلد بھیجنا تھا، اجتماع کی تاریخ اور دعوت نامہ کے پہنچنے کے درمیان وقفہ بہت کم رہ جانے کے سبب ٹیلی گرام ہی کے ذریعہ مطلع کیا جا سکتا تھا (اسی کی ہدایت بھی دعوت نامہ میں کی گئی تھی) تاکہ اس کے بعد وہاں سے سفر کی قانونی کارروائیاں شروع کی جائیں، باہر کے سفر کا جنھیں کبھی تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان...... میں کتنا وقت لگتا اور کس قدر صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

دعوت نامہ کا جواب مذکورہ بالا وجوہ سے، اسی وقت ہی دیا جانا مناسب معلوم ہوا، مگر ایسے وقت جب کہ یہاں عام طور پر لوگ محو استراحت اور قیلولہ کی سنت کا لطف اُٹھانے میں مشغول ہوتے ہیں، کسی کو تار کا مناسب مضمون تیار کرنے کی تکلیف دینا ایک مسئلہ سے کم نہ تھا؛ کیوں کہ وہ سرور و نشاط جس سے نے راقم کے لئے آفتاب کی تمازت کو گویا چاندنی جیسا خنک بنا دیا تھا، کسی اور میں ہونا مستبعد ہی تھا، ایسے وقت بس ان مخلص اہل تعلق کی ہی طرف ذہن منتقل ہوتا یا ہوسکتا ہے جن کے آئینہ اخلاص میں تعلق کی بنا پر خوشی کا عکس و اثر منتقل ہوجانے کی اُمید ہو۔

چنانچہ اسی خیال میں گم ہوکر مخلص و کرم فرما محترم مولانا واضح حسنی ندوی صاحب کے پاس پہنچا، وہ اندازہ کے مطابق محو خواب تھے مگر شوق میں پڑے قدموں کی چاپ اور دل سے نکلے سلام کی آواز نے انھیں نہ صرف میٹھی نیند سے چھڑا دیا بلکہ حسب توقع شاید اسی خوشی میں شریک بنا کر تار کا مضمون تیار کرنے بٹھا دیا اور پھر اسی وقت ایک سعید طالب علم کے ذریعہ تار گھر بھجوا کر منزل مقصود کی طرف روانہ کر دیا، اس کے بعد گویا ''السعی منی والا

تمام عند اللہ'' کا وظیفہ زبانِ حال سے پڑھنے میں وقت گزرنے لگا، اس مرتبہ انتظار کی تلخی پہلے سے کہیں بڑھی ہوئی تھی، و آتش شوق، کی تیزی بھی فزوں سے فزوں تر ہو رہی تھی اور جوں جوں 'اجتماع' کی تاریخ قریب آرہی تھی اُمید وبیم کی کشمکش شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ ہم لمحہ گوش برآواز رہنے اور ہر آنے والے کو، نامہ بر، یا نوید آور، گمان کرنے کی سی کیفیت رہنے لگی، پھر تو وہ حالت ہوگئی جسے بیان کرنے کے لئے قرآن مجید کے معجزانہ اُسلوب ''حتی اذا ستیئاس الرسل وظنوا انهم قد كذبوا'' سے بہتر اندازِ ادا نہیں مل سکتا، اس کے بعد بڑھتے بڑھتے'' وبلغت القلوب الحناجر وتظنون بالله الظنونا'' میں پیش کئے گئے نقشہ کے مشابہ صورت ہوگئی یہاں تک کہ وہ دن بھی گذر گیا جس کے بعد وسائل سفر مہیا ہوجانے کی صورت میں بھی سفر مشکل بلکہ عملاً ناممکن نظر آرہا تھا اور اس کی رات بھی تقریباً نصف بیت چکی تھی، اب آس مکمل یاس میں تبدیل ہوتی اور یکسوئی سی ہو چلی تھی کہ اچانک کسی نے دروازہ پر زور سے دستک دی اور کون؟ کے جواب میں کہا چوکیدار!'' لیجئے تار آیا ہے'' بس اسی جملہ سے ہی آس کی سوکھی ٹہنی —— ایسا لگا کہ —— تر و تازہ ہونے لگی، تار کے مضمون سے اندازہ کا صحیح ہونا معلوم ہوا؛ کیوں کہ اس میں ٹکٹ بھیجے جانے اور فلاں ...... پرواز سے سفر کرنے کی اطلاع دی گئی تھی، مگر اب یہ فکر سوار ہوئی کہ اتنے سارے کام اتنی تھوڑی مدت (صرف دو دن) میں کس طرح انجام پا سکیں گے؛ لیکن جس ذات عالی —— قادر مطلق —— نے یاس کو آس میں بدلا تھا اسی کی مدد اور فضل وکرم سے اُمید تھی...... کسی طرح یہ رات کاٹی اور صبح ہوتے ہی کاموں کے انجام دینے کی فکر شروع کی، ایک اہم کام (امیگریشن) محترم مقبول احمد صاحب کی خصوصی عنایت وتوجہ سے لکھنؤ ہی میں دن کے دن انجام پا گیا، بقیہ کے لئے تجربہ کار مخلصین کا مشورہ ہوا کہ آج ہی رات دہلی روانہ ہوجانا ضروری ہے تاکہ کل علی الصباح دہلی پہنچ کر بقیہ کاموں کی انجام دہی ہوسکے؛ لیکن اتنی کم مدت میں دہلی کا بھی سفر —— یعنی رزرویشن ملنا —— آسان نہیں ہوتا مگر یہ مشکل بھی بہ فضل خدا کسی نہ کسی طرح جعفری صاحب اور قاری محمد موسیٰ افریقی کے ذریعہ حل

ہوگئی۔

اور صبح ہی صبح دہلی میں مخدومی ومحترمی مولانا ابوبکر حسنی مدظلہ کے دولت کدہ پر جو زائد از ربع صدی سے راقم کے لئے دہلی میں سب سے زیادہ مانوس بلکہ محبوب مسکن ہے، فروکش ہوگئے، بھاگ دوڑ کے کاموں میں مجھ جیسے ناواقف کو کسی واقف مخلص کی رفاقت کی بھی ضرورت تھی، وہ محترم مولوی قمر علی صاحب ندوی، جن میں اللہ نے خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کے ایثار سے پوری ہوگئی ویسے دہلی پہنچنے کے بعد عزیز گرامی قدر میاں مولوی خالد حسنی ندوی (زادعمرہ وکرمہ، نے تمام ضروری کاموں کی تکمیل کی مشکل ذمہ داری کو خود سنبھال لیا اور ان کی وجہ سے بسہولت ویزا وغیرہ حاصل ہوگیا (اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو اپنے شان عالی کے مطابق اجر وصلہ مرحمت فرمائے)۔

آخری مرحلہ ٹکٹ کے حصول کا رہ گیا تھا، ویزا لے کر جب 'ایر انڈیا' کے نئی دہلی آفس پہنچے تو دفتر بند ہونے میں بس کوئی آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا، اتنے مختصر وقت میں کام کردینے کا ہمارے ملک میں دفتری عملہ یوں بھی عادی نہیں ہے پھر میرے ٹکٹ کے بارے میں تعویق کا تو ایک قانونی بہانہ بھی انھیں مل گیا تھا، وہ یہ کہ "ٹکٹ لکھنؤ سے سفر کے لئے ہے اور وہیں بھیج دیا گیا ہے، لہٰذا یہاں (دہلی) سے اس وقت تک نہیں دیا جاسکتا جب تک لکھنؤ کا دفتر یہ تصدیق نہ کردے کہ وہاں سے ٹکٹ جاری نہیں کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اتنے مختصر وقت میں لکھنؤ سے رابطہ قائم کرنا محال تھا، یہاں پھر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اس طرح ظاہر ہوا کہ ایر انڈیا کے دفتر کا سب سے بڑا ذمہ دار افسر جو پہلے اسی دلیل کی بنا پر ٹکٹ نہ دینے میں اپنے ماتحت متعلق افسر کا ہمنوا تھا، تھوڑی سی گفتگو کے بعد اتنا متاثر ہوگیا کہ نہ صرف ٹکٹ دینے پر راضی ہوگیا بلکہ اس نے اپنا مسئلہ بنالیا، چنانچہ وہ خود اُٹھ کر اپنے ماتحت متعلقہ افسر کے پاس گیا اور باصرار ٹکٹ بنوایا، یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد پھر ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی کہ جب اسی افسر نے 'کمپیوٹر' سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میرے لئے لکھنؤ سے جدہ تک تمام متعلق جہازوں میں سیٹ کا رزویشن اور کنفرمیشن جدہ ہی سے کرادیا گیا ہے، اسی طرح

وہاں سے ٹکٹ اور اطمینان کی دولت لے کر مستقر واپس ہوئے، اب صرف دیارِ حبیب کا پرشوق سفیر ہی باقی رہ گیا تھا، سو وہ وقت بھی جلد ہی آ گیا کہ ۶/اپریل ۱۹۸۶ء کو علی الصباح قیام گاہ سے مخدومی مولانا ابوبکر صاحب حسنی وغیرہ کی دُعائیں لے کر ایر پورٹ کی طرف برادر عزیز سلطان الدین قمر سنبھلی سلمہ اور مکرمی ماسٹر محمد نفیس صاحب دہلوی کی معیت میں روانگی ہوئی، پھر وہ ساعت سعید بھی آ گئی کہ جس منزل کی طرف سر کے بل جانا بھی کمالِ سعادت ہے، اُدھر، شوق کے ہی نہیں، فولاد کے پروں سے پرواز شروع ہوئی اور چشم زدن میں ایسا محسوس ہوا کہ ہم سب مسافر فضائے بسیط میں معلق ہیں اور قرآن مجید کی آیت: **"الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکھن الا اللہ"** کی عملی تفسیر بلکہ تصویر بنے ہوئے۔

روانگی

جہاز کی پرواز جیسے ہی شروع ہوئی ان دُعاؤں وآیتوں کی تلاوت کی پرکیف واثر انگیز آواز گونجنے لگی جن کا سفر کے وقت پڑھنا مسنون ہے، اس منظر سے روح کو ایسی شادمانی حاصل ہوئی کہ رقص کرنے کا جی چاہا، (ادھر کچھ مدت سے سعودی ایرلائنس کی ہر پرواز کے وقت یہ معمول لازم کردیا گیا ہے، (فالحمد للہ علی ذالک) کیوں کہ جہاں عام طور پر جام وسبو کے دور چلتے اور نغمہ وسرود کے زمزمے گونجتے ہوں وہاں احادیث وآیاتِ دُعاء کی تلاوت نیز مدینہ طیبہ کی کھجور اور عربی قہوہ سے تواضع! ایک مسلمان کے لئے جس درجہ مسرت بخش بلکہ وجد انگیز بات ہے اس کا اندازہ کسی صاحب ایمان کے لئے مشکل نہیں، جہاز چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد 'ریاض پھر جدہ ہوائی اڈہ پر اُترا' جو اس کی آخری منزل تھی، ایر پورٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی لاؤڈ اسپیکر سے گونجنے والی عصر کی اذان روح پرور آواز کان میں پڑی (جو ہمارے جیسے ملک کے باشندوں کے لئے ایک تعجب خیز بات ہی کہی جاسکتی ہے؛ لیکن وہاں کا یہ معمول ہے) پھر وہیں ایک جگہ جماعت ہوتی نظر آئی، بحمد اللہ اس میں شرکت کی سعادت میسر ہوئی، نماز سے فارغ ہوتے ہی داعی (بنک) کے

نمائندہ نے جو میری تلاش میں تھے اور استقبال کے لئے آئے تھے، گرمجوشی سے مصافحہ کیا، ان کی وجہ سے کسٹم کی دشوار گذار گھاٹی بآسانی طے ہوگئی، پھر ایک موٹر میں بٹھاتے ہوئے کہا کہ ''یہ موٹر آپ کی تحویل میں رہے گی اس سے مکہ مکرمہ بھی جاسکتے ہیں، پہلے ہوٹل جانا ہے، جہاں قیام رہے گا، چنانچہ وہ موٹر فراٹے بھرتی ۱۳۰ یا ۱۲۰ کی رفتار سے جدہ کے مضافات، پھر اندرون سے گزرتی قلب شہر کے ایک شاندار اور اعلیٰ ترین ہوٹل، میر یڈیان (Meridien) کی بلند ترین ۱۴-۱۵ منزلہ عمارت کے سامنے رکی، ڈرائیور نے ہوٹل کا بلورین، دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا اور اس کی دسویں منزل کے ایک مستقل کمرہ میں قیام تجویز ہوا جو نہایت آراستہ اور تمام ضروریات ہی نہیں، کمالیات، بلکہ خاصی حد تک فضولیات سے بھرا ہوا تھا، رات کے وقت وہاں سے جدہ شہر بڑا حسین نظر آتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ چھوٹے بڑے بے شمار ستارے بلکہ آفتاب و ماہتاب (بجائے اوپر کے) نیچے چٹک اور دمک رہے ہیں، اور پوری فضا نورانی ہوگئی ہے، یوں بھی آج کا جدہ یورپ و امریکہ کے خوبصورت ترین شہروں سے آنکھیں ملاتا اور ان کی ہم سری کرتا ہے اور بلاشبہ وہاں جیسا کہ جگہ جگہ لکھا ہے، وہ ''عروس البحر الاحمر'' (بحر احمر کی دلہن) ہے۔

حرم محترم کی حاضری

آنے والا دن وہ تھا کہ ''دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے''، یعنی مکہ مکرمہ جانا تھا، جہاں کعبۃ اللہ کی دید سے آنکھیں ٹھنڈی اور بے شمار فیوض و برکات حاصل کئے جاسکتے ہیں، وہاں تنگ دامانی، کا گلہ تو ہوسکتا ہے اعطا میں کمی کا نہیں، چنانچہ وہ رات کسی طرح انتظار میں کٹی اور خدا خدا کرکے وہ صبح بھی آہی گئی جس پر ہزاروں صبحیں بلکہ پوری زندگی قربان! اور پھر وہی موٹر اور ڈرائیور گناہوں سے بوجھل اسی جسم کو کشاں کشاں لے چلے، اس 'بلد امین' اور 'بیت عتیق' کی طرف جن کی تاثیر ہی رب البیت نے امن (ہر قسم کی سزاؤں، جن میں گناہوں کی اُخروی سزاؤں، سے حفاظت بھی یقیناً شامل ہے) بتائی ہے، پھر وہ ساعت سعید بھی آئی جس کی سعادت افروزی کے بیان کا نہ قلم میں یارا ہے نہ اس کی چنداں ضرورت

(بندہ وآقا کے مابین تعلق و ربط کا اظہار یوں بھی مناسب نہیں لگتا)۔

اجتماع اور اس کی غرض

اس کے بعد وہ دن آیا جس میں وہ 'اجتماع' ہوا جس کے لئے اصلاً یہ سفر ہوا تھا، اس کی تفصیل جاننے کے لئے قارئین منتظر ہوں گے!

تمام باخبر مسلمان کم وبیش یہ جانتے ہیں کہ حج کے موقع پر ۱۰، ۱۱، ۱۲/ ذی الحجہ کو ہر سال منیٰ میں لاکھوں جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور یہ بات بھی عموماً معلوم و معروف ہے کہ ان مذبوحہ جانوروں کا گوشت اور دیگر اجزاء اکثر نہ صرف ضائع ہوجاتے تھے بلکہ ان کی بدبو سے بیماریاں پھیلنے کا خطرہ ہوجاتا تھا، جس کے سد باب کے لئے حکومت سعودیہ کو کروڑوں روپے خرچ کرنے پڑتے تھے، اس تکلیف دہ صورتِ حال سے ہر حساس مسلمان فکر مند اور اس کا آرزومند تھا کہ خدا کی یہ عظیم نعمت اور ملت کی کثیر دولت ضائع ہونے کے بجائے صحیح مصرف میں خرچ ہو اور اس سے ان لاکھوں انسانوں کی ضرورتیں رفع کرنے کا بندوبست کیا جائے جو ساری دنیا میں خود عالم اسلام میں بھی ایک ایک نوالہ اور ایک ایک بوٹی کو ترس رہے ہیں اور بھوک سے تڑپ تڑپ کر جانیں دے رہے ہیں، اسی احساس اور دردمند دلوں کی پکار، سے بالآخر سعودی حکومت ایسا حل تلاش کرنے پر مجبور اور اس میں فی الجملہ کامیاب ہوئی کہ یہ دولت بڑی حد تک ضائع ہونے سے بچ جائے اس مقصد سے چند سال پہلے حکومت سعودیہ نے 'منیٰ' میں ایک بہت بڑا مذبح ''**مجزرة المعيصم**'' بنوایا، جس میں لاکھوں جانور نہ صرف ذبح کئے جاسکتے ہیں بلکہ (انھیں پوری طرح بنا کر محفوظ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ادھر تین سال سے (۱۴۰۳ھ کے حج سے) سعودی حکومت (**البنک الاسلامی للتنمية**) جدہ کے تعاون سے اجتماعی قربانی، نیز گوشت محفوظ کرکے مختلف ملکوں میں بھیجنے کا نظم کررہی ہے، مگر اس نظام میں حاجی کو عموماً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی طرف سے قربانی کا جانور کب ذبح ہوا؟ کیوں کہ حاجی تو بنک کی طرف سے مقررہ ٹوکن خرید کر اور'

بنک‘ کو اس طرح اپنی طرف سے قربانی کرنے کا وکیل بنا کر فارغ ہوجاتا ہے، حالاں کہ حج قران وتمتع کرنے والوں کے لئے حنفی فقہ کی رو سے، یہ ضروری ہے کہ ۱۰؍ذی الحجہ کی صبح کو پہلے منیٰ آکر رمی کریں پھر قربانی، اس کے بعد سر کے بال اُتروائیں، اس ترتیب کی خلاف ورزی پر مزید ایک قربانی، دم جنایہ، حدود حرم ہی میں کرنا ضروری ہوجاتا ہے؛ لیکن جب حاجی کو یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ اس کی طرف سے قربانی کا جانور کب ذبح کیا گیا؟ تو اس کے لئے واجب ترتیب کا ملحوظ رکھنا عملاً ممکن نہیں رہتا تو اس کے ترکِ واجب کے گناہ میں مبتلا ہوجانے پھر اس پر ایک مزید قربانی واجب ہونے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے، یہ صورتِ حال حنفی حجاج کے لئے واقعی پریشان کن ہے؛ چنانچہ حنفی حجاج نے اجتماعی قربانی کے ذمہ دار ادارہ ’’البنک الاسلامی للتنمیۃ‘‘ جدہ سے بجا طور پر یہ مطالبہ کیا کہ انھیں یہ بتایا جائے ک ان کی طرف سے جانور کب ذبح کیا گیا؟ لیکن اس اجتماعی نظم میں عملاً یہ ممکن نہیں کہ ہر ایک حاجی کو اس کی قربانی کا وقت بتایا جاسکے، یہی وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کے لئے ’’البنک الاسلامی للتنمیۃ‘‘ نے یہ اجتماع کیا تھا اسی وجہ سے اس کے شرکاء میں اکثریت حنفی علماء کی تھی جو مختلف ملکوں، مثلاً، مصر شام، ترکی، ہندو پاک، بنگلہ دیش سے بلائے گئے تھے۔

ہندوستان سے تنہا راقم الحروف ہی شریک ہوا، وہاں پیش کرنے کے لئے مقالہ تیار کرلیا تھا (وقت کی کمی کی وجہ سے جلدی میں تیار کیا گیا تھا؛ چنانچہ بعض مرحلوں پر ندوی عزیزوں، مولوی حشمت اللہ سلمہ اللہ اور مولوی محمد عثمان سلمہ سے تعاون لینا پڑا (فجزاہم اللہ خیر الجزا) مقالہ خاصہ مفصل ہے جو ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی ماہنامہ ’’البعث الاسلامی‘‘ کی اشاعت ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ میں چھپ چکا ہے اور اس کے اہم حصے اُردو ماہنامہ ’’الفرقان‘‘ لکھنؤ کی جون وجولائی ۱۹۸۶ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہونے کی توقع ہے۔

☆ ☆ ☆

دار العلوم دیوبند

قیام، مقاصد، خدمات اور عام تاثرات

تیرھویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی، ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کا احترام پامال ہوچکا تھا، دہلی کا تخت حکومت صدیوں حکومت کرنے والے خاندان مغلوں سے چھین کر انھیں ذلت ونکبت کے ساتھ خاک وخون میں تڑپایا یا جلاوطن کردیا گیا تھا، اس کے بعد بلکہ اسی کے نتیجے میں دنیا ہی نہیں دین کی دولت بھی مسلمانوں سے چھین لینے کے پلان بنائے جانے لگے اور انھیں تیزی کے ساتھ روبعمل لایا جارہا تھا، ادھر دینی علم کے گہوارے اور اس کے مراکز حکومت اور اصحابِ ثروت کی سرپرستی سے محروم ہوجانے کے باعث دم توڑنے لگے تھے اور دینی تعلیم وتربیت کے اصل سرچشمے، مدارس اور دینی تربیت گاہوں کے خشک ہوجانے سے عوام سے رہا سہا دینی شعور بھی رخصت ہوچلا تھا اور اس جگہ زوال پذیر قوموں کی عادت کے موافق جاہلانہ رسوم ورواج، شرک وبدعت اور ہوا پرستی زور پکڑنے لگی تھی مسلمان الحاد و بے دینی کا شکار ہوکر اسلام سے بے تعلق ہی نہیں اس کی بیخ کنی کی کوششوں میں بھی غیروں کا ہاتھ بٹانے لگے تھے اور اسلام کے چہرۂ منور کو غلط فہمیوں اور مشرکانہ رسوم کے گرد وغبار سے ایسا تبدیل کردیا تھا کہ اس کے اصل خدوخال کا نظر آنا مشکل ہوگیا تھا، ادھر فاتح قوم پوری بیدار مغزی اور چابک دستی سے سابق حکمراں قوم اور اس کے مذہب کے ایک ایک اثر کو حرفِ غلط کی طرح مٹادینے میں لگی ہوئی تھی اور اس کے لئے منصوبے بنارہی تھی، منصوبے کے ایک جز کے طور پر لارڈ میکالے کی وہ بدنام زمانہ تعلیمی اسکیم تھی جس کے نام پر پوری تہذیب لادنے

اوراس کے ذریعہ حلیہ، چہرہ وبشرہ بلکہ ہاتھ ودل ودماغ کو بھی ’’یورپین‘‘ یا بالفاظ صحیح ’’برطانیہ پرست‘‘ بنانے کی کارروائی تیز سے تیز تر کردی گئی تھی، جس کے نتیجہ میں، ’اسکیمر‘ (Schemer) کی توقع کے عین مطابق ’’رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور دل ودماغ کے اعتبار سے انگلستانی‘‘ (افراد ہی نہیں) نسلیں پیدا ہونے لگیں تھیں، ان سب قرائن سے اندازہ ہو چلا تھا کہ ہندوستان میں بھی اسپین کی تاریخ دہرائی جانے والی ہے، مگر اچانک فیصلہ خداوندی کے طور پر ’’مردے از غیب بیروں آمد‘‘ کے مصداق حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اوران کے رفقاء کمر ہمت کس کر میدان میں آئے اورانھوں نے ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو نہ صرف تیرانے بلکہ آئندہ اس کے مستقل رواں دواں رہنے کے اسباب وتدابیر پر غور وفکر شروع کیا، یہ سب حضرات اپنے وقت کے مفکرین ہی نہیں اولیاء اللہ بھی تھے؛ چنانچہ محض ہدایت خداوندی کے تحت الہامی طور پر یہ تمام قدسی صفات اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت بقائے دین کی محفوظ ترین شکل بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانانِ ہند کے دین اوران کے قومی وملی تشخص کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستے سے ان کے دل ودماغ کی تعمیر کرکے ان کی ملی بقاء کا سامان کیا جائے، اس کی عملی صورت یہی نظر آئی کہ ایسی درسگاہ قائم کی جائے، جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اوراُسوۂ نبویہ کے مطابق مسلمانوں کی معاشرتی، تمدنی اور قومی زندگی ڈھالنے کی کوشش کی جائے؛ چنانچہ اسی اسکیم اور لائحہ عمل کے مطابق دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد جسے چھتہ کی مسجد کے نام سے آج دنیا جانتی ہے، اس میں انار کے درخت کے نیچے اس عظیم الشان پلان کی (۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء) میں ابتداء ہوئی، جس پر کڑوروں کی قسمت کا جاگنا اور صنم کدۂ ہند میں اسلام کی شمع کا روشن ہونا گویا موقوف تھا، اس وقت صرف ایک استاذ اور ایک شاگرد سے (حسن اتفاق سے دونوں ہی ’محمود‘ تھے) وہ ’’ادارہ‘‘ عبارت تھا جس کو صرف مدرسہ یا دارالعلوم نہیں دراصل آبِ حیات کا چشمہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ، عالم اسباب میں اسی کے ذریعہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر ملت کو حیاتِ نوبخشی اوراُمت

کے باعزت قیام وبقاء کا اسے ہی وسیلہ بنایا (**واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم**) گویا اس وقت وہ ایک ’’بیج‘‘ تھا جس کا مستقبل میں ایسا سایہ دار درخت ہونا مقدر تھا، جس کی چھاؤں میں سارا برصغیر ہی نہیں پورا ایشیاء بلکہ افریقہ بھی آسودگی حاصل کرے، (**كشجرة طيبة أصلها ثابت وفرعها في السماء**)۔

مقاصد

اوپر کے بیان سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ دیوبند جیسی چھوٹی اور کم آباد بستی میں مدرسہ کی بنیاد کا مقصد محض کچھ کتابیں پڑھانے اور چندسو، یا چند ہزار طلبہ کی تعلیم وتربیت کرنے والے کسی ادارہ کا رسمی قیام نہ تھا (جیسا کہ ناواقف لوگوں کو آج کل مدارس کی کثرت اورروز افزوں تعداد سے گمان ہوسکتا ہے) بلکہ ایمانی فراست اورالہامی اشاروں کی بنیاد پر اسے اسلامی قلعہ کی حیثیت سے قائم کیا گیا کہ جس میں بیٹھ کر نہ صرف علمی بلکہ عملی طور پر بھی شریعت الٰہیہ اورسنت نبویہ کی حفاظت اوراس کی اشاعت کا برگزیدہ کام اس طرح انجام دیا جائے کہ برصغیر میں صحیح طور پر اسلام کی حفاظت اوراس کے ساتھ مسلمانوں کی دینی تربیت کا خاطر خواہ انتظام ہوجائے، اور یہاں اسپین کی تاریخ نہ دہرائی جائے اورحق تو یہ ہے کہ ان چند بوریہ نشینوں اور ’’تاریک حجروں‘‘ میں رہنے، مگر روشن قلوب رکھنے والوں کی دوربین نگاہوں نے جو کچھ دیکھا یا سوچا تھا مستقبل نے اس کے ایک ایک جز کی صداقت پر واقعاتی شہادتوں کے ایسے پہاڑ کھڑے کردیئے کہ جو دیکھنا نہیں چاہتے تھے؛ لیکن بصارت اورانصاف سے بالکل محروم نہیں ہوگئے وہ بھی دیکھنے اوراس کے تسلیم کرنے پر، دبے لفظوں میں ہی سہی اعتراف کرنے پر، خود کو مجبور پاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے مقبولیت

جیسا کہ اشارۃً اوپر ذکر ہوا، یہ منصوبہ دراصل کسی انسانی عقل ودماغ کا نہیں بلکہ محض فضل خداوندی اور ہادیٔ مطلق کی رہنمائی کا ثمرہ تھا، اسی لئے اتنی معمولی سطح (کہ صرف

ایک طالب علم اور ایک استاد اور الگ سے مدرسہ کے نام پر ایک اینٹ بھی نہیں تھی ، بس خدا کے گھر اور مسجد کے صحن) پر شروع ہونے والے ادارہ نے صرف چھ سال کے مختصر عرصہ میں اتنی ترقی کر لی کہ اس میں اعلیٰ درجہ تک حدیث وتفسیر، فقہ ومعقولات وغیرہ علوم وفنون کی تعلیم ہونے لگ گئی اور ہم کو تاریخ بتانے لگی کہ ۱۲۸۹ھ میں وہاں تعلیم مکمل کر کے دستار فضیلت کے مستحق بننے والے طلبہ کے لئے باقاعدہ ایک بڑا جلسہ کیا گیا، جس میں انھیں دستار فضیلت دی گئی اور یہ جلسۂ دستار بندی، کوئی رسمی جلسہ اور اس میں دستار پانے والے، آج کل کے عام مدارس کے نام نہاد فضلاء نہ تھے، بلکہ ان میں وہ گلِ سر سبد بھی تھا (یعنی شیخ الہند، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ) جس نے علم حدیث کی بیش بہا خدمات انجام دے کر اور سنت نبوی کا مکمل اتباع کر کے وہ مقام حاصل کیا جو دنیا میں چند ہی افراد کو چودھویں صدی کے اندر نصیب ہوا ہے اور جس کے تلامیذ نے عرب وعجم میں علم وعمل، زہد وورع کے ساتھ اشاعت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی علمی اور عملی جدوجہد نیز شرح وتفسیر کی وہ مثالیں قائم کیں جن کی نظیر ادھر کی چند صدیوں میں ملنا مشکل ہے جنھیں دیکھ کر عجم کے نہیں عرب (اور وہ بھی گہوارۂ علم) کے علماء بھی بے ساختہ پکار اٹھے کہ آج یہ ہمارے ہندوستانی بھائی حدیث کی خدمات میں منہمک نہ ہوتے تو اس فن شریف کا قصہ ہی تمام ہو چکا تھا۔

دوسری طرف جس ذات کے ہاتھ میں دل ہیں اس نے ایسی گمنام اور غیر آباد سرزمین کی طرف ، لوگوں کے دل پھیرنے شروع کر دیئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے 'ویرانہ' گلستان بن گیا اور ذمہ داروں کو نہ صرف وہ چھتہ کی مسجد کہ جس میں اس کی ابتداء ہوئی تھی؛ بلکہ شہر کے وسیع وعریض جامع مسجد اور اس کے حجرے بھی تنگ پڑتے نظر آنے لگے تو قیام مدرسہ کے صرف نو دس ہی سال بعد ایک بڑا وسیع قطعۂ زمین خرید کر ۱۲۹۲ھ میں الگ عمارت بنانے کا منصوبہ تیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، مدرسہ کے قیام کی طرح اس کی جدید بناء کے موقع پر بھی غیبی اشارات اور الہامی نشانات نصرت خداوندی کا پتہ دیتے ، دل کی آنکھیں رکھنے والوں کو صاف نظر آنے لگے، بلکہ اللہ والوں کی قوت شامہ نصف صدی پہلے

ہی علم کی خوشبو سونگھ چکی تھی، (مشہور ومعتبر روایت ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کا جب خاص اس جگہ پر گذر ہوا تو انھوں فرمایا کہ "مجھے اس جگہ سے علم کی خوشبو آتی ہے") حیرت کی بات ہے کہ ایسے زمانے میں جب کہ ہوائی جہاز اور ریڈیو تو درکنار، ریل اور موٹر تک کی سواری میسر نہ تھی اور خبر رسانی کا اہم ترین ذریعہ ڈاکخانہ کا محکمہ بھی ٹھیک سے قائم نہیں ہوا تھا، نہ پریس کی طاقت ان کے ہاتھ میں تھی؛ اس وقت وہ کونسا آلہ یا ذریعہ تھا جس نے ہندوستان کے ہی گوشے گوشے میں نہیں اس سے نکل کر افغانستان (جیسے قریبی ملک کے علاوہ) چین اور روس (سائبیریا) جیسے دور دراز خطوں تک میں یہ صور پھونک دیا اور یہ خبر دے دی کہ "دوائے دردِ دل" کی ایک دکان کھل گئی ہے جہاں صدائے عام لگ رہی ہے! اور پھر کس نے اسے ایسے دشوار گذار راستوں کو طے کرنے کی ہمت بخش دی کہ اس ندائے حق پر لبیک کہتے ہوئے لوگ دیوانہ وار دوڑ پڑے! سچ تو یہ ہے کہ اگر قرآن نے صدائے ابراہیمی پر "وادئ غیر ذی زرع" کی طرف لپکنے والوں کی سچی داستان نہ سنائی ہوتی تو ہندوستان میں توحید ابراہیمی کی صدا لگانے والوں کے اس کارنامہ کی توجیہ بہت مشکل ہوتی! مزید حیرت میں اضافہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہونے لگتا (بلکہ بسا اوقات واقعات کو جھٹلانا اگرچہ ممکن نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے جھٹلانے تک پر دل مجبور کرنے لگتا) ہے کہ اس کی طرف آنے والے دنیا پانے نہیں، بظاہر کھونے اور اپنے آج کو کل پر قربان کرنے کا حوصلہ شکن بلکہ جاں گسل واقعہ کا مشاہدہ کرنے آرہے تھے، دوسری طرف ہر طرح کی ترغیبات تھیں، چمک دمک تھی اور حال ہی نہیں مستقبل بھی روشن ہونے کی اُمید بلکہ یقین دلایا جارہا تھا، لیکن اس سب کے باوجود (اس ماحول کو دیکھتے ہوئے) تھوڑی نہیں بہت سی سعید روحیں دوڑی چلی آرہی تھیں، جن کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن اللہ تعالیٰ جو کسی مخلص کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، اس نے ان کو دنیا میں بھی ایسی

ایسی عزتوں سے نوازا کہ جو دنیا داروں کے لئے بھی باعث رشک بنیں، گویا صحیح معنی میں ''فقیری میں بادشاہی'' انھیں نصیب فرمائی۔

خدمات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ایک مشہور حکیمانہ مقولہ ہے کہ ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے''، یعنی کسی ادارہ یا کارگاہ کے حسن و قبح کا اندازہ کرنے کی بہترین کسوٹی یہ ہے کہ اس کے نتائج اور ثمرات کو دیکھ کر اس کی قدر و قیمت کا فیصلہ کیا جائے، جب اس معیار پر ہم 'دارالعلوم دیوبند' کو جانچ کر دیکھتے ہیں تو ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں ایک ہی دو مسلم دینی ادارے اس سے آنکھ ملانے کی جرأت کرتے نظر آتے ہیں۔

سترہ سال پہلے دارالعلوم کے قیام پر ایک سو سال پورے ہونے کے بعد وہاں سے ایک مختصر مگر بہت معلومات افزا کتاب شائع ہوئی جس میں اس پر بہار بلکہ سدا بہار درخت کے پختہ اور شیریں پھلوں کی تعداد اور ان کی انواع کی تفصیل اس طرح پیش کی گئی ہے۔

۱۳۸۲ھ - ۱۹۶۳ء تک تعداد فضلاء

ہندوستان	۳۷۹۵	مغربی پاکستان	۱۵۱۹
مشرقی پاکستان	۱۶۷۲	برصغیر کے فضلاء کی کل تعداد	۶۹۸۶

بیرونِ ہندو پاک

سعودی عرب	۲	افغانستان	۱۰۹
روس بشمول (سائبیریا)	۷۰	چین	۴۴
برما	۱۴۴	ملیشیا	۲۸
انڈونیشیا	۱	عراق	۲
کویت	۲	ایران	۱۱
شام	۱	یمن	۱

مجموعی تعداد فضلاء غیر ممالک : ۴۳۱

۱۳۸۲ھ - ۱۹۶۳ء تک تعداد فضلاء : ۷۴۱۷

اور کل تعداد جنھوں نے قیام دارالعلوم سے لے کر ۱۳۸۲ھ تک فائدہ اُٹھایا: ۶۵۷۲۷۔

اِدھر سترہ اٹھارہ سال میں ہر جگہ کی طرح وہاں بھی طلبہ اور فضلاء کی تعداد میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اسے اگر شامل کر لیا جائے تو براہ راست مستفیدین کی ہی میزان اسّی ہزار کے لگ بھگ اور فضلاء کی تعداد سولہ ہزار کے قریب پہنچ جاتی ہے، پھر اگر ان فضلاء و مستفیدین کے کارناموں کے ساتھ ان سے بالواسطہ یا بلا واسطہ فیض اٹھانے والوں کی تعداد بھی شامل کر لی جائے تو عجب نہیں کروڑوں تک عدد پہنچ جائے!

خدمات کی انواع

لیکن صرف پڑھا لکھا کر تیار کرنا یا ملازمت کا اہل بنا دینا ہی تنہا وہ کارنامہ نہیں ہوتا جس سے کسی ادارہ کی افادیت کا صحیح اندازہ لگایا جائے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ان پڑھنے لکھنے والوں نے کتنے مفید اور تعمیری کارنامے انجام دیئے، اس پہلو سے بھی اگر دیکھتے ہیں تو دیوبند کے دارالعلوم کو بلندی کے اس مقام پر پاتے ہیں جہاں نگاہ بھی کام دینا چھوڑ دیتی ہے یہاں ہم انواع کار کے اعتبار سے صرف ایک سو سال کے فضلاء دارالعلوم کی کار کردگی کا ایک مختصر نقشہ (اعداد و شمار پر مشتمل ذمہ دارانِ دارالعلوم کا تیار کردہ) پیش کرتے ہیں اس سے دارالعلوم کے فیضانِ علم کا اندازہ لگانا آسان ہوگا:

مدرسین کی تعداد	۵۸۸۸	مصلحین و مرشدین	۵۳۶
مصنفین کی تعداد	۱۱۶۴	مفتی حضرات	۱۷۸۴
خطیب و مبلغ	۲۰۰۰	صحافی کی تعداد	۶۸۴
اطباء کی تعداد	۷۴۸		

اسلام مخالف حملوں کا جواب دے کر اسلام کی برتری ثابت کرنے والے مناظروں

کی تعداد: ۱۵۴۰۔

دارالعلوم کے فرزندوں کے قائم کردہ مدارس کی تعداد: ۸۹۳۴ ہے۔

(واضح رہے کہ یہ اعداد وشمار اٹھارہ سال پہلے کے ہیں، ان اٹھارہ سالوں میں جو اضافہ ہوا وہ الگ ہے)۔

اور پھر اس تعداد (Countity) کے ساتھ اہمیت و قیمت (Quality) کے لحاظ سے جو فہرست بنے گی وہ بھی بہت طویل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی علمی و دینی اصلاحی اور مجاہدانہ تاریخ کا منصفانہ مطالعہ کیا جائے تو مجموعی طور پر حضرت مجدد صاحبؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نیز سید احمد شہیدؒ اور (ان سب کا عطر مجموعہ یعنی سچے جانشین) دارالعلوم دیوبند کے فرزندوں کے کارنامے مل کر ہندوستان میں اسلام کی پوری تاریخ پر بھاری ثابت ہوں گے، (بالخصوص اس پہلو پر گہری نظر رکھنے کے بعد کہ ان حضرات کے لئے خدمت دین کا وہ زمانہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا جو اسلامی نقطۂ نظر سے نازک ترین دور ہے کہ اس میں دینی کام کرنا بے حد دشوار ہو گیا تھا، اس تمہید کے بعد اب کوالیٹی کے اعتبار سے بھی ایک مختصر فہرست (دارالعلوم دیوبند کے فرزندوں کی) ملاحظہ کرتے چلئے تاکہ دریائے فیض کا اندازہ کرنے میں مدد ملے۔

حدیث شریف کی خدمات

حدیث شریف کی خدمات میں دارالعلوم کے فیض یافتگان میں جن کو ایسا امتیاز حاصل ہوا کہ اسے دنیا نے تسلیم کیا، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ، امام العصر حافظ حدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادی، علامہ سد محمد یوسف بنوری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی (شارح مشکوٰۃ) مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا حبیب الرحمٰن

اعظمی، مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی (تنہا انھیں حدیث شریف کی امتیازی خدمات کے صلے امسال ''فیصل ایوارڈ'' ملا ہے مگر یہ کہ ہندوستان کے پریس نے بھی دارالعلوم سے ان کا تعلق ظاہر کرنے سے نہ جانے کیوں گریز کیا)۔

فن تفسیر میں عالمی امتیاز رکھنے والوں میں سے چند

مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب امروہوی (محشی بیضاوی)، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی (موصوف کا نام محدثین کی فہرست میں بھی آچکا ہے، اگرچہ ارادہ تھا کہ ایک نام دو فہرستوں میں شامل نہ کیا جائے، مگر مولانا عثمانیؒ کا نام مفسرین میں شامل نہ کرنا ان پر ظلم معلوم ہوا کہ ان کے مختصر تفسیری حواشی نے پورے برصغیر کے اندر سلف صالحین کے مطابق قرآن فہمی کا عمومی طور پر صحیح ذوق پیدا کیا، اس میں ان کا کوئی دوسرا شریک نظر نہیں آتا)۔

افتاء وفقہ میں جن کا کمال عالم اسلام نے تسلیم کیا ان میں کے چند نام:

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے حدیث وفقہ کی جس پیمانے پر اشاعت کی اور جتنی تعداد میں مفتی اور فقیہ سارے عالم کو دیئے اس کی نظیر ہندوستان کی پوری تاریخ میں ملنا مشکل ہے یہ جان لینے کے بعد فقہاء کی عظیم فہرست سے چند نام ملاحظہ کیجئے:

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ راقم سطور نے اس کا ارادہ کیا ہے کہ ایک نام دو فہرستوں میں شامل نہ کیا جائے حالاں کہ فضلائے دارالعلوم میں بڑی تعداد ایسے جامع صفات حضرات کی بھی ہے کہ جن کے نام ہر فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں، مگر حضرت تھانوی کا نام ہم فقہاء کی فہرست میں بھی شامل کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کے بغیر یہ فہرست کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی تھی) حضرت مولانا کفایت اللہ، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ (سابق مفتی اعظم پاکستان) حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری (سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا نواب محی الدین خان صاحب سابق مفتی بھوپال) حضرت مولانا مفتی عتیق

الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ العالی۔

مصنفین

جن کتاب کا شہرہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں اس کے باہر بھی ہے اس فہرست میں بھی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کہ جن کی مطبوعہ چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد ایک ہزار کیلگ بھگ ہے، جن میں تفسیر بیان القرآن (دس جلدوں میں) اور بہشتی زیور (گیارہ جلدوں میں) جیسی عظیم تصنیفیں بھی ہیں ان کا نام شامل کرنے پر پھر مجبور ہونا پڑ رہا ہے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، حضرت مولانا قاری طیب صاحب قاسمی مدظلہ العالی، مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا ادریس صاحب میرٹھی، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سنبھلی، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔

مصلحین

جن کے اصلاحی کارناموں نے سارے جہان کو متأثر کیا، اس فہرست میں بھی سب سے پہلا نام حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ آتا ہے کہ حضرت کو اصلاحی اور تجدیدی کارناموں ہی کی وجہ سے بجا طور پر حکیم الامت کا لقب دیا گیا حضرت صرف مصلح ہی نہیں ''مصلح گر'' بھی تھے، اس کے بعد دوسرا نام جس کے اصلاحی وتبلیغی کارناموں نے نہ صرف ساری دنیا میں لاکھوں افراد کو متأثر کیا؛ بلکہ جو ہندوستان ہی کے نہیں دنیا کے مصلحین میں صفِ اول کے اندر جگہ پانے کا بجا طور پر مستحق ہے، وہ نام ہے حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی کا (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ کاملۃ اِلی یوم القیامۃ) واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم نے اگر صرف یہی دو شخصیتیں عالم اسلام کو دی ہوتیں تو یقیناً اس کی کامیابی کے لئے کافی تھیں یہ دو کہنے کو دو فرد ہیں؛ لیکن یہ اسلامی تاریخ کے حسین وجمیل دو عنوان یا بالفاظِ دیگر دو کامیاب ادارے ہیں، اللہ ہی جانتا ہے کہ ان دو کے ذریعہ کتنوں کی

اصلاح ہوئی اور قربِ خداوندی میں مراتبِ عالیہ کے کتنے لوگ مستحق ہوئے، سچ تو یہ ہے کہ ان ہی دو کے کارناموں کی تفصیل کے لئے کوئی ایک مقالہ تو کیا ضخیم کتابیں بھی ناکافی ثابت ہوں گی۔

ان دو کے علاوہ بھی اس فہرست میں فرزندانِ دارالعلوم کے جن مبارک ناموں کو شامل کیا جاسکتا ہے ان میں بھی بکثرت ایسے ہیں کہ ایک ہی فرد کسی ادارہ کی افادیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہوسکتا ہے، مثلاً: حضرت مولانا اصغر صاحب دیوبندی، مولانا شاہ وارث حسین صاحب لکھنوی (جنھوں نے ٹیلے والی مسجد لکھنؤ میں بیٹھ کر خاص طور پر انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی جیسی اصلاح کی، اس صدی میں اس کی نظیر کم سے کم اودھ میں ملنا مشکل ہے، مولانا محمد عیسیٰ صاحب، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب امیٹھوی (خلیفۂ مجاز حضرت گنگوہی قدس سرہ) مولانا محمد حسن امرتسری، مولانا عبد الرحمٰن کیمل پوری حضرت مولانا عبد الغفور صاحب مہاجر مدنی۔

میں مبتلا لوگوں سے مناظرہ کرنے والوں، نیز دشمن اسلام طاقتوں کی طرف سے اسلام پر علمی حملوں کا جواب دینے اور اسلام کی برتری ثابت کرنے والے چند نام: مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (یہ مسلکا اہل حدیث تھے مگر حدیث دارالعلوم میں پڑھی) مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا ابولوفاء شاہجہانپوری افسوس کے جو ابھی ایک مہینہ قبل عالم خاک کو چھوڑ کر جوارِ رحمت خداوندی میں پہونچ گئے۔

دارالافتاء

دارالعلوم کا سب سے مقبول اور عوام کی ہمہ وقتی ضرورت کا پورا کرنے والا ادارہ دارالافتاء ہے جس میں ہر ماہ دس بارہ ہزار کی تعداد میں سوالات آتے ہیں ایک سو سال کی مدت میں جن سوالات کے جوابات دئے گئے ان کی تعداد دو لاکھ انہتر ہزار پان سو اکیس ہے (۲۶۹۵۲۱)۔

جنگ آزادی

میں حصہ لینے اور اسلام کی سربلندی کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے والے چند نام: مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا سیف الرحمٰن کابلی، حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا عزیز گل صاحب، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی (رحمہم اللہ) مولانا مفتی محمود صاحب وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد واضح ہو کہ تقریباً یہ سب ہی با کمال لوگ تنہا دارالعلوم دیوبند یا اسی کے طرزِ تعلیم سے تیار ہوئے۔

دارالعلوم کے عام اثرات

دارالعلوم کے ہمہ جہتی کارناموں کی اس فہرست کو کسی طرح مکمل نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ اس میں بہت سے اہم خدمات کے شعبے بیان سے رہ گئے، مثلاً تقریر وخطابت، جس میں دارالعلوم دیوبند کے فرزندوں کی جس تعداد نے کمال کا مظاہرہ کیا کوئی علمی ادارہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اسی طرح فن تدریس، کہ جو گویا دارالعلوم کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ فاضل دیوبند اور "تدریس" دو مترادف لفظ معلوم ہونے لگے ہیں، جن سے برصغیر کا گوشہ گوشہ معمور ہے اور فقہی اختلاف رکھنے والے مدارس بھی انھیں کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہیں، اسی طرح حکمت وطب کہ جس میں حکیم عبدالوہاب عرف "حکیم نابینا" جیسے عالمی شہرت اور فن پر مجتہدانہ قدرت رکھنے والے طبیب پیدا ہوئے اسی طرح اہلیت امامت وخطابت کہ جن کے دم سے ہندوستان کے بہت سے جوامع آباد ہیں؛ لیکن اسی نام تمام فہرست ہی سے اس عظیم وجلیل ادارے کی افادیت واہمیت کا اندازہ کرلینا آسان ہوگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان سے اسلامی حکومت کے زوال کے بعد اگر دارالعلوم کا وجود نہ ہوتا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت یہاں اسلام اور مسلمانوں کی کیا حالت ہوتی؟ اسلام کی صحیح شکل پہچان لینا (کتاباً نہیں عملاً) بھی ممکن ہو یا نہیں؟ اللہ عالم الغیب اور مسبب الاسباب کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور اس بات میں ذرا مبالغہ نہیں کہ دارالعلوم کی ہمہ جہتی خدمات کی بدولت اور اس کے اولین فرزندوں کی قربانیوں اور مساعی کے طفیل ہی ہندوستان کی سرزمین پھر اس قابل بنی کہ دوسری مفید دینی تحریکیں یا ادارے اپنی بساط بچھانے کے لئے میدان حاصل کرسکیں، گویا "بسمل نے لوٹ پوٹ کے میدان ہموار کردیا" اس اعتبار سے اس دور کی سبھی اسلامی تحریکیں اس کی زیر بار احسان ہیں اور یہ عظیم الشان خدمات جن پر حکومت کے خزانے بھی خرچ ہوجاتے تو کم تھے، مگر شاید یہ جان کر ناواقف لوگوں کو حیرت ہو کہ دارالعلوم کے ذمہ داروں کے اخلاص کی برکت سے یہ سب کچھ اتنی کم لاگت میں انجام پا گیا کہ جس کی تفصیل خود اسلام کا زندہ معجزہ معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس بارے میں اشارۂ غیبی سمجھنے والوں نے صرف امدادِ خداوندی ہی پر، ایسا بھروسہ کیا کہ مادی بھروسے کے قابل حضرات اور اداروں سے بے نیازی برتنا بنیادی اُصول قرار پایا؛ چنانچہ بانیٔ دارالعلوم نے ادارہ کے لئے جن آٹھ بنیادی اُصولوں کی طرف توجہ دلائی ان میں سے ایک کے بارے میں یہ لکھا:

> اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک انشاءاللہ یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رُجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی ...... القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

ایک دوسرے بنیادی اُصول کی ایک سطر اور پیش کی جارہی ہے: "سرکار کی شرکت

اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے'' خدا کا شکر ہے کہ ذمہ داروں نے بانی کی ان ہدایات کا حتی الامکان، پورا پورا لحاظ رکھا، خاص طور پر آخری ہدایت کی تو ہر دور میں اس درجہ پابندی کہ کہ اس کی بجز ایک دو کے اور نظیر ملنا ہی مشکل ہے کہ سرکاری امداد کو ہمیشہ 'شجر ممنوعہ' سمجھا اور بحمد اللہ اس کا فائدہ جو دنیا میں ظاہر ہوا سب کے سامنے ہے کہ کبھی حکومت کا ~~اثر قبول نہیں کیا اور~~ ان'' شاہینوں'' کو مقید کر لینے میں حکومت بھی کامیاب نہ ہو سکی (فالحمد للہ علی ذلک) اللہ تعالیٰ آئندہ بھی حفاظت فرمائے اور اپنا فضل و کرم شامل حال رکھے، یہ آخر میں خلاصہ مضمون کے طور پر دار العلوم کی صد سالہ مطبوعہ مختصر روداد کی چند سطریں پڑھ لینے کی زحمت اور گوارا کر لیجئے :

> دار العلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کئے جنھوں نے تعلیم تزکیۂ نفس، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں ان افراد نے کسی مخصوص خطہ میں نہیں ہند و پاک نے ہر صوبہ اور بیرونی ممالک میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک دار العلوم کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کے ہر ہر حصہ میں اس نے ایسے فرزندان رشید پہنچائے جو اس خطہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مخلوقِ خدا کو ظلمتِ جہل سے نکال کر انھوں نے نورِ علم سے مالا مال کیا۔

☆ ☆ ☆

تفسیر عثمانی پر کئے جانے والے اعتراضات کا جائزہ

تفسیر عثمانی پر کئے جانے والے تفصیلی نقد پر مشتمل مکتوب اور اس کے ساتھ منسلک نوٹ میں تفسیر مذکور کے چند حصوں پر نقد کئے گئے ہیں، ان تنقیدوں کو پڑھ کر ''تفسیر عثمانی'' پر اعتماد میں مزید اضافہ ہوا اور اس کے معتبر ترین اُردو کی تفسیر ہونے کا یقین اور بڑھ گیا؛ کیوں کہ اس کا بڑے سے بڑا ناقد (جو ظاہر ہے کہ معتقد نہیں منتقد ہے تفصیل، جوابات کے ذیل میں آرہی ہے) بس اتنے کم اور ایسے کمزور اعتراض ہی کر سکا، اُصولی طور پر یہ بات تسلیم ہے کہ انبیاء کے علاوہ ہر انسان سے خواہ وہ کتنا ہی بڑا متقن عالم ہو اس سے غلطی کا ارادی یا غیر ارادی طور پر سرزد ہوجانا مستبعد نہیں اور پھر اتنا عظیم اور ضخیم علمی کام جو آٹھ سو سے زیادہ بڑے سائز کے صفحات پر پھیلا ہوا ہو، اس میں چند فروگذاشتوں کا ہوجانا قرین قیاس ہے؛ لیکن محض اتنی معمولی سی چند فروگذاشتوں کی وجہ سے جو اتنے بڑے کام میں ناقد کو ڈھونڈھنے سے بمشکل ہی مل سکیں، اس عمل کی افادیت کم نہیں ہوجاتی اور اس کے دوبارہ؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ بار چھاپنے سے ایسا معمولی نقد مانع نہ ہونا چاہئے۔

اس تمہید کے بعد آئندہ سطروں میں ان اعتراضات یا تنقیدات کا تفصیلی جائزہ لیا جارہا ہے جو خط کے ساتھ ارسال کی گئی ہیں، **واللہ الموفق للصواب وھو الھادی الی سبیل الرشاد۔**

آگے اعتراضات کی ترتیب کے مطابق جائزہ لیا جارہا ہے۔

۱- اس تفسیر کے مطالعہ سے سماحۃ الشیخ الرئیس العام (؟) نے مجلۃ البحوث الاسلامیہ کے شمارہ (۱۵) ۱۴۰۶ھ میں منع کیا ہے (جسے ''تحذیر'' قرار دیا گیا ہے) اس ''تحذیر'' سے

راقم واقف نہیں ہے، نہ اس کے محرکات و دلائل سے، غالباً ایسا لگتا ہے کہ جس طرح آپ کو ایک نامعلوم شخص نے کچھ اعتراضات لکھ کر بھیجے ہیں، اسی طرح سماحۃ الشیخ کو بھی کسی نے بھیج دیئے ہوں گے پھر کماحقہ تحقیق کے بغیر ''تحذیر'' کا اعلان کردیا ہوگا، آپ اپنے ارسال کردہ اعتراضات کے ان جوابات سے اگر سماحۃ الشیخ کو بھی مطلع فرمادیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اپنی رائے سے رُجوع کرلیں۔

۲- اس تفسیر کا منہج اشاعرہ اور ماتریدیہ عقائد کے مطابق ہے، جو ہندوستان پاکستان کے عام علماء احناف کا مسلک ہے اور ان علماء کا مبلغ علم شرح عقائد نسفی سے آگے نہیں بڑھتا اور ان کے تقریباً تمام مدارس میں اسی کتاب پر دارومدار ہے۔

اس نقد میں تین چار باتیں کہی گئی ہیں، پہلی بات یہ کہ یہ تفسیر اشاعرہ وماتریدیہ کے منہج کے مطابق ہے دوسرا ہندوستان و پاکستان کے حنفی علماء کا یہی مسلک ہے، تیسرا ان علماء کا علم صرف شرح عقائد تک محدود ہے؛ کیوں کہ صرف یہی کتاب ان کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، یہ تینوں باتیں محل نظر ہیں، اشاعرہ وماتریدیہ کا منہج قابل اعتراض ہونا خود قابل غور ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ تمام اہل نظر اور باخبر جانتے ہیں، یہی منہج شوافع، مالکیہ اور دنیا کے عام اہل سنت کا بھی ہے اور احناف کا ہونا تو اس نقد میں بیان ہی کیا گیا ہے، یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ آٹھویں صدی تک بلانزاع تقریباً تمام اہل سنت کا پہنچ رہا ہے؛ چنانچہ اکثر کبار محدثین، فقہاء، متکلمین اسی پر رہے ہیں، اس کی تفصیل مشہور محقق، محدث ومؤرخ ابن عساکرؒ (ت: ۵۷۱ھ) کی شہرہ آفاق کتاب ''تبیین کذب المفتری فیما نسب إلی ابی الحسن الاشعری'' میں دیکھی جاسکتی ہے تو ایسے مسلک کو جو قرون اولیٰ میں بھی جمہور اہل حق کا رہا ہو قابل نقد واعتراض قرار دینا خود ہی قابل اعتراض ہونا چاہئے، دوسری بات یہ کہ نقد مذکور سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ مسلک صرف علماء احناف کا وہ بھی برصغیر کے اندر ہے؛ حالاں کہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، دوسری صدی بلکہ پہلی صدی کے جمہور اہل حق سے لے کر آج تک کے جمہور کا یہی مسلک رہا ہے اور پھر اعتقادی مسائل میں حنفی، شافعی جیسے مکاتبِ فقہ کا اختلاف اثر

اندازنہیں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ''عقیدۂ طحاویہ'' جو یقیناً ایک ممتاز اور متصلب حنفی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ اس میں جگہ جگہ امام ابوحنیفہؒ کا نام لے کر ان کے اقوال، متعلقہ عقائد مذکور ہوئے ہیں، وہ کتاب سارے عالم میں (بشمول سعودی عربیہ اور سلف کی طرف انتساب کرنے والے) تمام اہل حق کا مرجع بنی ہوئی ہے، شاید یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ امام ابوالحسن اشعریؒ خود کو امام احمد بن حنبلؒ کا پیرو وترجمان سمجھتے و کہتے تھے، اس کی صراحت خود انھوں نے (اپنی کتاب الابانۃ: ۸ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت اور التبیین: ۱۶) کی ہے، (دیکھئے: التبیین: ۱۶) لیکن جیسا کہ شروع میں مذکور ہوا، انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی بھی معصوم عن الخطاء نہیں اور (حضرت امام مالکؒ کے بقول) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر ایک کی بات رد وقبول دونوں کے لائق ہوسکتی ہے، اسی بنا پر یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کا کوئی قول یا چند اقوال محل نقد ہوں؛ لیکن سوچا جائے کہ اُمت میں کون ایسا گذرا ہے؟ یا موجود ہے؟ جس کا کوئی قول یا چند اقوال نقد ونظر کے لائق نہیں؟ تو کیا اس بنا پر ہر عالم فقیہ، محدث کو قابل ملامت قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور ہر ایک کی ہر بات نا قابل اعتناء سمجھی یا ٹھہرائی جاسکتی ہے؟ یا ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' (جو صحیح ہو قبول کرلو اور جو غلط ہو چھوڑ دو) والا اُصول اختیار کیا جائے؟ پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مفسر عثمانی نے ایسی آیات (صفات وغیرہ) کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے سلف کا مسلک اختیار کرنے کی جگہ جگہ صراحت کی ہے، جس کا ذکر آگے اپنے موقعہ پر آئے گا۔

تیسری بات کہ علماء ہند کا مبلغ علم صرف شرح عقائد نسفی تک ہے، یہ بات وہی کہہ سکتا ہے کہ جو علماء ہند، یہاں کے مدارس اور نصاب تعلیم جو مختلف ادوار میں رہا، سے بالکل واقف نہ ہو، سب سے بڑھ کر یہ کہ مفسر جلیل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت اور ان کے مرتبہ سے یا تو بالکل بے خبر ہو یا ان سے شدید عناد رکھنے کے باعث ''عین السخط'' کے مرض کا شکار ہو، سب جانتے ہیں کہ ان کی جلالت شان ہی کی وجہ سے انھیں سب سے بڑی اسلامی مملکت کا شیخ الاسلام بنایا گیا، جس زمانہ اور جس درسگاہ اور جن اساتذہ سے علامہ عثمانی کا

تعلق رہا ہے ان سب کا امتیاز، فقہ حدیث اور دیگر علوم نافعہ اسلامیہ میں تبحر پیدا کرنے کے ساتھ تمام فرق باطلہ کی تردید تھا، اس لئے شرح عقائد نسفی کے علاوہ متعدد معتبر کتابیں، (۱) مثلاً شرح مواقف، خیالی، شرح ملا جلال، مسامرہ، عضدیہ، عقیدۂ طحاویہ، فقہ اکبر اور نہ جانے کتنی کتابیں باقاعدہ نصاب میں یا مطالعہ میں رہتی تھیں اور پھر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تصانیف پر جس کی نظر ہے وہ اس کی شہادت دے گا کہ علامہ موصوف کا مطالعہ اتنا متنوع اور وسیع تھا کہ ان کے زمانہ میں انھیں دستیاب ہونے والی ہر نافع کتاب ان کی نظر سے گویا گذر جاتی تھی، چنانچہ متکلم اسلام مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ''عبقات'' پر بھی پوری طرح حاوی تھے (اور اس کے اہم حصے اپنی قیمتی کتاب فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں نقل کئے ہیں) علامہ عثمانیؒ نے جس درسگاہ میں تعلیم حاصل کی اس میں آج بھی ''شرح عقائد'' کے علاوہ متعدد کتب اس موضوع کی داخل درس ہیں (مثلاً مسامرہ) یہاں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ ''شرح عقائد نسفی'' کا ماتن صرف حنفی ہے؛ لیکن شارح شافعی ہے (غالباً معترض اس سے بے خبر ہے)۔

۳- مفسر کا مذہب، فروع میں، مذہب حنفی ہے۔

گویا ناقد کے نزدیک یہ بھی قابل اعتراض بات ہے کہ کسی کا مذہب فروع میں امام ابوحنیفہؒ والا ہو، یہ اعتراض یا نقد تو ایسا ہے کہ اس بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے؛ کیوں کہ سارے اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ کم سے کم ائمہ اربعہ کے مسالک (مجموعی طور پر) حق ہیں اب اگر کوئی شخص کسی ایک مسلک پر چلنے کو قابل اعتراض اور ناجائز قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اہل سنت کے دائرہ سے باہر ہونے کا اعلان کررہا ہے؛ کیوں کہ بقول

(۱) آج اگر چہ ان کتابوں کے نام سے بھی مدارس عربیہ کے طلبہ کم واقف ہیں، مگر ایک زمانہ میں یہ معروف تھیں، شرح مواقف سے مراد قاضی عضد الدین ایجی کی معروف کتاب ''مواقف'' کی شرح (سید شریف جرجانی) اور ملا جلال سے مراد قاضی عضد کی ہی ''عقائد عضدیہ'' کی شرح محقق محمد بن اسعد المعروف بملا جلال دوانی ہے، خیالی شرح عقائد نسفی کا بڑا ہی مشکل اور مشہور حاشیہ مولانا احمد بن موسیٰ معروف بہ ''خیالی'' ہے، ''مسامرہ'' محقق ابن ہمام کی

تصنیف ''مسایرہ'' کی شرح عقیدہ طحاویہ، امام طحاوی کی معروف کتاب ہے (جس پر سب اہل حق متفق ہیں) ''فقہ اکبر'' امام اعظمؒ کی طرف منسوب معروف کتاب ہے۔

امام ولی اللہؒ پوری اُمت اسلامیہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کے جواز کی قائل ہے۔ (حجۃ اللہ: ۱/۱۲۱)

۴- اس (تفسیر عثمانی) میں کمزور روایات اور اسرائیلیات ہیں؛ لیکن یہ اعتراض یا نقد وہ ہے جس سے کوئی بھی قابل ذکر ولائق اعتماد تفسیر مشکل سے خالی ملے گی، بشمول تفسیر ابن کثیر، فتح القدیر (للامام الشوکانی) طبری، بغوی، بیضاوی؛ بلکہ کسی بھی مفصل تفسیر کو اس جرم سے (اگرچہ جرم ہے) غالبًا پاک نہیں کہا جاسکتا تو کیا اس بنیاد پر تمام تفسیروں کی اشاعت وطباعت بند کردی جائے؟ یا سب کو بند کرنے کا مشورہ دینا درست ہوگا؟

مزید برآں یہ کہ ''ناقد'' صاحب اس دعویٰ کے ثبوت میں صرف دو ہی واقعے ذکر کرسکے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ صرف انھیں دو ہی مل سکے ہیں، ہم ان موقعوں کی نشاندہی کے وقت بتائیں گے کہ اور کس کس مفسر نے یہ واقعے ذکر کئے ہیں، نیز یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ''ضعیف'' احادیث کا ذکر ایسی قابل نقد بات نہیں کہ جو آج ہی موضوع بحث بنی ہو اور اس کا ارتکاب مفسر عثمانیؒ نے پہلی بار کیا ہو، اس پر نہ جانے کتنے علماء نے بالتفصیل کلام کیا ہے جو کسی باخبر پر مخفی نہیں اور یہ الزام بھی کوئی وزن نہیں رکھتا کہ اس میں ''اسرائیلیات'' ہیں، کیوں کہ حدیث صحیح (جسے صحیحین میں بھی دیگر کتب معتبرہ سمیت تخریج کیا گیا ہے) میں آتا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج۔ (۱)

البتہ ان کی باتوں کے بارے میں یہ ہدایت دی گئی ہے:

ماحدثکم اھل الکتاب فلا تصدقوھم ولا تکذبوھم۔ (۲)

معترض کے نزدیک شاہ عبدالقادرؒ کی قرآن فہمی سے استفادہ بھی جرم ہے، حالاں کہ شاہ عبدالقادرؒ کی شخصیت سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان سے زیادہ بہتر اُردو

ترجمہ ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا اور اس کا اعتراف تمام اہل نظر نے کیا ہے؛ لیکن کوئی

(۱) ابوداؤد، کتاب العلم، باب الحدیث عن بنی اسرائیل، بخاری، کتاب الاحادیث۔

(۲) حوالۂ سابق، باب روایة اهل الكتاب.

اس سے بےخبر ہو تو بجز اس کے کیا کہا جائے کہ وہ وسعت نظر پیدا کرے۔

۵- اس نمبر کے تحت بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں، پہلا اعتراض ''**ایاک نعبد**'' کے تحت لکھے تفسیری نوٹ پر ہے، حالاں کہ معترض نے عربی میں اسی نوٹ کی جو ترجمانی کی ہے اس پر غور کرنے اور عبارت کا مفہوم پوری طرح سمجھنے کے بعد اعتراض کی گنجائش نظر نہیں آتی، معترض نے شاید اسی اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے صرف عربی میں اس نوٹ کا خلاصہ مفہوم پیش کرنے پر اکتفاء کیا، کوئی صاف اعتراض نہیں کیا؛ البتہ اس عربی عبارت میں غیر مستقل کے بعد ''**للاعانة**'' بڑھانا چاہئے، تب ہی مفسر کا پوری طرح مفہوم واضح ہوگا؛ لیکن اس صورت میں اعتراض کی قطعاً لفظی طور پر بھی گنجائش نہیں رہ جائے گی، غالبًا اسی مصلحت سے معترض نے ''للإعانة'' نہیں لکھا، شاید معترض بغیر لفظ وزبان استعمال کئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نوٹ سے توسل کی بو آرہی ہے، اگر یہی مطلب ہے تو اس بارے میں تفصیلی بحث آگے ''**وکانوا من قبل یستفتحون الخ**'' کے تحت آرہی ہے، اور اگر مطلب یہ ہے کہ ''غیر اللہ'' سے کسی بھی طرح کی استعانت ممنوع ہے تو ان سینکڑوں حدیثوں اور قرآن مجید کی بہت سی آیات سے لاعلمی یا اغماض اور عدم اہتمام کے بغیر ایسا قول اختیار کرنا اور اس بنا پر اعتراض کرنا ممکن نہ ہوگا، ایسی صورت میں معترض کا یہ نقد خود تنقید کا نشانہ بننے کے لائق ہے نہ کہ وہ جس پر اس نے محض اس بنیاد پر تنقید کی ہے، طوالت کی وجہ سے ان آیات واحادیث کا حوالہ نہیں دیا جارہا ہے جن میں غیر اللہ سے استعانت اور غیر اللہ کی اعانت کا ذکر ہے، (۱) لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت اور اس کی طرف سے اعانت خالق کی شان کے لائق ہوتی ہے، (یا ہوگی) اور غیر اللہ سے استعانت

اور اس کی اعانت مخلوق کی حیثیت کے مطابق دونوں کی حقیقتوں میں اتنا فرق ہے کہ لفظی اشتراک کے

(۱) مثلاً:''استعینوا بالصبر والصلوٰۃ''(البقرۃ:۴۵)''تعاونوا علی البر والتقویٰ''(المائدۃ:۲) ''فاعینونی بقوۃ''(الکہف:۹۵)اور ایسی احادیث شریفہ تو بے شمار ہیں جن میں غیر اللہ سے استعانت اور اس سے اعانت کا ذکر ملتا ہے۔

علاوہ اور کوئی مشارکت نہیں ہے، جس طرح ان صفات میں جو کہ لفظی پر خالق ومخلوق دونوں میں مشترک ہیں۔

اسی نمبر پانچ کے تحت دوسرا نقد یہ کیا ہے کہ ''فاخرجھما مما کانا فیہ'' آیت کے تحت شیطان کے جنت میں مور اور سانپ کے ساتھ جانے کا ''قصہ داہیہ'' ذکر کیا ہے، مگر یہ نقد ایسا ہے کہ اس سے شاید کوئی مفسر بمشکل بچ سکے، لیجئے سلفیوں کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر اور مستند عالم (علامہ شوکانیؒ) کی تفسیر ''فتح القدیر'' میں بھی اسی آیت کے تحت یہ قصہ بہت صراحت کے ساتھ منقول ہے، پھر لطف یہ ہے کہ اس پر سند کے یا اور کسی اعتبار سے نقد بھی نہیں کیا ہے(۱) (اسی آیت کے کلمہ ''فأزلھما'' کی تفسیر) بلکہ فتح القدیر میں نقل کردہ یہ قصہ تفسیر عثمانی میں مذکور قصہ سے بھی زیادہ مستغرب ہے، اسی آیت کے تحت تفسیر ابن کثیر میں بھی یہ قصہ اجمالاً مذکور ہے اور اس کی تفصیل آئندہ بیان کرنے کا وعدہ بھی ہے، علاوہ ازیں مفسر عثمانیؒ نے یہ واقعہ کہتے ہیں کے بعد ذکر کیا ہے، گویا مفسر نے ''دروغ برگردن راوی'' کی طرف اشارہ کردیا ہے، اسی نمبر پانچ کے تحت چوتھا اعتراض یہ مذکور ہے کہ مفسرؒ نے ''وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا'' کے تحت یہود کی یہ عادت نقل کی ہے کہ وہ بعثت نبوی سے پہلے اس طرح دُعاء کیا کرتے تھے ''اللھم انصرنا بطفیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم والکتاب الذی ینزل علیہ'' اس نقل پر معترض کو یہ اشکال ہوا ہے کہ اس سے ''توسل بذات النبی'' کا اشارہ نکلتا ہے؛ لیکن اگر اشارہ نہیں بلکہ صراحت بھی نکلتی ہو تو اس میں مفسر پر کیا اشکال؟ مفسرؒ اپنے عقیدہ تو بیان نہیں

کر رہے ہیں؛ بلکہ یہود کا بتا رہے ہیں اور یہ واقعہ اجمال وتفصیل کے فرق کے ساتھ متعدد معتبر تفسیروں میں ملتا ہے، مثلاً تفسیر ابن کثیر وفتح القدیر میں (اجمالاً) اسی آیت کے تحت دیکھا جاسکتا ہے، یہود (بنی اسرائیل) کی باتوں کے نقل کرنے کا کم سے کم جواز حدیث صحیح سے ثابت ہے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ حدیث نبوی میں امر کا صیغہ آیا ہے ''حدثوا''، تفصیلی حوالے (مع الفاظ حدیث)

(۱) دیکھئے: فتح القدیر: ۱/۷۰، ط: دارالفکر للطباعتہ، النشرو التوزیع۔

اوپر نمبر چار کے تحت گذر چکے ہیں، ہوسکتا ہے یہود کے یہاں اس طرح کا ''توسل'' مشروع ہو، جب آخری شریعت سے قبل سجدہ لغیر اللہ (یا إلی غیر اللہ) تک مشروع تھا تو پھر ''توسل'' کا مشروع ہونا اچنبھے کی بات نہیں، علاوہ ازیں توسل یعنی دُعاء کی قبولیت کا امکان بڑھانے کے لئے کسی نیک عمل کے یا عمل صالح کے عامل کے واسطہ سے دُعاء کرنا اور پھر ان کا قبول ہونا احادیث صحیحہ میں مذکور ہے، خود بخاری میں بھی کتاب الانبیاء کے اندر (جلد اول: ۴۹۳ طبع ہند) مذکور ہے، نیز استسقاء کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کبار صحابہ کی موجودگی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو واسطہ بنانا بھی صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے، بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں:

اللھم انا کنا نتوسل الیک نبینا صلی اللہ علیہ وسلم
نتسقینا و انا نتوسل الیک بعم نبینا فاستقنا۔ (۱)

پھر اس دُعاء کے قبول ہوجانے کا ذکر بھی اسی روایت میں ہے (بخاری، ابواب الاستسقاء: ۱/۱۳۷) اور اسی صفحہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ شعر بھی منقول ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے: ''وابیض یستقی الغمام بوجھہ'' اس کا مطلب بھی ذاتِ نبوی سے توسل کے علاوہ اور کیا ہے؟ اس روایت کے انداز سے یہ بھی مفہوم نکلتا یا نکل سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس شعر کو وفات نبوی کے بعد بھی پڑھتے تھے، اگر یہ مفہوم نکالنا صحیح ہے تو بعد از وفات بھی اسی روایت سے ذاتِ نبوی سے توسل کا اثبات ہونا ظاہر

ہے، یوں بھی ذات سے توسل کا مطلب اس کے اعمال صالحہ سے توسل ہی ہوتا ہے (اسی لئے کوئی بھی شخص کسی فاسق وفاجر کے حوالہ یا واسطہ سے دُعاء نہیں کرتا) تو اعمال صالحہ موجود ہو یا وفات پاچکا ہو؛ کیوں کہ عمل صالح کی تاثیر یکساں رہتی ہے؛ بلکہ وفات کے بعد بڑھ جاتی ہو تو تعجب نہیں۔

اسی نمبر پانچ کے تحت تیسرا اعتراض یہ ہے (غلطی سے پہلے چوتھے اعتراض کے بارے میں گفتگو ہوگئی) کہ :

(۱) بخاری، ابواب الاستسقاء۔

آیت ''**انی جاعل فی الارض خلیفة**'' کے تحت (تفسیر عثمانیؒ میں) آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ کہہ دیا گیا ہے، حالاں کہ اس جرم میں (اگر یہ جرم ہے) تو صاحبِ تفسیر عثمانی تنہا نہیں ہیں، کیوں کہ دوسرے بہت سے مفسرین نے بھی یہی کہا ہے، مثلاً ساتویں صدی کے مشہور مفسر اُصولی، متکلم وشارح حدیث ابوالخیر عبداللہ بن عمر المعروف بالبیضاوی نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں جو تفسیر بیضاوی کے نام سے معروف ہے کہا ہے کہ :

والمراد به آدم عليه السلام لأنه كان خليفة الله تعالىٰ في أرضه وكذلك كل نبي استخلفهم في عمارة الارض وسياسة الدنيا وتكميل نفوسهم وتنفيذ أمره فيهم لا لحاجة به تعالىٰ إلى من ينوب به بل لقصور المستخلف عليه عن تبول فيضه وتلقي أمره بغير وسط ولذلك لم يستنبئ ملكا .

اس تفسیر سے وہ اشکال بھی رفع ہوجاتا ہے جو'' خلیفۃ اللہ'' کی تعبیر سے بادی النظر میں پیدا ہوتا ہے اور بات صاف ہوجاتی ہے کہ خلیفۃ اللہ ہونے کے معنی وہ نہیں ہیں جو کسی مخلوق کے خلیفہ ہونے کے ہوتے ہیں (اور اسی لئے خلیفۃ اللہ کہنے میں اشکال ہوتا تھا) اس

کی (لفظ خلیفہ کی) مزید وضاحت قرآنی لغات کے مسلم ماہرہ امام راغب اصفہانی کے کلام سے ہوتی ہے، وہ اپنی مایہ ناز کتاب ''المفردات فی غریب القرآن'' میں ''خلف'' کے تحت لکھتے ہیں :

والخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه ...... واما لتشريف المستخلف وعلى هذا الوجه الأخير استخلف الله اولياءه في الأرض قال تعالىٰ هو الذى جعلكم خلائف في الأرض ...... وقال ويستخلف ربى قوماً غيركم الخ ، والخلائف جمع خليفة .

اس سے معلوم ہوا کہ خلیفۃ اللہ میں اللہ کی طرف نسبت ایسی ہی ہے جیسی کہ'' ناقۃ اللہ'' اور'' روحی'' میں یا'' روح منہ'' وغیرہ میں ہے، تو جب ناقۃ اللہ اور روح اللہ کی تعبیر میں مضائقہ نہیں تو خلیفۃ اللہ میں کیوں ہو؟ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ قرآن کریم میں استخلاف کی نسبت'' ربی'' کی طرف صاف الفاظ میں بھی آئی ہے۔(**ویستخلف ربی**)

اسی نمبر پانچ کے تحت پانچواں چھٹا اور ساتواں اشکال صرف اس بات پر ہے کہ مفسر نے مذہب حنفی کیوں نقل کردیا؟ اور آیت کی تشریح وتفسیر میں ایسا پہلو کیوں نہ اختیار کرلیا جس سے مذہب حنفی کی تردید ہوتی۔

غور کیا جائے کہ یہ بھی کیا کوئی جرم ہے؟ اگر ہے تو تمام مذاہب کے علماء تفسیر نے اس کا ارتکاب کیا ہے، اگر تفسیر عثمانی کے دوبارہ شائع ہونے سے مانع بننے کے لئے یہ وجہ کافی ہے تو پھر کوئی بھی ایسی تفسیر شائع نہ ہونی چاہئے جس میں مفسر نے اپنے مسلک کی رعایت کی ہو اور اپنا مسلک بیان کیا ہو! رہا ان مسائل کا جو ان مواقع پر حنفی فقہ کے تفسیر عثمانی میں بیان ہوئے، راجح اور مؤید بالدلیل ہونا سو اس کا بیان مفسرؒ کا معمول نہیں ہے، کیوں کہ یہ کوئی مفصل ضخیم تفسیر نہیں ہے، بلکہ مختصر نوٹ ہیں اس لئے اس کا نام'' حواشی'' ہے نہ کہ تفسیر اور اسی اختصار کی وجہ سے اس تفسیر عثمانی میں دوسرے فقہاء کے مسالک بیان نہیں کئے گئے، حنفی

مسلک کے دلائل ترجیح اور دوسرے مسالک کا بیان متعدد تفسیروں میں ملتا ہے، مثلاً امام جصاص رازی کی تفسیر ''احکام القرآن'' میں اور پھر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جس زبان میں یہ تفسیر لکھی گئی ہے اس کے سمجھنے اور اس زبان (اُردو) میں قرآن مجید کی تفسیر پڑھنے والے مسلمانوں کی غالب تعداد کسی مسلک کی ہے؟ بلا شبہ و بلا مبالغہ اُردو میں قرآن مجید کی تفسیر پڑھ سکنے والے مسلمانوں کی تعداد فرقۂ شیعہ کو چھوڑ کر، ننانوے فیصد حنفی ہے، ایسی صورت میں مفسر عثمانیؒ، حنفی مسلک کی رعایت نہ کرتے تو کس مسلک کی رعایت کرتے؟ (جب کہ وہ خود بھی علی وجہ البصیرۃ والتحقیق حنفی تھے) اس بارے میں وہ باتیں بھی پیش نظر رکھنی چاہئے جو نمبر تین کے ذیل میں بیان ہوئیں۔

اسی نمبر پانچ کے تحت آٹھوں نقد آیت ''وقالت الیھود یداللہ مغلولۃ'' سے متعلق نوٹ پر کیا گیا ہے، مگر معترض کی دیانت دامانت دیکھئے کہ اس مفصل اور نہایت مفید علمی نوٹ کا پورا ترجمہ نہیں دیا؛ بلکہ اس کا جستہ جستہ ترجمہ پیش کیا ہے اور مزید کمال یہ کہ کوئی صاف اعتراض نہیں کیا اور نہ یہ واضح کیا کہ آخر معترض کو کس بات پر اعتراض ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ قابل تعجب بلکہ لائق ملامت بات یہ کی کہ شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے بیان کردہ نکتہ کو جسے مفسر نے نکتہ ہی کے طور پر ذکر کیا ہے، نہ کہ تفسیر کے طور پر اسے اس طرح ذکر کیا ہے جیسے مفسر کے نزدیک وہی اس آیت کی اصل تفسیر ہو!

یہاں ہم پہلے پورا نوٹ ذکر کرتے ہیں جس سے مفسرؒ کی پوری بات سامنے آجائے، پھر منصف مزاج قاری پر چھوڑ دیں گے کہ وہ خود فیصلہ کرلے کہ آیا اس نوٹ میں کوئی بات قابل اعتراض یا مسلک اہل حق سے ہٹی ہوئی ہے یا نہیں، اس کے بعد ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ معترض صاحب دراصل کہنا کیا چاہتے ہیں؟ پھر اس کا جائزہ لیں گے۔ (انشاء اللہ)

تفسیری نوٹ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل کتاب کے قلوب ان کی شرارت، کفر وطغیان ...... وغیرہ کی ممارست سے اس قدر مسخ ہوگئے تھے کہ بارگاہِ ربوبیت میں گستاخی کرنے سے بھی انکو کچھ باک نہ ہوتا تھا......حق تعالیٰ کی جناب میں بے

تکلف ایسے واہی تباہی کلمات بک دیتے تھے جنھیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، کبھی کہتے ''ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء'' کبھی ''ید اللہ مغلولۃ'' (خدا کا ہاتھ بندھ ہوگیا) اس سے مراد یا تو وہی ہوگی جو ''ان اللہ فقیر'' سے تھی کہ خدا معاذ اللہ تنگ دست ہوگیا......اور یا ''غل ید'' کنایہ بخل وامساک سے ہو......بہر حال کوئی معنی لو اس کلمہ کفر کا منشاء یہ تھا کہ جب تمرد وطغیان کی پاداش میں حق تعالیٰ نے ان ملاعین پر ذلت ونکبت...... مسلط فرمادی تو بجائے اس کے کہ اپنی سیہ کاریوں پر متنبہ اور نادم ہوتے اُلٹے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخیاں کرنے لگے......احمق اتنا نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کے خزانے تو لامحدود...... ہیں اگر معاذ اللہ اس کے خزانہ میں کچھ نہ رہتا......تو دنیا کا نظام کس طرح قائم رہ سکتا تھا اور جو روز افزوں عروج وفروغ پیغمبر علیہ السلام اور ان کے رفقاء کا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ کس کے خزانہ اور دست کرم کا رہین منت ہے؟ لہٰذا تم کو سمجھنا چاہئے اس کا ہاتھ بند نہیں ہوا ہے؛ البتہ گستاخیوں اور شرارتوں کی نحوست سے خدا کی جو لعنت اور پھٹکار تم پر پڑ رہی ہے اس نے تمہارے حق میں خدا کی زمین باوجود وسعت کے تنگ کردی ہے اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے اپنی تنگ حالی کو خدا کی تنگ دستی سے منسوب کرنا تمہاری انتہائی سفاہت ہے۔

پھر اس نوٹ کے بعد اگلا نوٹ (ایک چھوڑ کر) وہ ہے جس کے ناقص حصہ کا مفہوم اعتراض کے طور پر نقل کیا گیا ہے ــــ قطع نظر اس سے کہ نوٹ کا مکمل ترجمہ دیا جاتا تو کوئی اشکال ہی نہ رہتا، معترض نے جتنا حصہ ترجمہ میں دیا ہے اس پر بھی کیا اشکال ہے؟ اس میں یہی تو بیان ہوا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے مخلوق کی طرح جسم واعضاء نہیں ہیں، تو کیا معترض کے نزدیک یہ بات قابل نقد ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ معترض کے نزدیک خداوند تعالیٰ کے جسم واعضاء مخلوق جیسے ہیں اس عقیدہ کی رو سے تو معترض دائرۂ اسلام سے یا کم سے کم دائرۂ اہل حق سے ہی خارج ہوجاتا ہے تو پھر اس کے کسی اعتراض یا نقد کی اہمیت ہی کہاں رہ جاتی ہے! اس مسئلہ پر مزید گفتگو آگے آرہی ہے۔

اسی نمبر پانچ کے تحت نویں اعتراض کا ذکر معترض نے مفسر کے نوٹ کا طویل اقتباس (کا ترجمہ) پیش کر کے کیا ہے ، اگر چہ اس طویل اقتباس میں بھی مفسرؒ کی بعض عبارات کا مفہوم نہیں آ سکا ہے؛ لیکن بایں ہمہ جتنا کچھ اعتراض کے طور پر ذکر ہوا ہے اس پر امعانِ نظر سے غور کرنے کے بعد، مفسرؒ کی خداداد بصیرت، علمی وسعت، دقتِ نظر اور نازک بحث کو آسان پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کی غیر معمولی قدرت کا نقش جمیل ہر منصف مزاج اور تفاسیر نیز علم کلام کے مباحث پر نظر رکھنے والے پر قائم ہو جاتا ہے؛ لیکن عجیب بات ہے کہ یہی ہنر معترض کی نظر میں عیب بن گیا، اس اقتباس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو عام اہل سنت کے مسلک کے خلاف ہو، سمع و بصر کا جو مفہوم اس نوٹ میں بیان ہوا ہے یہی دیگر بہت سے قدیم ترین محقق علماء نے بیان کیا ہے مثلاً قاضی بیضاوی نے (جو ساتویں صدی کے اوائل کے نہایت ممتاز محقق عالم شارح حدیث اُصولی و متکلم اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے انھوں نے) اپنی معروف تفسیر میں خدائی صفات کی تشریح کرتے ہوئے، الرحمٰن الرحیم کے ذیل میں لکھا ہے :

الرحمة رقة القلب وانعطاف يقتضي التفضل
والاحسان ومنه الرحم لانعطافها على مافيها واسماء
الله تعالٰى إنما تؤخذ باعتبار الغايات التي هي افعال
دون المبادى التي تكون انفعالات .

اور خداوند تعالیٰ کی آنکھ، ید، سمع وغیرہ کا مخلوق کی طرح نہ ہونا ''**ليس كمثله شئ**'' (قرآن مجید سورۂ شوریٰ) کا تقاضہ ہے اور یہی تمام اہل سنت والجماعت کا مسلک نقل کیا گیا ہے مفسرؒ کا طبع زاد نہیں ہے، چنانچہ مفسرؒ نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے (خود اسے معترض نے بھی نقل کیا ہے) اسی جیسی بات کم وبیش استواء علی العرش جیسی آیات کے مفہوم میں بھی کہی گئی ہے اور معترض نے جو عبارت نقل کی ہے اس کا اختتام اس پر کیا ہے :

لا يمكن ان يكون له اى شكل فيه شائبة من صفات

المخلوقين أو شائبة من جهات أو حدوث .

کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں معترض کو اعتراض ہے؟ اگر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کو مخلوق جیسا مانتا ہے ''**ليس كمثله شئ**'' پر ایمان نہیں ہے (جب کہ یہ آیت بالاتفاق ''محکم'' ہے؛ حالاں کہ ید، وجہ، ساق، والی آیات کو متشابہات میں جمہور نے شمار کیا ہے) معترض کو ہی نہیں ؛ بلکہ اس جیسی فکر رکھنے والے سب لوگوں کو بتانے کے لئے کہ مفسرؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام اہل سنت کا عقیدہ ہے، ایک ایسی کتاب کے حوالے پیش کئے جا رہے ہیں جس سے اہل سنت کے عقائد کے بارے میں درجہ استناد ہونے سے انکار کی جرأت غالباً معترض کو بھی نہ ہوگی یعنی ''**العقيدة الطحاوية**'' اس میں خداوند تعالیٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے :

''**لا تبلغه الاوهام ولا تدركه الافهام**'' واضح ہو کہ مفسرؒ نے اس بحث کا اختتام کرتے ہوئے (جس کے ایک حصہ کا اقتباس معترض نے پیش کیا ہے؛ لیکن وہ آخری حصہ جو خلاصۂ بحث یا جو ہر بحث تھا اسے چھوڑ دیا وہ یہ ہے) خداوند تعالیٰ کی صفات کی حقیقت کیا ہے؟ پہلے یہ سوال اٹھایا، پھر اس کا یہ جواب دیا ہے اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ...... الخ بعینہٖ وہ بات ہے کہ جو ''**لاتبلغه الاوهام ولا تدركه الافهام**'' (عقیدۂ طحاویہ مع الشرح:۶۵، مکتبہ المؤید) میں کہی گئی ہے، اس کے بعد مزید یہ کہا ہے ''**ولا يشبهه الانام**'' (حوالۂ سابق:۶۶) نیز یہ بھی بتایا گیا ہے: ''**وتعالٰى عن الحدود والغايات والاركان والاعضاء**'' (حوالۂ سابق:۲۰۵) تو کیا معترض ''عقیدۂ طحاویہ'' کو بھی نشانۂ تنقید بنائیں گے؟ یہ بھی ملحوظ رہے کہ استویٰ کے لغوی معنی ہی (اگر ''علیٰ'' کے صلہ ساتھ آئے تو) استیلاء (قبضہ وغلبہ) ہو جاتے ہیں، جیسا کہ علامہ راغبؒ اصفہانی (جن کی لغت میں مہارت کے سب قائل ہیں) نے ''مفردات'' میں بیان کیا ہے :

متى عدى بعلٰى اقتضٰى معنى الاستيلاء كقوله
الرحمن على العرش استوىٰ . (مفردات:۲۵۲)

خلاصہ یہ کہ مفسر موصوفؒ نے اس مختصر نوٹ میں کلامی مباحث کو جس طرح سمیٹ دیا ہے اور اہل سنت کی ایسی ترجمانی کی ہے جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے چہ جائیکہ اس پر اعتراض ''**فإلی اللہ المشتکی**'' سچ تو یہ ہے کہ '' دریا بکوزہ'' کی اس سے بہتر مثال ملنی مشکل ہے۔

آخر میں علامہ شوکانیؒ کی فتح القدیر میں مذکور ایک عبارت کا اقتباس معترض کے غور کے لئے پیش کیا جاتا ہے، علامہ شوکانیؒ جو استویٰ علی العرش آیت کے تحت لکھتے ہیں :

قد اختلف العلماء فی معنی هذا علی اربعة عشر قولاً ،
وأحقها واولاها بالصواب مذهب السلف الصالح انه
استویٰ سبحانه علیه بلا کیف بل علی الوجه الذی
یلیق به مع تنزهه عما لایجوز علیه ۔ (فتح القدیر:۲/۲۱۱)

اسی آیت کے تحت تقریباً یہی بات حافظ ابن کثیر (تلمیذ امام ابن تیمیہؒ) نے بھی نسبتاً تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔

''استویٰ'' کے مفہوم پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ غلط فہمی دور کر دینا بھی ضروری ہے کہ معترض نے اپنے اعتراضات کی عبارت میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مفسر عثمانیؒ '' استویٰ علی العرش'' کی حقیقت ہی کے منکر ہیں ؛ حالاں کہ وہ اس الزام سے بری ہیں ؛ کیوں کہ وہ '' استویٰ علی العرش'' کی حقیقت صاف طور سے تسلیم کرتے ہیں ؛ البتہ اس کے معنی اور کیفیت کے بارے میں وہ باتیں لکھی ہیں جو دوسرے اہل حق نے بھی لکھی ہیں۔

اسی نمبر پانچ کے تحت دسواں اعتراض یہ کیا ہے کہ مفسرؒ نے آیت ''**إنا لنراک فینا ضعیفا**'' کے تحت ایک بے بنیاد واہی قصہ نقل کر دیا ہے، اس اعتراض کے جواب کے لئے پہلے اعتراض نمبر چار کے تحت جو کچھ لکھا گیا وہ ملاحظہ کرلیا جائے ،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

حدیث صحیح کی رو سے (وہاں حوالہ دے دیا گیا ہے) بنی اسرائیل سے نقل و حکایت کی اجازت ہے اور اس طرح کے قصے بیشتر تفصیلی معتبر تفاسیر میں بھی ملتے ہیں تو پھر مفسر عثمانیؒ ہی کو تنقید کا نشانہ بنانا درست نہیں ، پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس قصہ کی بنا پر معترض نے اعتراض کیا ہے اس کے ذکر سے پہلے مفسرؒ نے یہ لکھ دیا ہے '' مفسرین نے بعض روایات نقل کی ہیں، گویا مفسر نے اپنی ذمہ داری ان مفسرین پر ڈال دی جنھوں ان روایات کو نقل کیا ہے، یہ قصہ درمنثور: ۴/۴۰۷،طبع بیروت میں بھی موجود ہے،مزید برآں کہ مفسرؒ نے اس قصہ کے ذکر سے پہلے '' تنبیہ'' عنوان قائم کرکے یہ لکھا ہے:بعض سلف سے ضعیف کے معنی '' ضریر البصر'' (نابینا) کے منقول ہیں،شاید کسی خاص وقت میں عارضی طور پر ظاہری بینائی جاتی رہی ہو، جیسے یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال ہوا تھا۔

اسی نمبر پانچ کے تحت ایک اعتراض (بغیر نمبر دیئے) یہ کیا ہے کہ آیت ''**لما خلقت بیدی**'' کی تفسیر میں '' ید'' کا ترجمہ '' نوع'' (شاہ عبدالقادرؒ کے حوالہ سے) کر دیا گویا معترض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ '' ید'' کا ترجمہ '' ہاتھ'' کرنا ضروری تھا، حالاں کہ اوپر کے (نویں اعتراض کے) جوابات کے تحت بیان کردہ تفصیلات میں گذر چکا ہے کہ ''**تعالیٰ عن ...... الأرکان والاعضاء**'' (عقیدۂ طحاویہ) اور شاہ صاحب (عبدالقادر صاحب) نے '' ید'' سے مراد '' نوع'' لے لیا تو اس میں کیا اشکال ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا، کیا قرآن مجید میں تمام انسانی اعمال کو جو ظاہر ہے کہ مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں ''**کسبت ایدیکم**'' سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے؟ تو اگر ہر '' نوع عمل'' کو '' کسب ید'' کہہ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے، پھر مفسرؒ نے اس کے آخر میں صاف لکھ دیا ہے (جسے معترض صاحب نظر انداز کر گئے) کہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کی نعوت وصفات میں سلف کا مسلک ہی اقویٰ واحوط ہے۔

اسی نمبر پانچ کے تحت (بغیر نمبر دیئے) ایک اعتراض ''**تجری بأعیننا**'' کی

تشریح ''حفظ ورعایت'' کر دینے پر کیا ہے، حالاں کہ یہ مفہوم بتقاضائے لغت بھی درست ہے، لغت کے امام، راغبؒ نے نقل کیا ہے :

یقال ...... للمراعی للشیٔ عین و فلان بعینی ای احفظه وأراعيه ...... قال فانک بأعيننا وقال تجری باعيننا ...... ای بحيث نری ونحفظ ولتصنع علٰی عينی أی بكلاء لی وحفظی ۔(مفردات مادہ ''عین'')

مشہور لغوی جوہری، جس کی لغت میں امامت مسلم ہے، نے بھی اپنی ''صحاح'' میں ایک معنی یہ لکھے ہیں ''**أنت علی عینی فی الحفظ والإكرام جميعا**'' (صحاح:۲۱۷۱)
اب ذرا مفسر عثمانیؒ کا پورا نوٹ بھی ملاحظہ کر لیجئے ۔

یعنی اس ہولناک طوفان کے وقت نوح کی کشتی ہماری حفاظت اور نگرانی میں نہایت امن وچین سے چلی جارہی تھی، بھلا اس پر کوئی اعتراض ہوسکتا ہے؟

آخری اعتراض ''ساق'' کے معنی پر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مفسرؒ نے ''ساق'' کے ظاہری معنی کیوں نہیں لئے؟ یہ اعتراض بھی صفات خداوندی کی تشریح کے قبیل کا ہے جس کی تفصیلی بحث ''نویں اعتراض'' کے جواب کے تحت گذر چکی ہے اور وہاں بتایا جاچکا ہے کہ اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق خداوند تعالیٰ کے لئے اعضاء وارکان کا اثبات درست نہیں (یہ باتیں، علامہ شوکانیؒ، حافظ ابن کثیر تلمیذ امام ابن تیمیہؒ اور عقیدۂ طحاویہ کے حوالوں سے نقل کی گئی ہیں) اور پھر معترض نے تفسیر کی پوری عبارت کا ترجمہ نہیں پیش کیا ہے؛ بلکہ ناقص ہی مفہوم ذکر کر دیا، ورنہ غلط فہمی کا امکان کم یا ختم ہوجاتا پوری عبارت یہ ہے: اس کا قصہ حدیث صحیحین میں مرفوعاً اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ میدان قیامت میں اپنی ساق ظاہر فرمائے گا، (بخاری، کتاب التفسیر سورۂ قلم: ۴۹۱۹، ورواہ مسلم، کتاب الایمان: ۴۵۴) ساق پنڈلی کو کہتے ہیں اور یہ کوئی خاص صفت یا حقیقت ہے، صفات وحقائق الٰہیہ میں سے جس کو کسی خاص مناسبت سے ساق فرمایا، جیسے قرآن مجید میں ''ید'' (ہاتھ) ''وجہ'' (چہرہ) کا لفظ آیا

ہے، یہ مفہومات متشابہات میں سے کہلاتے ہیں ان پر اسی طرح بلا کیف ایمان رکھنا چاہئے جیسے اللہ کی ذات، وجود، حیات اور سمع وبصر وغیرہ صفات پر ایمان رکھتے ہیں۔

غور کیجئے! بلا کیف ایمان رکھنے کے قول کو ہی علامہ شوکانی نے بھی احق اولیٰ بالصواب قرار دیا ہے۔

اسی جگہ مشہور ماہر لغتِ قرآن علامہ راغب کی تحقیق کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا، موصوف لکھتے ہیں: ''**یوم یکشف عن ساق ، اشارة الی شدة**'' اس کے بعد اصل محل استعمال (اونٹنی کے بچہ کا پیٹ میں مرجانا اور پھر اس کا ساق پکڑ کر نکالنا) ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''**نجعل لكل أمر فظيع**''۔

آخر میں یہ حقیقت بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہو رہا ہے کہ مفسر جلیل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جس جماعت علماء سے تعلق رکھتے ہیں، وہ برصغیر میں اہل حق کی سب سے زیادہ نمائندہ اور معیاری ہے، اس نے ہی ایک صدی سے زائد عرصہ سے علم صحیح (قرآن وسنت) صحیح عقیدہ توحید خالص، اتباع سنت، عمل صالح، اصلاحِ معاشرہ اور دیگر تمام دینی خدمات کے فروغ کا عمل تسلسل کے ساتھ کیا ہے، اسی کے ساتھ کفار ومشرکین، فرق باطلہ، اہل بدعت وضلال سے مورچہ لیا، اس لئے اہل بدعت کا خاص نشانہ رہی ہے اور اسی جماعت کو اہل بدعت ''وہابی'' کے لقب سے ملقب کر کے ان پر طرح طرح کی الزام تراشیاں؛ بلکہ ایذا رسانیاں کرتے ہیں، کبھی تو ضرب وحرب تک پر اُتر آتے ہیں، مگر اس وقت جو جماعت بظاہر صحیح عقیدہ کے فروغ کا جھنڈا اُٹھائے نظر آتی ہے، اب سے بیس پچیس سال قبل تک اس کا نام بھی مشکل سے سننے میں آتا تھا، ہاں کچھ مخلص افراد ضرور مخلصانہ مساعی میں لگے ہوئے تھے، یہ بھی حقیقت ہے کہ مفسر جلیل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی یہ تفسیر اُردو میں سب سے بہتر مختصر تفسیر ہے جس میں عقیدہ کی صحت، اخلاقی تربیت اور قرآنی حکمتوں کو ایسے بلیغ اور سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کی نظیر ملنا اُردو زبان میں مشکل ہے، لہٰذا اس تفسیر پر پابندی

اور اشاعت میں رکاوٹ اہل بدعت وضلال کے خوش کرنے کا باعث ہوگی اور صحیح قرآن فہمی کا ایک دروازہ بند کردینے کے مرادف ہوگی۔

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ، اللهم نعوذ بک من شرور أنفسنا ولا تضلنا بعد ماهديتنا ، والحمد لله اولا وآحرا وصلى الله على خير خلقه محمد وآله وصحبه اجمعين ۔

☆ ☆ ☆

صحیح بخاری کے حواشی میں
الامام محمد قاسم النانوتویؒ کا انداز

الامام النانوتوی سیمینار، منعقدہ: ۲۰ تا ۲۲ رمئی ۲۰۰۰ء، دہلی کے اندر پڑھا گیا اور سہ ماہی صفا حیدرآباد کی خصوصی پیشکش ''مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حیات وکارنامے'' کے اندر شمارہ: ۳۵،

اپریل تا جون ۲۰۰۰ء شائع شدہ۔

سرزمین ہند پر اگرچہ آفتاب اسلام کی کرنیں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہی پڑنے لگی تھیں؛ لیکن ان کے ہمہ گیر ہونے اور پورے آب وتاب کے ساتھ پھیلنے میں خاصا عرصہ لگا، پھر تو یہ خطہ جو نامعلوم مدتوں سے —قبل از تاریخ زمانہ سے— کفر وشرک کے اندھیاروں میں ڈوبا ہوا تھا، نور اسلام سے ایسا جگمگایا کہ اس سرزمین پر یہاں ایسے ایسے علم وعمل، تقویٰ وخشیت کے آفتاب و ماہتاب نمودار ہوئے جن کی تابانی وضیاپاشی کا دائرہ سرزمین ہند سے نکل کر عجم ہی نہیں عرب تک پھیلا، جس کا اعتراف سارے عالم نے کیا، ان گہر بار اور ضیا پاش افراد کی مختصر سے مختصر فہرست کے لئے بھی خاصا وقت درکار ہوگا، جس کا سیمیناروں میں شرکاء کو دیئے گئے محدود وقت میں پیش کرنا مشکل ہے، اس لئے آج کی محفل میں صرف اسی ذات گرامی کے بارے میں کچھ عرض کرنے پر اکتفا کیا جانا ہی مناسب لگ رہا ہے، جس کا ذکر وتذکرہ کرنے اور سننے ہم سب آج جمع ہوکر ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں، کہ یہاں تمام شرکاء ومقالہ نگار وسامعین اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر اور اسی کے بچھائے ہوئے خوانِ علم کے زلہ گیر ہیں، اسی کے تذکرہ سے لذت یاب ہونے جمع ہوئے ہیں اور سب ''**أعد ذكر نعمان لنا أن ذكره هو المسک ما كررته يتضوع**'' کا نغمہ زبانِ حال سے گنگنا رہے ہیں۔

مذاکرہ کے دوران اس شخصیت اور اس کی امامت کے مختلف پہلو سامنے لائے جائیں گے اور منتظمین کی بیدار مغزی اور دور بینی کی داد نہ دینا بے داد ہوگی کہ انھوں نے ہر مقالہ نگار کے لئے موضوع کا تعین کرکے اس علمی مذاکرہ کی افادیت بڑھانے اور مذکور کی شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کو سامنے لانے کا سامان کیا۔

راقم کو حضرت ممدوح کے اس اہم علمی کارنامہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا مفوض ہوا ہے، جس کی اہمیت وافادیت زبان ومکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہے، یعنی جب تک

’’اصح الکتب بعد کتاب اللہ‘‘ سے استفادہ کا سلسلہ باقی رہے گا اور اُمید ہے کہ انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا، اس وقت تک یہ علمی کارنامہ بھی زندہ و تابندہ صحیح البخاری سے استفادہ کے لئے ناگزیر ہونے کی وجہ سے رہے گا، اس کارنامہ کی اہمیت میں اضافہ یوں اور ہوجاتا ہے کہ موصوف نے ایسی عمر میں انجام دیا ہے کہ جس میں عموماً اچھے طلبہ کو بھی صحیح طریقہ پر صحیح بخاری کا پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے، اس وقت مولانا کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی (مولانا کی ولادت ۲ ۳ ۱۸ یا ۱۸۳۳ء میں اور حواشی کی طباعت ۱۸۵۰ء میں ہوئی)(۱) اور سچ پوچھئے تو اس کارنامہ سے بالعموم استفادہ کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی، مگر جس کے لئے قادر وقیوم نے ’’الامام‘‘ لقب کا سزاوار ہونا مقدر کردیا ہو اس کے ذریعہ انجام پانے پر تعجب کیوں! یہاں یہ ذکر کردینا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان کی علمی جامع تاریخ ’’نزہۃ الخواطر‘‘ (نیا نام ’’الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام) کے بالغ نظر مرتب ومصنف، جو ایک ایک حرف ناپ تول کر لکھنے کے لئے مشہور ہیں، نے ہندوستان کے قریبی زمانہ کے علماء کبار میں صرف

(۱) مولانا کی ولادت ۱۸۳۲ یا ۱۸۳۳ء میں ہونا تو متعدد سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے؛ لیکن حواشی بخاری کی طباعت اولیٰ ۱۸۵۰ء میں ہونا مولانا اسیر ادروی صاحب نے اپنی مرتب کردہ کتاب ’’مولانا محمد قاسم نانوتوی‘‘ کے صفحہ ۷۶ پر ذکر کیا ہے (اگرچہ اس بات کا ماخذ نہیں بتایا)۔

دو شخصیتوں کے لئے ’’الامام‘‘ استعمال کیا، (۱) ایک شہرۂ آفاق درس نظامی کے بانی ملا نظام الدینؒ فرنگی محلی کے لئے دوسرے ہم سب کے ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے لئے؛ بلکہ دونوں شخصیتوں کا تذکرہ ایک ہی طرح کے القاب سے شروع کیا ہے، (’’الشیخ الامام العالم الکبیر‘‘ سے، حتیٰ کہ مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلیؒ جیسے ممتاز ترین عالم دین کے لئے بھی امام کا لقب نہیں لکھا) یہ لذیذ حکایت، مولانا کے اولین سوانح نگار، ہم عمر اور ہم وطن ومستفید مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنئے :

> مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری کی کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے، مولوی صاحب (حضرت نانوتویؒ) کے سپرد کیا مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے، اسی زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا، اسی پر مولوی احمد علی نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دکھلایا جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے۔(۲)

(۱) حضرت نانوتوی کی ’’امامت‘‘ (بلکہ خود ’’امامت‘‘ کی تحقیق) کے مظاہر وامتیازات کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی مرتب کردہ ’’سوانح قاسمی‘‘ دیکھنی چاہئے، مولانا گیلانیؒ نے حضرت نانوتوی کی ’’امامت‘‘ کا ایک غیبی اشارہ دینے والا ایک خواب نقل کیا ہے (ج:۱، ص:۱۳۲ پر) اسی طرح مجذوب کی (بخاری کا نسخہ ہاتھ میں لے کر) پیشین گوئی بھی کی کہ ’’جا تو بڑا عالم ہے‘‘ (سوانح قاسمی: ۱/۲۵۶) خواب میں امام نوتویؒ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک نگینہ دیکھا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’إنی جاعلک للناس إماما‘‘ (بقرہ) اسی خواب سے حضرت نانوتوی کے غیر معمولی طور پر مہمان نواز ہونے کی بھی توجیہ مولانا گیلانی نے کی ہے۔ (سوانح قاسمی: ۱/۵۶۷)

(۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ از مولانا یعقوب نانوتویؒ: ۷۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے جدید سوانح نگار، مشہور اہل قلم، رسالہ ’’ترجمان الاسلام‘‘ کے مدیر جناب اسیر ادروی صاحب مذکورہ بالا اقتباس، اپنی کتاب ’’مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حیات اور کارنامے‘‘ میں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

> مولوی احمد صاحب نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت نانوتوی کو ایسی ذمہ داری سپرد کی کہ تجربہ کار پختہ کار کے لئے بھی اس سے کما حقہ عہدہ برآنا دشوار تھا؛ لیکن آپ نے بخاری شریف کے اس حصہ پر جو بخاری میں اہم ترین ہے حضرت نانوتوی سے حواشی لکھوا کر حضرت نانوتویؒ کی شخصیت پر جو ناشناسی کی دبیز

چادر پڑی ہوئی تھی یک بیک اٹھادی اور اس جوہر قابل کو دنیا
کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا۔(۱)

مولانا ادروی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ'' حواشی بخاری کی پہلی مرتبہ اشاعت ۰ ۱۸۵ ء میں ہوئی'' (ص:٦٧)اور حضرت نانوتوی کی ولادت ۱۸۳۲ یا ۱۸۳۳ ء میں ہوئی اسکا مطلب ہوا کہ یہ حواشی حضرت نے ۱۷یا/ ۱۸ سال کی عمر میں لکھے (حضرت نانویوی کا سن ولادت ۱۲۴۸ متعین ہے اس سے مطابقت ۱۸۳۲ء ۱۸۳۳ء یا ہوتی ہے) اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح کا یہ حصہ (آخری پانچ چھ پارے بالخصوص تین پارے) ایک اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے (جس کی طرف خود مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، آگے تفصیل آرہی ہے) جو دوسرے حصوں کو حاصل نہیں ؛ کیوں کہ اسی میں امام بخاری نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی فقہی افکار پر بڑے تیکھے انداز میں تبصرے بلکہ تنقیدیں کی ہیں، جن کی شدت بسا اوقات جارحانہ محسوس ہونے لگتی ہے، اس حصہ پر کسی حنفی کا حاشیہ لکھنا گویا امام اعظم کی طرف سے پوری وکالت اور بخاری کے اعتراضات وتنقیدات کے بھرپور علمی جواب دہی کی ذمہ داری قبول کرنا ہے، جوکوئی آسان کام نہیں اور اس کے لئے کسی عالم کا
بالخصوص نو عمری

(۱) ص:۵۷، ناشر شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیو بند۔

میں کمر ہمت کس لینا بدون عبقریت کے ممکن نہیں ، حضرت نانوتویؒ جن کے عبقری ہونے میں شاہد ہی کسی واقف کو کلام ہو —— نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو خوب سوچ سمجھ کر رکھا اور ہر باخبر کہہ سکتا ہے،'' حق تو یہ کہ حق ادا کر دیا'' کہنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ امام بخاری کے'' قال بعض الناس'' کے پردہ میں امام ابوحنیفہ پر اعتراضات کے یکجا جوابات کا مجموعہ'' دفع الوسواس'' (جواصح المطابع کی مطبوعہ بخاری جلد ثانی کے بالکل شروع میں ملحق ہے) اسی قلم کا رہین منت ہے، جو اپنی خودی مٹانے اور کمالات چھپانے میں یدطولیٰ

رکھتا تھا،'' دفع الوسواس'' کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے ناشر نے لکھا ہے'' **الذی صنف بعض المحققین والکملاء المدققین ...... لم یظهر اسمه هضما لنفسه**'' (یہ کہنے والے ملک کے نامور اہل قلم اور تذکرۂ علماء ہند پر اتھاریٹی سمجھے جانے والے محقق عالم مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ تھے، یہ بات موصوف نے خود راقم الحروف کے سامنے کہی)۔

حاشیہ یا شرح

اگر ضروری تشریحات محض کسی کتاب کے حاشیہ (کنارہ) پر چھپنے کی وجہ سے حاشیہ کا نام پانے کی مستحق قرار پاتی ہیں تب تو یقیناً حضرت نانوتویؒ کے صحیح بخاری سے متعلق افادات کو حاشیہ کہنا درست ہے، ایسی صورت میں اہل مطابع کے سامنے پرزور طور پر یہ تجویز رکھنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اس حاشیہ کو کتاب کے حاشیہ (کنارہ) کے بجائے حوض میں چھاپیں ؛ کیوں کہ (شرح یا شروح) کی جتنی معنوی خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس حاشیہ (یا حواشی) کے اندر موجود ہیں۔

شرح کے امتیازات

کسی کتاب کی شرح کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ کتاب کے فہم کو آسان بنانے ، اس پر وارد ہونے والے اعتراضات رفع کرنے ، اجمالات کی تفصیل، مبہمات کی توضیح ، مغلقات کی تشریح ، اغلاط کی نشاندہی ؛ ممکن ہو تو ان کی توجیہ، فروگذاشتوں پر تنبیہ، اور فن حدیث کی کتاب ہو تو رجال کی تحقیق ، مراتب رواۃ وروایات کی تعیین متعارض روایات میں تطبیق یا ترجیح، کسی خاص مسلک کے خلاف ہو تو بالخصوص شارح کے مسلک کے خلاف ہو تو اس کا جواب یا فن حدیث کے اُصولوں پر تضعیف کرنا یہ ہیں شرح کی خصوصیات، ہم جب حضرت نانوتویؒ کے صحیح بخاری کے حواشی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ تمام خصوصیات ان میں نظر آتی ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انھیں صرف اس لئے حواشی کہنے پر اصرار کیا جائے کہ وہ کتاب کے حاشیہ پر طبع ہوئے ہیں حوض کے اندر نہیں !

حواشی بخاری کی خصوصیات

جیسا کہ اجمالاً ذکر آیا، مولانا نانوتویؒ کے حواشی میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، یہاں ان سب کی مثالیں پیش کرنے سے مضمون اتنا طویل ہوجائے گا کہ شاید پوری ایک نشست میں بھی اسے پورا پڑھنا مشکل ہو، راقم الحروف اپنے —— سیمیناروں میں شرکت سے حاصل ہونے والے —— تجربہ کی بنا پر اس اعتراف میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ اس طرح کی مجالس مذاکرہ میں کہ جس کے اندر بہت سے اہل علم اپنے قیمتی افادات پیش کرنے لائے ہوں، کسی بہتر سے بہتر طویل مقالہ کی بھی سماعت کا تحمل آسان نہیں ہوتا؛ چہ جائیکہ احقر جیسے ہیچ میرز کی ٹوٹی پھوٹی تحریر کا، اس لئے بس چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے، یہاں یہ بتادینا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ احقر نے مطالعہ کے بعد بہت سے مواقع کے حواشی پر نشان لگالئے تھے؛ تاکہ مقالہ کی زینت بنایا جائے، مگر نظر ثانی کے وقت اندازہ ہوا ان سب کو مقالہ کے اندر سمونے سے ''مقالہ'' نہیں رہے گا، کتاب بن جائے گی، ظاہر ہے کہ سردست کتاب نہیں مقالہ لکھنا پیش نظر ہے، اس لئے اس میں سے بہت سے قیمتی حواشی، بادل ناخواستہ، شامل نہیں کئے جاسکے اور ''**اذا لم یدرک کله لم یترک کله**'' کے حکیمانہ مقولہ پر عمل پیرا ہونے میں ہی مصلحت نظر آئی۔

پہلی مثال (حدیث کا مطلب واضح کرنے کی)

بخاری کتاب الدعوات، باب الدعاء إذا انتبہ من اللیل میں ایک طویل حدیث آئی ہے، جس کے آخر میں یہ ہے: ''**اللهم اجعل فی قلبی نورا ...... واجعل لی نورا قال کریب وسبع فی التابوت ......**''(۱) خط کشیدہ جملہ (سبع فی التابوت) گویا ایک معمہ ہے جو یقیناً محتاج تشریح ہے کہ اس کے بغیر مطلب تک رسائی مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے حضرت امام نانوتوی لکھتے ہیں :

قولہ : '' سبع فی التابوت '' أی سبع أعضاء أخر فی بدن الإنسان الذی كالتابوت للروح أو فی بدنه الذی

مالہ أن یکون فی التابوت أی الجنازة وهی العصب واللحم والدم والشعر والخصلتان الأخریان لعلهما الشحم والعظم ، أو المراد سبع أخر فی الصحیفة مسطورة لا أذكرها أو مكتوبة موضوعة فی الصندوق ، قال النووی یراد بالتابوت الإضلاع وما یحویه من القلب وغیره تشبیها بالتابوت الذی كالصندوق یحرز فیه المتاع أی سبع كلمات فی قلبی ولكنی نسیتها ...... وقیل المراد سبع أنوار أخر كانت مكتوبة موضوعة فی التابوت الذی كان لبنی اسرائیل فیه سكینة من ربكم وبقیة مما ترک آل موسیٰ وآل هارون .

حضرت نے یہاں متعدد احتمالات ذکر کئے، جس میں سے کسی کو اختیار کرلینے کی آزادی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن بہرحال مذکورہ شرح کے بغیر مصداق تک رسائی ناممکن بھی۔

دوسری مثال (سند کے بارے میں وضاحت اور غلط فہمی دور کرنے کی)

امام بخاریؒ نے باب الدعاء علی المشرکین کے اندر ایک حدیث بایں سند ذکر کی : ''**حدثنا المثنی قال حدثنا الانصاری قال حدثنا هشام بن حسان الخ**''(۲)

(۱) بخاری: ۹۳۵/۵، کتاب الدعوات، باب:۱۰، حدیث نمبر: ۶۳۱۶۔

(۲) بخاری: ۹۴۶/۶، کتاب الدعوات، باب:۵۸، حدیث نمبر ۶۳۹۶۔

اس پر حاشیہ میں فرماتے ہیں :

قولہ : حدثنا الانصاری یرید محمد بن عبد الله بن المثنی القاضی وهو من شیوخ البخاری ولكن ربما أخرج عنه بواسطة كالذی هنا وقوله هشام بن حسان هذا وإن تكلم فیه بعضهم من قبل حفظه لكنه لم یضعفه بذلک أحد مطلقا بل بقید بعض شیوخه ، والتفقوا

علی أنه ثبت فی الشیخ الذی حدث عنه بحدیث الباب وهو محمد بن سیرین قال سعید بن أبی عروبة ماکان أحد أحفظ عن ابن سیرین من هشام بن حسان ۔

حاشیۂ بالا محشی کی، اسناد ورجال پر گہری نظر کا آئینہ دار ہے۔

تیسری مثال (حل لغات کی)

قربِ قیامت کی علامات میں رفع امانت بھی ہے، جس کا ذکر حدیث بخاری میں بایں الفاظ آیا ہے :

ینام الرجل النومة فتقبض الأمانة من قلبه فیظل أثرها مثل أثر الوکت ثم ینام النومة فتقبض فیبتی أثرها مثل المجل کجمرد حرجته علی رجلک فنفط فتراه منتبرا ولیس فیه شیئ الخ ۔ (۱)

اس حدیث میں کئی الفاظ حل کے متقاضی ہیں، چنانچہ دیکھئے، امام نے یہ ذمہ داری بطریق احسن پوری کی :

أثر الوکت بفتح الواو وسکون الکاف وبالمثناة الأثر الیسیر و قیل السواد الیسیر وقیل اللون المحدب المخالف للون الذی کان قبله

(۱) بخاری:۹۶۲،باب:۳۵،حدیث نمبر:۶۴۹۷

والمجل بفتح المیم وسکون الجیم وفتحها هو النفط الذی یحصل فی الیدین من العمل بفاس ونحوه ونفط بکسر الفاء ...... قال ابن الفارس النفط قرح یخرج فی الیدین من العمل ومنتبرا مفتعلا من الانتبار وهو الارتفاع ومنه المنبر لارتفاع الخطیب علیه

والأمانة المتبادرة ...... ضد الخیانة وقیل المراد منها هو التکالیف الالٰهیة ۔

اس تشریح سے معلوم ہورہا ہے کہ حضرت کی عربی لغت پر بھی گہری اور وسیع نظر تھی کہ دقائق پر بھی مطلع تھے۔

چوتھی مثال (بخاری پر گرفت)

عام طور پر شراح اور محشین جس کتاب کو شرح وحاشیہ کے لئے منتخب کرتے ہیں وہ گویا طے کرلیتے ہیں کہ صاحب کتاب اور کتاب کی ہر بات کی حتی الامکان تائید اور تصویب کریں گے اور عموماً ایسا ہی کرتے بھی ہیں، خواہ مصنف کی تائید وحمایت میں دوراز کار تاویلات کا ارتکاب کرنا پڑ جائے، مگر جس کا حجۃ الاسلام بننا مقدر تھا اور حق کا علمبردار ہونا وہ بھلا یہ روش کیوں اختیار کرسکتا تھا، چنانچہ حضرت الامام نے متعدد مواقع پر صاحب کتاب (امام بخاریؒ) پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی فروگذاشتوں کی نشاندہی بھی، ان میں سے ایک موقع پر ''کتاب الاکراہ باب اذا اکره حتی وهب عبداً أو باعه لم یجز'' میں ہے، جہاں بخاری نے امام اعظم کی طرف حسب عادت ''بعض الناس'' کہہ کر دو فقہی قول منسوب کئے، جن میں باہم تضاد ثابت ہوتا ہے، حضرت نے بتایا کہ ان قولوں کی یہ نسبت ہی (امام اعظم کی طرف) صحیح نہیں ہے، تفصیل کے لئے باب مذکور اور اس کا حاشیہ (اصح المطابع کی مطبوعہ بخاری میں صفحہ: ۱۰۲۷، حاشیہ: ۱۲-۱۳ دیکھا جائے)۔

پانچویں مثال (سند میں امام بخاری کی غلطی کی نشاندہی)

یہ بات بڑی ہی تعجب خیز اور بظاہر چونکا دینے والی ہے کہ امام نانوتوی، امام بخاری جیسے عظیم محدث کی سند حدیث میں غلطی پکڑیں، مگر واقعہ کو کس طرح جھٹلایا جائے کہ بخاری شریف کے اس حاشیہ کا مطالعہ کرنے والا بظاہر یہ چونکا دینے والی حقیقت اپنی آنکھوں سے

(جلد:۲،صفحہ:۱۰۴۶)''کتاب الفتن ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویل للعرب من شر قد اقترب''میں دیکھ سکتا ہے، جہاں امام بخاریؒ نے ایک حدیث بایں سند نقل فرمائی ہے :

مالک بن اسماعیل قال حدثنا ابن عیینة أنه سمع الزهری عن عروة عن زینب بنت أم سلمة عن أم حبیبة ، عن زینب بنت جحش ۔

اس پر امام نانوتوی فرماتے ہیں :

قوله : " عن زینب بنت ام سلمة عن ام حبیبة " ......
آه قالوا هذا الاسناد منقطع وصوابه کما فی صحیح مسلم زینب عن حبیبة عن أم حبیبة عن زینب بزیادة حبیبة ۔ (۱)

اگرچہ آخر میں ایک توجیہ ایسی ذکر کردی، جس سے امام بخاری کے مرتبہ کی لاج رہ جائے۔

چھٹی مثال (امام نانوتوی کی تاریخ پر وسیع نظر ہونے کا ثبوت)

امام بخاریؒ نے''کتاب الاحکام ، باب کیف یبایع الامام الناس''(۲) میں یہ حدیث موقوف ذکر فرمائی ہے:''حدثنا عبد اللہ بن دینار قال شهدت ابن عمر

(۱) بخاری ، کتاب الفتن ،حدیث نمبر:۷۰۵۸۔

(۲) بخاری:۱۰۶۹،کتاب الأحکام،باب:۴۳،حدیث نمبر:۷۲۰۳۔

حیث اجتمع الناس علی عبد الملک''اس پر امام نانوتوی نے بڑا ہی مفصل حاشیہ لکھا ہے، جو موصوف کی تاریخ پر وسیع نظر کا آئینہ دار ہے، یہاں اس کے جستہ جستہ حصے پیش کئے جارہے ہیں :

قوله : حیث اجتمع الناس علی عبد الملک یرید ابن

مروان بن الحکم والمراد بالاجتماع اجتماع الکلمة وکانت قبل ذلک متفرقة وکان فی الأرض قبل ذلک اثنان کل منهما یدعی له الخلافة وهما عبد الملک بن مروان وعبد اللہ ابن الزبیر ، فأما ابن الزبیر فکان أقام بمکة ...... بعد موت معاویة ، وامتنع من المبا یعلة لیزید بن معاویة فجهر الیه یزید الجیوش مرة بعد أخری فمات ...... یزید وجیشه محاصرون ابن الزبیر ولم یکن ابن الزبیر ادعی الخلافة حتی مات یزید فی ربیع الاول سنة أربع وستین فبایعه الناس بالخلافة وبایع أهل الأفاق لمعاویة بن یزید ...... فلم یعش إلا نحو أربعین یوما فبایع معظم الأفاق لعبد اللہ ابن الزبیر وانتظم له الملک ...... ولم یتخلف عن بیعته إلا جمیع بنی أمیة ومن یهوی هواهم وکانوا بفلسطین فاجتمعوا علی مروان بن الحکم وبایعوه بالخلافة وخرج بمن أطاعه إلی جهة دمشق والضحاک بن قیس قد بایع فیها لابن الزبیر فاقتتلوا ...... وغلب مروان علی الشام ثم ...... توجه إلی مصر فحاصر بها عامل ابن الزبیر حتی غلب علیها ثم مات فی سنة ...... وعهد إلی ابنه عبد الملک فقام مقامه وکمل له ملک الشام ومصر والمغرب ولابن الزبیر ملک الحجاز والعراق والمشرق إلا البصرة غلب علیه المختار بن عبید ثم صار الیه مصعب بن الزبیر ...... وانتظم أمر العراق

كله لابن الزبير فصار عبد الملك إلى مصعب فقاتله وملك العراق كله ولم يبق مع ابن الزبير إلا الحجاز واليمن فقط فجهز إليه عبد الملك الحجاج فحاصره ...... إلى أن قتل عبد الله ابن الزبير في جمادى الأولى ۷۳ھ وكان عبد الله بن عمر في تلك المدة امتنع أن يبايع لابن الزبير وعبد الملك كما امتنع أن يبايع لعلي ولمعاوية ثم بايع لمعاوية لما اصطلح مع الحسن بن علي واجتمع الناس وبايع لمعاوية بن يزيد بعد موت معاوية لاجتماع الناس عليه ثم امتنع من المبايعة لأحد حال الاختلاف إلى أن قتل ابن الزبير وانتظم الملك كله لعبد الملك فبايع حينئذ فهذا معنى قوله لما اجتمع الناس ۔ (بحذف يسير)

حواشی کے بارے میں کچھ اور

یہاں بس ان چند نمونوں کے پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے، ہوسکتا ہے کسی کو یہ احساس ہو کہ اختلافی مسائل پر فقہ حنفی کو ترجیح دینے کی ایک بھی مثال نہیں پیش کی گئی، مگر راقم نے جان بوجھ کر اس سے گریز کیا؛ کیوں کہ اس کے نمونے تو جا بجا ملتے ہیں؛ بلکہ ان میں یہی پہلو غالب ہے اس کی طرف اشارہ خود اولین سوانح نگار، مولانا کے ہمدم وہم ساز مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے حواشی کی خصوصیات ذکر کرتے ہوئے کیا :

> اور وہ جگہ (جس پر حضرت نانوتویؒ نے قلم اُٹھایا) بخاری میں سب جگہ سے زیادہ مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھے معلوم ہے کہ

> کتنے مشکل، اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھے اور سمجھے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ حاشیہ کی ایک مزید خصوصیت یہ بتاتے ہیں :

> اور اس حاشیہ میں یہ التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔

ان دونوں خصوصیتوں کے اس حاشیہ میں موجود ہونے کی ہر شخص شہادت دے گا جس نے ان کا تھوڑا بہت بھی — حتیٰ کہ چند صفحوں کا بھی — مطالعہ کیا ہے، بے سند کتاب کے (بغیر حوالہ کے) کوئی بات نہ لکھنے کا اندازہ اس فہرست سے کیا جاسکتا ہے جو شروع کتاب میں (پہلی جلد کی ابتداء میں) اصل محشی مولانا احمد علی صاحبؒ نے درج فرمائی ہے، اس میں مختلف علوم وفنون کی ۶۴ کتابوں کے نام لکھنے کے بعد "وغیر ذلک" فرمایا: جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ بھی دیگر کتابوں سے حاشیہ لکھتے ہوئے استفادہ کیا گیا ہے، یقیناً وہ سب مراجع حضرت نانوتوی کے بھی پیش نظر رہے ہوں گے، (اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے جب کہ مطبوعہ کتابوں بالخصوص فن حدیث سے متعلق کی کمیابی بلکہ نایابی کی شکایت عام تھی کے پیش نظر فہرست میں مندرج تعداد غیر معمولی ہی سمجھی جائے گی)۔

حنفیت کی تائید

صاحب سوانح نے جس دوسری خصوصیت (حنفیت کی تائید) سے متعلق جو کچھ لکھا وہ بھی ہر ایک واقف پر عیاں ہے، اس کا التزام یوں تو ہندوستان کے تقریباً سبھی حنفی شارحین حدیث و حاشیہ نگاروں نے کیا ہے؛ کیوں کہ ان کا مسلک یہی (فقہ حنفی) تھا، مگر حضرت الامام النانوتویؒ کے لئے ایک اور محرک بھی تھا جس کا ذکر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (مفصل سوانح قاسمی کے مصنف اور نہایت ذہین اور کثیر المطالعہ والتصانیف متبحر عالم) نے "سوانح

قاسمی'' کی جلد اول میں تفصیل سے کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت الامام نے ایک خواب دیکھا تھا کہ '' کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شئ پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منھ ہے اور ادھر سے ایک نہر آئی ہے، جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے'' اس خواب کی تعبیر مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ دی کہ '' خواب دیکھنے والے شخص سے مذہب حنفی کو تقویت ہوگی'' (مولانا کے بارے میں مشہور ہے موصوف کو تعبیر خواب کا ملکہ حاصل تھا) اس خواب کے تذکرہ کے بعد مولانا گیلانی تحریر کرتے ہے :

> میرے نزدیک اس میں اشارہ ہے...... کہ تیرھویں صدی (ہجری) کے آخر میں مسلمانانِ ہند کی دینی زندگی کی وحدت کو جو شدید خطرہ فتنۂ غیر مقلدیت کے طوفان کی وجہ سے پیش آ گیا تھا اور قریب تھا کہ یک جہتی کا شیرازہ بکھر کر پراگندہ ہوجائے، شتر بے مہاری کے اس سیلاب میں ڈر تھا کہ سلف کے سارے کارنامے شاید تہ وبالا ہوکر رہ جائیں، اس کڑے وقت اور کٹھن گھڑیوں میں درس حدیث کے قاسمی یا دیوبندی طریقہ کی خصوصیت نے کام کیا...... کہ فرقۂ اہل حدیث کی طرف سے امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی مسائل پر جو حملے پہلے ہوئے یا اس وقت تک ہوتے رہے ہیں ان حملوں کے مقابلوں میں محدثانہ تحقیقی رنگ میں جواب دینے کی جتنی اچھی صلاحیت دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے، انصاف کی بات یہ کہ اس کی نظیر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔(۱)

(۱) سوانح قاسمی: ۱/ ۲۳۴، از: مولانا گیلانی، مطبوعہ دارالعلوم دیوبند۔

مولانا احمد علیؒ اور امام نانوتویؒ کے حاشیے میں کیا فرق ہے؟

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے حواشی بخاری شریف کے تین چوتھائی سے زیادہ حصے پر ہیں، صرف آخر کے پانچ چھ پاروں (تیس پاروں میں سے) پر حضرت مولانا نانوتوی کے حاشیہ کا ذکر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے کیا ہے؛ لیکن متعین اور یقینی طور پر اس کا پتہ کسی اور ذریعہ سے نہیں چلتا کہ واقعتا کتنے پاروں پر حضرت الامام نے تحشیہ کا کام کیا، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی حتمی انداز میں تعیین نہیں کی (پانچ چھ پارے کی تعبیر اختیار کرکے گویا ابہام چھوڑ دیا) ہم جیسے قلیل البضاعت لوگوں کا منصب نہیں کہ دونوں میں تقابل کرسکیں، پھر بھی مطالعہ کرنے سے مولانا سہارنپوری کے یہاں نسبتاً اختصار اور حضرت نانوتوی کے یہاں تفصیل کا فرق دریافت ہوتا ہے اور یہ فرق آخر کے تین پاروں کے حواشی میں زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے شاید اسی بنا پر بعض اہل بصیرت کا خیال ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے آخر کے تین پاروں پر ہی حواشی لکھے اسی پر اپنی گذارشیں ختم کرتا ہوں، حسنِ استماع کے لئے تمام سامعین کا اور اس بزم سعادت میں شرکت کا موقع دینے کے لئے منتظمین کا شکر گزار ہوں۔

☆ ☆ ☆

الکوکب الدری علی جامع الترمذی کی اہم خصوصیات

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الأمين سيدنا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين، أما بعد ۔

یہ بات راقم کے لئے سعادت وخوشی کی موجب ہے کہ ایک ایسی شخصیت پر قلم اٹھانے کا موقعہ مل رہا ہے جو ایک حقیقت شناس، بالغ نظر مفکر (۱) کے بقول ''برکۃ العصر'' تھی اور اس میں ذرہ برابر نہ مبالغہ ہے نہ کسی واقف کے نزدیک شک وشبہ کی گنجائش، حضرت شیخ الحدیثؒ (جو حضرت مولانا زکریا صاحب کے لئے صفت کے بجائے ان کا گویا عَلَم بن گیا تھا) کے برکات وفیوض اور افاضات کے پہلوؤں کا شمار واحاطہ آسان نہیں، راقم کا اس وقت صرف ''**الكوكب الدري على جامع الترمذي**'' کی اہم خصوصیات پر خامہ فرسائی کا ارادہ ہے۔

الکوکب الدری، جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں اگرچہ قطب الارشاد محدث عصر حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے ترمذی شریف کے درسی افادات کا مجموعہ ہے، جو ان کے ہی چہیتے اور ہونہار (جو بمنزلہ فرزند کے تھے) نے قلم بند کئے اور افادۂ عام کی غرض سے انھیں شستہ وشگفتہ عربی کا جامہ پہنایا؛ لیکن چوں کہ موصوف کے فرزند جلیل اور برکۃ العصر حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنے نہایت بیش قیمت حواشی کے ساتھ مزین کر کے شائع فرما کر استفادہ کے لئے وقف عام کیا؛ اس لئے حضرت شیخ الحدیث کے کارناموں میں ہی شامل سمجھنا بالکل صحیح اور برمحل ہے؛ کیوں کہ اگر حضرت اقدس کی مساعی شامل نہ ہوتیں

(۱) یہ بات بہت معروف ہے کہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کو متعدد بار ''برکۃ العصر'' فرمایا تھا۔

تو یہ کنز ''مخفی'' ہی رہتا اور اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا؛ چنانچہ حضرت کے سبط عزیز مولانا محمد شاہد صاحب زید فضلہ نے ''تالیفات شیخ'' کے اندر اسے شامل فرما کر تعارف کرایا ہے اس کے لئے متعدد بار طبع ہونے کی نوبت آئی۔

دوسری بار ندوۃ العلماء لکھنؤ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور مولانا سید محمد عاقل صاحب مظاہری کے مقدموں کے ساتھ عربی ٹائپ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی، آئندہ سطروں میں اسی لکھنوی نسخہ کے حوالے دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ اس نام (الکوکب الدری) کے انتخاب پر حسن ذوق کی داد نہ دینا بھی بے دادی ہوگی۔

ترمذی شریف کی شرحیں اور حواشی

صحاح میں ترمذی کا جو اہم مقام ہے اس سے کوئی صاحب علم ناواقف نہ ہوگا، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت بڑے بلیغ ومؤثر انداز میں بیان کرتے ہوئے آخر میں یہ تک فرمایا :

إنه كاف للمجتهد ومغن للمقلد ۔ (۱)

مگر عجیب بات ہے کہ اس کی شرح کرنے والے حافظ ابن حجرؒ وعلامہ عینیؒ نیز امام نوویؒ وخطابیؒ (جنھوں نے بالترتیب صحیح البخاری، صحیح مسلم اور ابوداؤد کی گرانقدر شرحیں لکھیں) کی سطح و مرتبہ کے علماء نظر نہیں آتے؛ بلکہ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ''تحفۃ الاحوذی'' سے پہلے کی مفصل شرح جس سے کتاب کا حق ادا ہوسکے نہیں ملتی (**الله اعلم بأسرار قضائه**) البتہ مختصر شروح یا حواشی وتعلیقات، متعدد قدیم وجدید اور عصر قریب کے اکابر علماء سے منقول اور دستیاب ہیں، ادھر کوئی ایک، سوا صدی کے اندر کبار علماء اہل درس کی درسی تقریروں کے منضبط کرنے کی برصغیر ہند میں ایک اچھی روایت قائم ہوئی تو متعدد قیمتی اور اہم علمی

یادداشتیں مرتب ہوکر منظر عام پر آگئیں ، ان میں غالبًا سب سے اولین اور نہایت بیش قیمت

(۱) حجۃ اللہ البالغہ:۱/۱۵۱، ط:منیریہ، دمشق۔

’’ ماقل ودل‘‘ اور’’ دریا بکوزہ‘‘ کا صحیح مصداق وہ مجموعۂ افادات ہے، جس کے تعارف کے بیان کا شرف اس وقت حاصل کیا جارہا ہے۔

اجمالی طور پر یہ کہنا یقیناً درست ہوگا کہ اس مختصر مجموعہ میں وہ سب کچھ ہے جو کسی کتاب کی شروح وتوضیح کے لئے کافی وافی ہو مگر اس کی تفصیل کے لئے بڑے بڑے دفتر درکار ہوں۔

یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہ سمجھی جائے گی کہ ترمذی شریف ،صرف احادیث صحاح وحسان وغیرہا کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ’فقہ مقارن‘ (تقابلی مطالعہ) کی بہترین اور اولین مثالوں میں سے ایک اہم ترین مثال ہے، اس جیسی کتاب کی شرح وبسط کے لئے جن جن اُمور کی ضرورت ہونی چاہئے انھیں یہ مجموعہ بطریق احسن مگر ایجاز واختصار سے پورا کرتا ہے اور کتاب کے ہر گوشہ کو’’ نیر تاباں‘‘ کی طرح منور کردیتا ہے (گویا اسم بامسمی کی اسے نمایاں مثال کہا جاسکتا ہے)۔

ترمذی شریف جیسی حدیث کی کتاب، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، جسے فقہ مقارن کی اہم مثال قرار دیا جاسکتا ہے کی شرح کے لئے جن جن اُمور کی ضرورت ہے ان کے ضروری عنوانات کچھ اس طرح ہوسکتے ہیں :

(۱) تحقیق متن (۲) تحقیق سند (۳) رفع تعارض وتطبیق (۴) ترجیح (اگر تطبیق ممکن نہ ہو) اور قول فیصل کا اظہار واختیار (۵) جو مسلک راجح ہو اس کی تائید (صاحب مجموعہ کے نزدیک عموماً فقہ حنفی راجح ہے ؛ لہٰذا اسی کی اکثر جگہ ترجیح وتائید) جس کے لئے کتاب اللہ، سنت رسول ، اقوال سلف سے استدلال (۶) فقہ اور اُصول وحدیث سے گہری مناسبت

(۷) دقیق ومشکل مقامات کا حل (۸) لغوی تحقیقات (۹) احادیث، بالخصوص نادر اور غریب الفاظ پر مشتمل احادیث کی تشریح اور مراد کا تعین (۱۰) فن رجال (۱۱) اُصولِ حدیث (۱۲) مقاصدِ شریعت کا لحاظ (۱۳) تقویٰ اور مسئولیت عند اللہ کا استحضار (۱۴) تزکیۂ نفس (۱۵) غامض ودقیق مضامین کی اطمینان بخش وسہل تشریح (۱۶) اقوال علماء کی تنقیح، عموماً ان کے فقہی اُصول کی روشنی میں (۱۷) ادبی ذوق (۱۸) فن طب کا لحاظ (ظاہر ہے کہ ان ہی عنوانات کے اندر احاطہ نہیں ہوجاتا اس کے علاوہ بھی بعض اور عنوانات ذکر کئے جاسکتے ہیں) اس کتاب’’ کوکب دری‘‘ میں یہ سب اُمور دستیاب ہوسکتے ہیں، مگر تلاش وجستجو اور غور وفکر شرط ہے، مزید برآں صاحب تقریر کی ذہانت وبصیرت اور ژرف نگاہی وبالغ نظری اور قلب کی پاکیزگی نے چار چاند لگادیئے اور سونے پر سہاگہ کا مصداق بنادیا۔ **فجزاهم الله أحسن الجزاء**۔

قبل اس کے کہ اس دعویٰ بلکہ دعاوی پر شہادتیں پیش کی جائیں ، یہ ذکر کردینا بھی مناسب بلکہ ضروری معلوم ہورہا ہے کہ اس مجموعہ کی قدر وقیمت بڑھانے میں مرتب کے ذوق جمیل ،فطرت سلیم ، ذکاوت طبع ،قوت اخذ اور ذہن ثاقب کا جہاں بہت کچھ دخل ہے وہاں ان کے خلف الرشید اور نجل عظیم شیخ العرب والعجم یعنی محدث جلیل (حضرت شیخ الحدیث مولانا ومرشد محمد زکریا قدس اللہ اسرارہم) کے نہایت بیش قیمت فنی حواشی کا بھی بڑا حصہ ہے ،انشاء اللہ یہاں اس کے بھی کچھ نمونے پیش کئے جائیں گے (ان حواشی کی قدر وقیمت کا فی الجملہ اعتراف بعض ایسے علماء نے بھی کیا ہے، جو’’ الکوکب الدری‘‘ کو چنداں اہمیت دینے پر آمادہ نہیں نظر آتے ،مثلاً اہل حدیث عالم مولانا عبید اللہ مبارکپوری نے اپنے والد مولانا عبد السلام کی مشہور تصنیف’’ سیرۃ البخاری‘‘ کے اخیر میں حاشیہ پر ترمذی کی نئی شروح وحواشی کا تعارف کراتے ہوئے’’ الکوکب الدری‘‘ کے بارے میں لکھا ہے :’’ ناشر حضرت شیخ الحدیثؒ کے تحشیہ نے کچھ کارآمد بنادیا ہے‘‘ (ص: ۳۶۵، طبع چہارم : ۱۹۸۷ء) ان جیسے

لوگوں کی طرف سے اتنے الفاظ میں تعریف کردینا اس کا ثبوت ہے کہ اس کتاب کے حواشی

بڑے ہی قابل قدر ہیں۔

اصل مقصد کے بیان سے پہلے ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ حضرت گنگوہیؒ اگرچہ مسلکاً پکے حنفی تھے، مگر ادب تمام ائمہ کا ملحوظ رکھتے تھے، چنانچہ ائمہ کا نام احترام سے ذکر فرماتے تھے اور ناموں کے ساتھ ترحیم وترضی کے کلمات بھی عموماً ذکر فرماتے تھے، اب ہم اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ان اُمور کے کچھ شواہد پیش کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر آیا، مگر خیال رہے ان سب کا احاطہ بہت مشکل بلکہ تھوڑے وقت اور مقالہ کے لئے جو حجم عموماً مقرر ہوتا ہے اس میں سمیٹنا عملاً ناممکن ہے، اس لئے ''مشتے نمونہ ازخروارے'' کے بطور اور ''إذا لم يدرك كله لم يترك كله'' کے اُصول پر چند ہی مثالوں پر اکتفاء کیا جائے گا۔

۱- یہاں مجتہدین کے اختلاف کی تنقیح کے سلسلہ میں یا یوں کہہ لیجئے ان کے فقہی اُصول کی تنقیح کا (ابتدائے کتاب سے) ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حدیث نبوی: ''على صاحبه الف تحية وسلام ، لا تقبل صلوٰة بغير طهور الخ''(۱) کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ومما ينبغي أن يتنبه له أن الأربعة رضوان الله عليهم وعلى من تبعهم قد تفرقت أصولهم التي يتفرع اختلافهم في المسائل الشرعية فمن ذلك أنهم اختلفوا في وجه ترجيح الروايات المختلفة فيما بينها فقال مالكؒ : يترجح رواية المدنيين على غيرهم ومالم يكن فيه شئ وجب المصير إلى غيرهم ، وقال الشافعيؒ : يترجح الحديث بقوة الإسناد فإذا ثبتت الرواية وجب القول بمقتضاها ، وإن خالفت بعض الأصول الشرعية الثابتة بالروايات الأخر أو

> الآيات ، غاية الأمر أن تلك الجزئية بنوعها تستثنىٰ عن هذه الكلية ، وكان رضى الله عنه مدة إقامتها بالحجاز يعمل برواياتهم لكونها أصح عنده ، فلما ورد مصر أخذ برواياتهم فتفرقت أقاويله في مسألة واحدة وهذا هو المراد بما يذكر في (كتب) الفقه

(۱) جامع الترمذی، کتاب الطہارۃ:۱، مسلم، کتاب الطہارۃ:۵۳۵۔

> من قوله القديم والجديد بل الذى ثبت أن أقاويل ثلاثة أو أزيد في بعض المسائل ....
>
> وأما أحمد بن حنبل فأكثر أخذه بظاهر الحديث لا غير ، وقلما يسيغ في الحديث اجتهاداً ، وإذا تعددت الروايات في مسألة كان العمل عنده على أيها أحب بل كان له العمل بهذا تارة وبذلك أخرىٰ ، وأما إمامنا العلامة (أبوحنيفة) فقال : إن النبى صلى الله عليه وسلم كان مقننا يقنن القوانين ويضع الأصول ليعمل بها وترجع الفروع إليها وهى العمدة في العمل ، فأما ماورد من الجزئيات التي خالفت بظاهر تلك الأصول المقررة وجب عند الإمام الهمام جمعها بتلك الأصول بضرب من التأويل كزيادة قيد أو تعميم أو تخصيص أو غير ذلك من وجوه التوفيق وما لم يكن جمعها بالأصول وجب قصرها على موردها ، وكان عاما استثنى من الأصول بشخصه لا بنوعه ۔ (۱)

جن اُمور کی جانب توجہ کی ضرورت ہے ان میں سے ایک یہ

ہے کہ ائمہ اربعہ (رضوان اللہ علیہم وعلی من تبعہم) کے وہ اُصول جن سے مسائلِ شرعیہ میں اختلاف متفرع ہوتے ہیں وہ متفرق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مختلف فیہ روایات کے مابین ترجیح کی صورت میں ان کے درمیان اختلاف ہے؛ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں: ''مدنی راویوں کی روایت کو دوسرے راویوں کی

(۱) باختصار یسیر: ۱/۲۶-۲۷۔

روایات پر ترجیح دی جائے گی اور جس مسئلہ میں ان سے کوئی روایت نہ ہو تو دوسرے راویوں کی طرف رُجوع کرنا واجب ہے'' امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''سندوں کی قوت کی بنیاد پر حدیث کو ترجیح دی جائے گی؛ چنانچہ جب روایت ثابت ہوجائے تو اس کے تقاضہ کے مطابق اختیار کرنا واجب ہے، اگرچہ وہ دوسری روایات وآیات کے ذریعہ بعض ثابت شدہ شرعی اُصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جس کا نتیجہ وحاصل یہ ہوگا کہ وہ جزئیہ مع اپنی نوعیت کے اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوجائے گا، امام شافعیؒ اپنے قیام حجاز کی مدت میں اہل حجاز کی روایات پر عمل کرتے تھے اور جب وہ مصر گئے تو وہاں کی روایات پر عمل پیرا ہوگئے، اس لئے کہ ایک ہی مسئلہ میں ان کے اقوال مختلف ہوگئے اور (کتب) فقہ میں جو مذکور ہوتا ہے کہ یہ ان کا قول قدیم ہے اور یہ قول جدید ہے اس سے یہی مراد ہے؛ بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ بعض مسائل میں ان کے تین تین یا اس سے بھی زائد اقوال ہیں۔

جہاں تک امام احمد بن حنبلؒ کا تعلق ہے تو وہ اکثر ظاہر

حدیث ہی کو اختیار کرتے ہیں، خال خال ہی وہ حدیث میں اجتہاد کو راہ دیتے ہیں اور جب ایک ہی مسئلہ میں روایات متعدد ہوں تو ان کے نزدیک ان میں سے کسی پر بھی عمل کرلینا محبوب ہے؛ بلکہ (ان کے نزدیک اس کی بھی گنجائش ہے) کہ کبھی ایک روایت پر عمل کرے، کبھی دوسری روایت پر اور جہاں تک ہمارے امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تعلق ہے تو وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ مقنن (قانون ساز) تھے، قوانین بناتے تھے، اُصول وضع کرتے تھے تاکہ ان پر عمل کیا جائے اور فروع کو ان کی طرف لوٹایا جائے، عمل کی بنیاد ان ہی پر ہوگی جہاں تک ان جزئیات کا تعلق ہے جو بظاہر ان مقررہ اُصولوں کے خلاف روایات میں ہیں تو امام عالی مقام کے نزدیک انھیں ان اُصولوں پر کسی قسم کی تاویل کے ذریعہ لوٹایا جائے گا مثلاً کسی قید کے اضافہ کے ذریعہ یا تعمیم وتخصیص کے ذریعہ یا تطبیق کی دوسری شکلوں کے ذریعہ منطبق کرنا واجب ہوگا اور اگر اُصول کے ساتھ ان جزئیات کا ارتباط ممکن نہ ہو تو ان کو ان ہی کے مورد ہی پر رکھا جائے گا، گویا وہ خاص جزئیات عام اُصول سے مستثنیٰ ہے نہ کہ اس کے تمام اقسام۔

غور فرمائیے کہ ائمہ اربعہ کے اُصول ان چند سطروں میں کس خوبی کے ساتھ بیان ہوگئے جس سے صاحب تقریر کے صرف حنفی اُصول پر نہیں تمام ائمہ کے اُصول پر حاوی ہونے اور ان کے درمیان باریک فرق تک سے باخبر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

۲- سند کے بارے میں افادات کی بھی ایک مختصر مثال پیش کی جاتی ہے، امام ترمذیؒ نے ایک حدیث کی سند بیان کرتے ہوئے، سماک نامی راوی کا دوبارہ (ایک بار

تحویل کے بعد) ذکر کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

انما كرر قوله عن سماک ليعلم موضع التحويل ، ولأنهما روايتان على أصل أهل الحديث (أى المحدثين) فإن السماک فى الأول منسب وفى الثانى غير منسب وتختلف الرواية عندهم لمثله ۔ (۱)

مطلب: عن ’’سماک‘‘ مکرر ذکر کیا؛ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سند میں تحویل کہاں ہوئی ہے؟ اور اس لئے بھی کہ محدثین کی اصل

(۱) الکوکب الدری: ۱/۲۶

کے مطابق یہ دو روایتیں ہیں سماک کا ذکر پہلے میں نسب کے ساتھ ہے اور دوسری میں بغیر نسب کے، محدثین کے نزدیک اس جیسی شکلوں سے روایت مختلف ہو جاتی ہے۔

۳- حدیث کی لطیف تشریح اور مراد کی تعیین کا ایک نمونہ: حدیث شریف ’’**اذا توضأ العبد المسلم أو المؤمن فغسل وجهه خرجت من وجهه كل خطيئة حتى يخرج نقيا من الذنوب**‘‘(۱) کی شرح اس طرح فرمائی :

لما كان الحكم على المشتق يستلزم عليه ماخذ الاشتقاق للحكم وجب القول بأن ذلک الموعود من الأجر إذا كان المتوضى قد أسلم وجهه لله وقد أيقن بقلبه الحضور إلى الله ولما كان كذلک كان العبد تائبا إلى الله تعالىٰ بقلبه نادما على ما فرط فى جنب الله مقنعا عما اقترفته يداه إذا التيقن بالحضور والإسلام له لا يتركه لاهيا عن ذلک وهذه هى التوبة

التى لا تغادر صغيرة ولا كبيرة ولا تترک فى كتاب حسابه جريمة ولا جريرة وعلى هذا لا يفتقر إلى التخصيص بالصغائر ، وما ذكروا فى اسفارهم من أن المراد الصغائر فقط محتمل ويحمل على أن المراد بلفظ العام بعض أفراده والقرينة عليه قوله تعالىٰ : ’’ إن تجتنبوا كبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سيآتكم ‘‘ علق تكفير السيأت بالاجتناب عن الكبائر ۔ (۲)

چوں کہ مشتق پر حکم لگانا حکم کے ماخذ کی علیت کو مستلزم ہے، اس لئے

(۱) جامع الترمذی، کتاب الطہارۃ: ۲، مسلم، کتاب الطہارۃ: ۳۲-۳۳۔
(۲) الکوکب الدری: ۱/۳۲۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ حدیث میں جس اجر کا وعدہ ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ وضو کرنے والے نے خود کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہو اور دل میں اللہ کی بارگاہ میں حضوری کا یقین رکھتا ہو اور جب ایسا ہوگا تو بندہ اللہ کی جانب رجوع کرنے والا حقوق اللہ میں اپنی کوتاہیوں پر دل ہی دل میں نادم اور دونوں ہاتھوں نے جو کچھ گناہ کئے ہوں گے ان پر شرمسار ہوگا، اس لئے (دربار خداوندی) میں حاضری اور اس کی جانب جھکاؤ کا یقین (کامل) اس سے اس کو غافل نہیں رکھے گا، یہی وہ توبہ ہے ج س سے چھوٹے بڑے تمام گناہ مٹ جاتے ہیں اور اس کے نامۂ اعمال میں کسی قسم کا کوئی جرم اور گناہ باقی نہیں رہتا ہے، اس بنیاد پر صغائر کے ساتھ تخصیص کی بھی ضرورت نہیں اور عام

علماء نے اپنی کتابوں میں جو یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے صرف صغائر مراد ہیں یہ بھی ایک محمل ہے اور اسے اس پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ لفظ عام سے اس کے بعض افراد مراد ہیں، اس پر قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''إن تجتنبوا الآية''۔

اس توجیہ وتشریح بالخصوص اس کے پہلے حصہ کی لطافت اہل ذوق محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے، مذکورہ بالا توجیہ کی مزید وضاحت حضرت شیخ الحدیثؒ کے حاشیہ سے ہوتی ہے، اسے بھی یہاں ذکر کردینا 'سونے پر سہاگہ' کا مصداق ہوگا، اسی صفحہ کے حاشیہ میں ''لما كان الحكم'' عبارت پر حضرت شیخ الحدیث تحریر فرماتے ہیں :

يعنى عبر النبى صلى الله عليه وسلم بلفظ " المسلم " أو " المؤمن " ولم يعبره بلفظ " الرجل " فكان فيه إشارة إلى مراعاة صفة الإسلام أو الإيمان ۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''المسلم''،''المؤمن'' کے لفظ سے تعبیر کیا ''الرجل'' (انسان) کے لفظ سے نہیں، چوں کہ اس میں اسلام یا ایمان کی صفت کی رعایت کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں حضرت شیخ نے اپنے والد ماجدؒ کی ایک اور لطیف توجیہ بھی نقل فرمائی ہے اس کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہیں اور وہ یہ ہے :

إن المراد بالخطيئة الأعم المطلق لكن لا يمكن أن يبقى على ذمة المسلم كبيرة ، فإن المسلم إذا صدر عنه كبيرة فيبعد عنه أن يغفل عنه حتى يغسلها بعبرات التوبة فمن شأن المسلم أن لا يبقى عليه إلا صغيرة ۔

مطلب : بے شک ''خطیئۃ'' سے مراد عام اور مطلق ہے؛ لیکن

یہ ممکن نہیں کسی مسلمان پر کبیرہ گناہ باقی رہ جائے؛ کیوں کہ کسی مسلمان سے کہ جب کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوجاتا ہے تو یہ اس سے بعید ہے کہ وہ اس سے غافل رہے، تا آنکہ توبہ کے آنسوؤں سے اس کو دھو نہ ڈالے، تو درحقیقت مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس پر صرف صغیرہ گناہ ہی باقی رہے۔

۴- مشکل مقامات کے حل کی ایک مثال، حدیث :

لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد ، مسجد الحرام ومسجدى هذا والمسجد الأقصىٰ ۔ (۱)

کجاوہ نہیں باندھا جائے گا (مستقل سفر نہیں کیا جائے گا) مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام اور میری یہ مسجد اور مسجد اقصیٰ۔

(۱) بخاری، کتاب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکہ ومدینہ:۱۱۸۹، ترمذی، کتاب الصلوٰۃ:۳۲۶۔

إعلم أن فى مسألة شد الرحال إلى الأمكنة الشاسعة والديار النازحة خلافا بين الأئمة فمنهم من حمل على أن النهى منه عليه السلام إنما صدر لشفقته على أمته ، فإنه لو سافر أحد إلى مسجد مصر بعيد يلاقى فى سفره مشاق وتكاليف وليس له فى ذلك المسجد الذى ذهب إليه كثير أجر ولذا لم يذكر فيها مسجد قباء لأن الصلوٰة فيها ليست إلا كعمرة ، وثواب العمرة حاصل بجلوسه فى مسجده بذكر الله إلى الطلوع وأما إذا سافر إلى هذه المساجد الثلاثة التى ذكرت ففى أجرها انجبار لما ناله فى السفر من مكروهات ۔ (۱)

مطلب: جان لیجئے کہ دور دراز کی جانب ”شدرحال“ (مستقل سفر کرنے) کے مسئلہ میں ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف ہے، ان میں سے بعض نے اس کو اس بات پر محمول کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت پر شفقت کی وجہ سے ممانعت کا حکم صادر فرمایا، اس لئے کہ اگر کوئی دور دراز شہر کی کسی مسجد کا سفر کرے اور سفر میں تکلیف ومشقت اُٹھائے، اس کو اس مسجد میں جس کی جانب وہ گیا ہے بہت زیادہ اجر حاصل نہ ہوگا؛ اس لئے ان میں مسجد قباء کا ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ اس میں نماز پڑھنا ایسے ہی ہے جیسے عمرہ کرنا اور عمرہ کا ثواب طلوع آفتاب تک اپنی مسجد میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرنے سے بھی حاصل ہوجاتا ہے، ہاں

(۱) الکوکب الدری: ۱/۳۲۱۔

جب وہ ان مذکورہ تین مسجدوں کا سفر کرتا ہے تو ان کے اجر وثواب سے سفر کی مشقتوں کی تلافی ہوجاتی ہے۔

۵- حدیث کے غامض ودقیق مضامین کی گرہ کشائی اور مقاصد شریعت پر عبور کا نمونہ، امام ترمذی نے ”**باب ماجاء فی الصلاۃ فی الحیطان**“ کا عنوان قائم کیا ہے، اس پر عام لوگوں کا متعجب ہونا مستبعد نہیں کیوں کہ حیطان (باغات) میں نماز صحیح ہونے میں شبہ کی بظاہر گنجائش نہیں معلوم ہوتی، پھر امام نے ایسا عنوان کیوں قائم کیا؟ اس کی عقدہ کشائی حضرتؒ نے یوں فرمائی:

الحائط بستان علیه إحاطة ولما کان ههنا مظنة توهم عدم جواز الصلاة علی أرض البستان لما تلقی فیها من المزابل، رفعه النبی صلی الله علیه وسلم بالصلاة علیها۔

حائط وہ باغ ہے جس کی چہار دیواری ہو، باغ کی زمین میں چوں کہ کوڑے کرکٹ پھینکے جاتے ہیں اس لئے نماز کے جائز نہ ہونے کا ایک وہم ہوسکتا تھا، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نماز پڑھ کر اس وہم وخیال کو دفع فرمادیا۔

اس کے بعد ایک اہم اصل شرعی کا بھی اظہار فرمایا:

وهذا تصریح منه صلی الله علیه وسلم بأن لتبدیل الماهیة تاثیرا فی تنجیس الأشیاء وتطهیرها۔

مطلب: اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بات کی بھی گویا صراحت مل جاتی ہے کہ اشیاء کی ناپاکی اور پاکی میں ماہیت کی تبدیلی کا اثر ہوتا ہے۔

پھر اس اصل کی مزید توضیح فرمائی:

اعلم أن مسألة تبدل الماهیة کلت فیه الأفهام وزلت فیه الأقدام وأصله أن تبدل المادة والصورة کلیتهما مؤثر فی ذلک لا تبدل الصورة فقط کما توهمه بعضهم إذ لو کان کذلک لکان خبز العجین المخلوط بالبول طاهرا ولم یقبل به أحد۔ (۱)

جان لیجئے کہ ماہیت کے تبدیل ہونے کا مسئلہ ایسا ہے جس میں عقل وفہم بھٹک جاتے ہیں اور قدم پھسل جاتے ہیں، اس بارے میں اُصول شرعی یہ ہے کہ مادہ اور صورت دونوں کا بدلنا (حکم شرعی بدلنے میں) اثر انداز ہوتا ہے، صرف صورت کا بدلنا نہیں، جیسا کہ کہ بعض حضرات کو وہم ہوگیا ہے؛ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو پیشاب سے گوندھے ہوئے آٹے کی روٹی پاک ہوتی

اور ایسا کسی نے نہیں کہا ہے۔

حضرتؒ نے یہاں اس مسئلہ پر خاصی تفصیلی گفتگو فرمائی ہے،مگر اختصار کی غرض سے اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے، باذوق سامعین نے اسی جگہ زبان کی چاشنی اور ادبیت کا لطف بھی اُٹھایا ہوگا،اسی (دقیق ومشکل مقام کے حل) کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے :

حدیث شریف میں خواب کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے ’’وهي على رجل طائر‘‘ (۲) اس کا مطلب بہت سے شراح حدیث کے لئے عموماً لاینحل سا بنا رہا ہے اور اطمینان بخش توجیہ عموماً نہیں کر پائے ہیں،مگر حضرت نے جو توجیہ فرمائی ہے وہ بڑی حد تک قابل فہم اور جی لگتی ہے،فرماتے ہیں :

لعل مراده صلى الله عليه وسلم بكونه على رجل طائر أن صاحبه لا يكون منه استقرار على أمر ما وإنما

(۱) الکوکب الدری: ۱/ ۳۲۷۔

(۲) سنن ابن ماجہ، ابواب تعبیر الرؤیا: ۳۹۱۴۔

يتخلج في نفسه تعبير لرؤياه ثم يبدو له ثان وثالث فيأخذ في تغليط ما فهم أولا وهكذا فكان رؤياه على رجل طائر فلا يستقر على مقر حتى إذا عبره أول المعبرين رسخ قوله في قلبه لعدم المزاحم ۔ (۱)

’’على رجل طائر‘‘ (پرندہ کی ٹانگ پر ہونے) سے شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہو کہ خواب دیکھنے والے کو کسی حالت میں قرار نہیں ہوتا اور خواب کی تعبیر اس کے لئے ایک خلجان کا سبب بن جاتی ہے ایک کے بعد دوسری اور تیسری تعبیر کی طرف متوجہ ہوتا ہے یعنی پہلے اس نے جو مطلب سمجھا تھا اس کو غلط ٹھہرانے میں لگ جاتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے گویا

کہ اس کا خواب پرندہ کی ٹانگ پر ہوتا ہے جسے کسی حالت میں قرار نہ ہو، تا آنکہ اس کو سب سے پہلے معتبر تعبیر بتانے والے نے تعبیر بتائی تو اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے، اس لئے کہ اس کے بالمقابل کوئی تعبیر نہ تھی۔

۶- حدیث کے درسی حلقوں میں یہ بات معروف ومسلم ہے کہ متعارض احادیث میں تطبیق دینا ایک بہت ہی اہم کام ہے، اس تطبیقی عمل کا ہی ایک حصہ یہ بھی ہے کہ حدیث کی ایسی توجیہ کی جائے جس سے دوسری حدیث سے تعارض رفع ہوجائے اور اگر اس عمل میں کسی امام کی تائید یا اس پر وارد ہونے والا کوئی اعتراض رفع ہوجائے تو بہت بہتر سمجھا جاتا ہے، اس کی بہت سی مثالیں جا بجا اسی کتاب (الکوکب الدری) میں ملتی ہیں ان میں سے ایک یہاں نقل کی جاتی ہے :

عموماً اہل علم یہ جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عشری زمین میں پیدا ہونے

(۱) الکوکب الدری: ۳/ ۱۹۸۔

والی ہر چیز کی ہر مقدار میں عشر (زکوٰۃ) واجب ہوتا ہے، دیگر ائمہ کا یہ مسلک نہیں ہے جس کے لئے ان حضرات کی دلیل حدیث ’’ليس في الخضراوات صدقة‘‘ (۱) ہے، حضرت گنگوہیؒ اس حدیث کی (امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے) یہ توجیہ فرماتے ہیں :

هذا عند الإمام مؤول بأن الخطاب فيه ليس للمالك وإنما ذلك حكم لعمال الصدقة إذا الواجب في الخضراوات لا يأخذه السلطان وإنما يدفعه إلى الفقير بنفسه ۔ (۲)

مطلب: اس (حدیث) کی امام اعظمؒ کے نزدیک تاویل کی گئی ہے، اس طور پر کہ اس میں مالک سے خطاب نہیں؛ بلکہ یہ صدقہ

کے محصلین کو حکم ہے کہ وہ سبزیوں کی زکوٰۃ وصول نہ کریں اس لئے کہ سبزیوں میں واجب ہونے والے (عشر) کو سلطان نہیں لیتا ہے؛ بلکہ مالک خود ہی اسے فقیر کو دے دیتا ہے۔

اس طرح کی مثالیں بہت ملتی ہیں، یہاں ایک اور مثال نقل کی جاتی ہے: اہل علم میں عام طور پر معروف ہے کہ حنفیہ کے یہاں مسجد میں نماز جنازہ (بلا عذر) پڑھنا مکروہ ہے؛ مگر احادیث میں بعض واقعات اس قبیل کے ملتے ہیں، ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر جس حدیث میں آیا ہے اسے بیان فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على سهل بن بيضاء في المسجد استدلوا بذلك لكنه غير تام فإنه صلى الله عليه وسلم صلى في المسجد لعذر المطر ولذلك لم يصل على النجاشي في المسجد الذي تصلى فيه الصلوات الخمس مع أنه لم تكن الجنازة

(۱) ترمذی، کتاب الزکوٰۃ: ۶۳۸۔ (۲) الکوکب الدری: ۲/۱۵۔

حاضرة فعلم أن الصلاة في المسجد من غير عذر مكروه۔ (۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل بن بیضاء کی (نماز جنازہ) مسجد میں پڑھائی، کچھ فقہاء نے اس سے استدلال کیا ہے؛ لیکن یہ استدلال ناتمام ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی وجہ سے مسجد میں نماز پڑھی تھی، اسی وجہ سے نجاشی پر ایسی مسجد میں نماز جنازہ نہیں پڑھی جس میں پنج وقتہ نمازیں پڑھی جاتی تھیں؛ حالاں کہ جنازہ سامنے موجود نہیں تھا، چنانچہ

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں نماز جنازہ بغیر عذر کے پڑھنا مکروہ ہے۔

۷- حضرت گنگوہیؒ — جیسا کہ واقفین جانتے ہیں — فن طب کے ماہر تھے، چنانچہ بعض مواقع پر اس فن کی روشنی میں حدیث کی توجیہ فرمائی ہے، چنانچہ کتاب الطلاق میں (باب العدۃ میں) زمانۂ جاہلیت کے اندر معتدہ کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے:

وقد كانت إحداكن في الجاهلية ترمي بالبعرة على رأس الحول۔

تم جیسی ہی (معتدہ) عورت جاہلیت میں سال کے سرے پر مینگنیاں پھینکتی تھی۔ (۲)

سنن ابوداؤد میں اس اجمال کی تفصیل کرنے والا جو واقعہ مذکور ہے وہ بڑا ہی حیاسوز

(۱) مسلم، کتاب الجنائز: ۹۹-۱۰۱، ترمذی، کتاب الجنائز: ۱۰۳۳۔

(۲) ابی داؤد، کتاب العدۃ، باب احداد المتوفی عنها زوجها: ۱/۳۱۴، ط: مجیدی کانپور، یہ واقعہ تفسیر احکام القرآن للجصاص: ۱/۴۲۲ میں بھی سورۃ البقرۃ کی آیت "لا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن" کی تفسیر کے تحت نقل کیا گیا ہے۔

اور نا قابل بیان ہے (خاص طور پر اس کا آخری جزء، مدارس میں ترمذی کا جو نسخہ متداول ہے اس کے حاشیہ پر بھی اسے مختصراً نقل کیا گیا ہے) جس میں یہ ہے:

ثم تؤتى بدابة حمار أو شاة أو طائر تفتض به فلما تفتض بشئ إلا قد مات۔ (۱)

پھر کوئی چوپایہ گدھا یا بکری یا کوئی (بڑا) پرندہ لایا جاتا تھا کہ اس سے عدت کا سلسلہ توڑا جائے، اس طرح کہ اس عورت کی شرمگاہ کو اس جانور سے مس کیا جاتا، کم ہی ایسا ہوتا کہ وہ جس چیز

سے عدت توڑتی اس کی موت نہ ہوجاتی۔

اس کی طبی توجیہ کرتے ہوئے حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں :

لعل السبب فی موتها ما یحدث فی المرأة من السمیة لعدم الاغتسال وعدم خروجها فی الفضاء والمکان الواسع ۔ (۲)

شاید اس سے مرنے کی وجہ یہ ہو کہ غسل نہ کرنے اور فضا اور کھلی جگہ میں نہ نکلنے کی وجہ سے عورتوں میں سمیت (زہریلا اثر) پیدا ہوجاتی ہے، (اگرچہ جانور کے مرجانے کی اور بھی وجوہ ہوسکتی ہیں، مثلاً عورت کا اذیت سے بے چین ہوکر اسے زور سے پٹکنا۔

طب ہی کے قبیل کی ایک اور اہم مثال یہ ہے کہ حضرتؒ نے وہ غلط فہمی دور کی ہے جو ''**الحبة السوداء**'' (۳) کی تاثیر کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں، ان سے عموماً لوگوں کے درمیان ہوجاتی ہے کہ ہر مرض کے لئے بہرحال اس کے اندر شفاء ہے، حضرت نے اس کی صحیح مراد بایں طور بیان فرمائی جس سے غلط فہمیاں پوری طرح دور ہوجاتی ہیں۔

(۱) ابوداؤد، کتاب الطلاق: ۲۲۹۹۔ (۲) الکوکب الدری: ۲/ ۲۷۲۔
(۳) بخاری، کتاب الطب: ۵۶۸۷-۵۶۸۸، ترمذی، ابواب الطب: ۲۰۴۱۔

ولا یستلزم ذلک أن یکون کل ترکیبه مفردا أو مرکبا لکل داء بل المراد أنه مفید لکل داء اذا استعمله الواقف بقاعدة تناسب مزاج المریض بزیادة بعض الأدویة وغیرها ۔ (۱)

اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ صرف (کلونجی) یا اس کے ساتھ کچھ ملا کر جس ترکیب سے بھی استعمال کیا جائے ہر مرض کے لئے فائدہ مند ہوجائے؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر مرض کے لئے

مفید ہے اس وقت جب کہ استعمال کرنے والا اس کے صحیح طریقہ سے واقف ہو مثلاً بعض دواؤں وغیرہ کے اضافہ کے ساتھ (استعمال کرنا) جو مریض کے مزاج کے موافق ہو۔

حضرت گنگوہیؒ کی یہ تشریح بڑی ہی چشم کشا، غلط فہمیوں کو دور کرنے والی اور اُصولی انداز کی ہے، اس سے ایسی تمام آیات واحادیث کا صحیح مفہوم ومصداق متعین کیا جاسکتا ہے جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

۸- جیسا کہ باخبر جانتے ہیں کہ حضرت گنگوہیؒ کا اصل رنگ تو تزکیہ واحسان کا تھا جس کی جھلک اس مقدس ہستی کی ہر ہر ادا میں نظر آتی تھی تو بھلا حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے درس میں کیوں نہ محسوس ہوتی؟ مگر اس رنگ میں عالمانہ بصیرت اور محدثانہ اعتدال تھا، افراط وتفریط نہ تھی، کتاب میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مگر یہاں صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، مشہور حدیث: ''**إن الدنیا ملعونة ملعون ما فیها إلا ذکر الله وما والاه**'' (۲) (بے شک دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے) کی جو تشریح حضرتؒ نے فرمائی وہ ان کے فن تصوف اور حدیث وفقہ میں کامل ہونے کی ایک اہم شہادت قرار دی جاسکتی ہے، حالاں کہ عموماً اس

(۱) الکوکب الدری: ۳/ ۸۳۔ (۲) ترمذی، ابواب الزہد: ۲۳، حدیث نمبر: ۲۳۲۳۔

حدیث سے ترک دنیا مطلوب ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے، مگر حضرت فرماتے ہیں :

'' وما والاه '' أی والذی والاه الله أی أحبه أو المعنی والذی یکون سبب ذکر الله واتبعه (واتباعه) فیدخل فی ذلک أسباب الذکر کالمناکح والمعایش والعلوم الأدبیة وغیر هما مما یحتاج إلیه فی ذکره سبحانه ۔ (۱)

''ماوالاہ'' یعنی جس چیز سے اللہ نے موالات کی یعنی اسے چاہ لیا،

یا یہ معنی ہیں کہ جو چیز اللہ کے ذکر اور اس کے اتباع کا ذریعہ ہو تو
اس میں ذکر کے اسباب مثلاً مناکحت، معاشرت، ادبی علوم وغیرہ
جن کی اللہ کے ذکر کے لئے ضرورت ہے سب داخل ہو گئے۔

معلوم ہوا کہ فکر آخرت کے ساتھ جو عمل بھی شریعت کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے وہ سب ذکر اللہ میں شامل ہونے کے لائق ہے، ایسی قیمتی بات وہی کہہ سکتا ہے جو اس بحر کا شناور ہو۔

۹- تفسیر قرآن مجید پر بھی حضرت کی نظر بڑی گہری اور محدثانہ تھی، سورۃ الانعام کی آیت ''لـا تـدركـه الأبـصار وهو يدرك الأبصار'' (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں وہ آنکھوں کا ادراک کرلیتا ہے) کے تحت امام ترمذی نے حضرت عائشہؓ کا یہ معروف اثر نقل کیا ہے جسے آں مخدومہ کے مشہور شاگرد حضرت مسروق رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں :

كنت متكأ عند عائشة — رضى الله عنها — فقالت : يـا أبا عائشة ! ثلاث من تكلم بواحدة منهن فقد أعظم الفرية على الله ، من زعم أن محمداً رأى ربه فقد أعظم

(۱) الکوکب الدری: ۳/۲۳۸۔

الـفـرية على الله ، والله يقول : " لا تدركه الأبصار وهو يدرك الأبصار وهو اللطيف الخبير . (۱)

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا، انھوں نے مجھ سے فرمایا: اے ابو عائشہ! تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک کا بھی جو شخص قائل ہوا اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا، (ان میں سے ایک وہ ہے) جس نے

یہ دعویٰ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تو اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا؛ کیوں کہ اللہ کا ارشاد ہے ''لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ''۔

اس پر حضرت قدس سرہ علم وعرفان سے مملو کیا ہی عجیب کلام فرماتے ہیں :

...... ومن ادعىٰ رؤيته بالأبصار التي هي له في الدنيا فلا شك أنه كذب بآيات ربه ، ثم ان ابن عباس رضى الله عنهما قائل بها ، ولا يبعد الجمع بين المذهبين بأن رؤيته وقعت بقوة قلبه الشريف وقد حلت في بصره ، إذا فمن قال برؤيته بقلبه صدق كما قال برؤيته بباصرته .

جو اپنی آنکھوں کے ذریعہ دیدارِ الٰہی کا دعویٰ کرے جو دنیا میں اسے میسر ہیں تو بلاشبہ اس نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے قائل بھی ہیں، دونوں مسلکوں میں جمع وتطبیق مستبعد نہیں ہے، بایں طور کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار الٰہی اپنے قلب مطہر کی قوت سے تھا اور وہ قوت

(۱) بخاری، کتاب التفسیر: ۴۸۵۵، ترمذی، ابواب تفسیر القرآن سورۃ الانعام: ۳۰۶۸۔

ان کی نگاہوں میں بس گئی تھی؛ چنانچہ جس نے دل کے ذریعہ رؤیت کا قول اختیار کیا اس کا کہنا تو صحیح ہے جیسا کہ اس کا قول جس نے نگاہوں کے ذریعہ دیدار کے بارے میں کہا ہے۔

اس جگہ حضرت نے وہ عقدہ بھی حل فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ نے اسے ''علی اللہ

الفرية ''(اللہ پر بہتان) کیوں فرمایا؟ بظاہر تو''الفرية على رسول الله صلى الله عليه وسلم'' کہنا چاہئے تھا، وہ اس طرح پر کہ :

فلأنه تعالىٰ يقول فى كتابه " وإن لم تفعل فما بلغت رسالته " ثم انه تبارك و تعالىٰ دعا فى كتابه رسولا ونبيا ولم يحول رسالته منه إلى غيره صلى الله عليه وسلم ، فعلم بذلك أنه يكتم أمرا مما أمر بتبليغه ـ (۱)

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مقدس میں فرماتا ہے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیام نہ پہنچایا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں رسول اور نبی کو پکارا؛ لیکن اپنا پیغام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو محول نہ کیا اس سے معلوم ہوا کہ جس بات کی تبلیغ کا اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا اسے آپ نے نہیں چھپایا (گویا اللہ کے رسول کا فرمانا، اللہ ہی کا فرمانا ہے)

ـ

۱۰- آخر میں ایسی مثال پیش کی جاتی ہے جسے حضرتؒ کی ذہانت وفطانت کے ساتھ احادیث نبوی کے مغز تک پہنچنے کی ایک عمدہ شہادت قرار دیا جاسکتا ہے، معروف حدیث نبوی''أنا عند ظن عبدبی'' کی منفرد، مختصر اور سادہ انداز میں تشریح کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا :

ولا يذهب عليك الفرق بين السفه (السفاهة)

(۱) الکوکب الدری: ۴/۱۳۶-۱۳۷ـ

والظن ، والموعود هو الثانى دون الأول ، مثل الفاسق يظن له نعما : زيلة وهو مصر على كبائره فيكون كمن يرجو بيادر الحبوب ولم يبذر وهو

قريب عما ذكره سبحانه فى كتابه فقال : " ولئن أقناه نعماء بعد ضراء مسته ليقولن هذا لى وما اظن الساعة قائمة ولئن رجعت إلى ربى إن لى عنده للحسنىٰ " فبحسبك سفاهته فى عقله ، جزم بنيل الثواب هناك وإن لم يجزم بالحشر والنشر ـ (۱)

اور آپ کے سامنے سے سفاہت اور ظن کا فرق اوجھل نہ ہوجائے، دوسرے (ظن) پر وعدہ ہے پہلے (سفاہت) پر نہیں ہے، جیسے کہ فاسق اپنے لئے بڑی بڑی نعمتوں کا گمان کرتا ہے اور کبیرہ گناہوں پر بھی اڑا رہتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے غلوں کے کھلیانوں کی اُمید ہو اور اس نے ایک تخم بھی زمین میں نہ ڈالا ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے قریب تر ہے'' اور جب ہم اس کو اس مصیبت کے بعد، جو اسے پہنچی تھی، نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ ضرور کہنے لگتا ہے کہ یہ میرے لئے ہے (میرا حق ہے) اور میں تو قیامت کے آنے کا گمان بھی نہیں رکھتا؛ لیکن اگر اپنے رب کی طرف لوٹایا جاؤں تو اس کے پاس میرے لئے خیر ہی رکھی ہے، اس کی عقل کے ناقص ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ ثواب پانے کو وہاں پورے جزم کے ساتھ بیان کیا اگرچہ حشر ونشر کو جزم کے ساتھ نہیں بیان کیا۔

(۱) الکوکب الدری: ۴/۳۷۶ـ

سردست بس ان دس قسم کی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے''تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ'' بلا شبہ''الکوکب الدری''فن حدیث بالخصوص ترمذی سے اشتغال رکھنے والے اساتذہ وطلبہ

کے لئے نعمت عظمیٰ ہونے کے ساتھ علم کا وہ بحر بیکراں ہے کہ اس میں جتنی غواصی کی جائے گی آبدار اور قیمتی موتی برآمد ہوتے رہیں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين .

☆ ☆ ☆

مجموعۂ قوانین اسلامی

مسلم پرسنل لا سے متعلق احکام شریعت کا دفعہ وار مرتب مجموعہ

سوال:- وہ کون سے عوامل ومحرکات تھے جو ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' نامی کتاب کی تدوین کا باعث بنے ؟ مسلم پرسنل لا سے متعلق ایسے مجموعۂ قوانین کی ضرورت کیوں کر محسوس کی گئی اور اس کتاب کی تدوین کے اصل محرک کون تھے؟

جواب:- اس ضرورت کا احساس تو غالباً بہت پہلے سے تھا، ۱۹۳۷ء میں جب مسلم اپلیکیشن ایکٹ (مسلم پرسنل لا ایکٹ) پاس ہوا تو اسی زمانہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ؛ لیکن چوں کہ یہ کام بہت مشکل بھی تھا اور نازک بھی غالباً اسی لئے ایسے منظّم طریقہ سے اب تک نہیں ہوسکا تھا، خاص طور سے اگر چہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں (اس انداز میں تو نہیں) لیکن دوسرے انداز میں بہت کام کیا ،جس وقت مسلم پرسنل لا کو قانونی حیثیت دی گئی تو یہ علماء کی بیدار مغزی تھی کہ اسی وقت یہ بات اُصولی طور پر تسلیم کرالی گئی تھی کہ فیصلے شریعت کے مطابق ہوں گے اس میں جو کتاب بھی معتبر ہو وہ قابل استدلال ہوسکتی ہے (فقہ کی چند کتابوں کا ذکر بطور مثال تھا نہ کہ بطور حصر) لیکن شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں ۱۹۸۵ء کے اندر) ہندوستانی مسلمانوں کو ایک عجیب طرح کی صورتِ حال سے سابقہ پڑا اور وہ یہ کہ جج نے ایک غیر اسلامی فیصلہ اسلام کے نام پر کیا، یعنی مطلقہ عورت کے لئے طلاق کے بعد تا عمر یا نکاح ثانی نفقہ لازم کیا اور اس کے لئے استدلال قرآن مجید کی آیت'' **للمطلقات متاع بالمعروف**'' کے لفظ'' متاع'' سے کیا، اس طرح گویا جج نے مفسر کا کام انجام دیا، یہ ایک نہایت خطرناک بات تھی جس کا علماء پر غیر معمولی ردِ عمل ہوا

اور بہت فکر مند ہوئے ؛ کیوں کہ انھیں خطرہ تھا کہ اگر اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کیا گیا اور یہ برقرار رہا تو ہر آیت قرآنی وحدیث کی تشریح ہر جج کر سکے گا، نماز کی تشریح، روزہ کی تشریح، مثلاً صوم کے معنی لغت میں امساک یعنی رک جانے کے آتے ہی ہیں، وہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد ''مون برت'' ہے یعنی نہ بولنا، زکوٰۃ کے معنی بڑھنے کے ہیں وہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے مراد ''درخت اگاؤ'' مہم ہے......تو ہم انھیں اس قسم کی تشریح سے روک نہیں سکیں گے، اصل بات جو بے چین کر دینے والی تھی، وہ یہی تھی، ان دنوں جب یہ تحریک چل رہی تھی اور حکومت سے مسلم پرسنل لا کے ذمہ داروں کی گفتگو چل رہی تھی اس وقت اس ضرورت کا احساس شدید ہوا کہ اصلاً ججوں کو غلط فیصلہ کرنے کی گنجائش اس لئے ملتی ہے کہ ان کے سامنے کوئی منضبط قانون، مسلم پرسنل لا سے متعلق نہیں ہے، اگر معتبر طریقہ سے منضبط طور پر دفعہ وار قانون مرتب کر دیا جائے اور اسے کتابی شکل دے دی جائے تو پھر ججوں کو اس قسم کی غلط تشریح کا موقع نہیں ملے گا بشرطیکہ بدنیتی نہ ہو، اگر بدنیتی کا معاملہ ہے تو پھر مسئلہ کا کوئی حل نکالنا مشکل ہے؛ لیکن اگر جج حق پسند ہے تو اس کے لئے گنجائش کم رہ جائے گی، اسی وقت تدوین قوانین اسلامی کا احساس شدت سے پیدا ہوا؛ چنانچہ بورڈ کے اس وقت کے بیدار مغز جنرل سکریٹری حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ اور موقر صدر مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس طرف توجہ فرمائی، فکرہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا تھا اور تائید حضرت مولانا علی میاںؒ کی تھی کہ قانونِ اسلامی کا اس طرح کا کوئی مجموعہ تیار ہو جانا چاہئے، ایک بات اور عرض کر دوں کہ خوش قسمتی سے مجھے بھی اس تحریک (شاہ بانو کے مقدمہ کے بعد چلنے والی تحریک) میں عملی طور شرکت کا موقع ملا ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک (یہاں تک کہ کشمیر بھی اس میں شامل تھا) اکثر حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے ساتھ اس سلسلہ میں میرا بھی جانا ہوا، شاہ بانو کیس کے پس منظر میں عوام تو اسے محض نفقہ مطلقہ سے متعلق تحریک سمجھ رہے تھے؛ لیکن بیدار مغز علماء کے لئے اصل محرک وہی تھا جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا۔

سوال:- ابتدائی مرحلہ میں ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی تیاری کے لئے کون سے عملی اقدامات کئے گئے، کون سے مؤقر علماء کرام اس اہم نازک علمی کام میں شریک رہے اور کیا جو ابتدائی خاکہ اس مجموعہ کے لئے تیار ہوا تھا، موجودہ کتاب ''مجموعہ قوانین اسلامی'' ان ہی خطوط پر تیار ہوئی؟ مؤقر صدر بورڈ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے رسم اجراء کی تقریب میں اس کتاب کو فتاویٰ عالمگیری سے مشابہ قرار دیا ہے، فتاویٰ عالمگیری سے ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' نامی یہ کتاب کس معنی میں مشابہ ہے؟

جواب:- جہاں تک کتاب کی ترتیب کا سوال ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا محرک تو وہ بات بنی جس کا تذکرہ آچکا ہے اس کی عملی شکل یہ ہوئی کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے پہلے تو کچھ افراد کو ذہن میں رکھا، سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب کو مونگیر بلایا تاکہ وہ ایک ابتدائی خاکہ تیار کر دیں وقتاً فوقتاً مولانا رحمانیؒ اسی زمانہ میں مجھے بھی یاد فرماتے رہے بالکل شروع میں ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ ہوائی جہاز سے پٹنہ اور وہاں سے مونگیر لے گئے تو جو ابتدائی خاکہ تیار ہوا تھا، اسے مجھے بھی دکھایا، میں نے اس وقت کچھ مشورے دیئے، یہاں یہ بات بیان کرنا مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کام میں اس زمانہ کے جامعہ رحمانی کے مفتی نعمت اللہ صاحب کی محنتوں کو بھی بڑا دخل ہے، مفتی کی حیثیت سے اس موضوع اور اس کی جزئیات پر ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور گہرا پایا تو جب مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب اور مفتی نعمت اللہ صاحب کی کوششوں سے ابتدائی خاکہ تیار ہو گیا، جس کے لئے وقتاً فوقتاً میرا بھی وہاں جانا ہوتا رہا تو اس کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے ایک کمیٹی بنائی تاکہ وہ کمیٹی اس ابتدائی خاکہ پر نظر ثانی کرے، اس کمیٹی میں دارالعلوم دیوبند سے مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب موصوف،

دارالعلوم دیوبند وقف سے مولانا مفتی احمد علی صاحب مرحوم کا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے میرا نام شامل تھا، مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب، ان کے علاوہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا نام بھی اس کمیٹی کے ممبران میں شامل تھا، مگر مولانا نے چند میٹنگوں میں ہی شرکت فرمائی، پہلے تو اپنی مصروفیات کی وجہ سے اور بعد میں اپنی خرابی صحت کے باعث شرکت کا موقع انھیں بہت زیادہ نہیں مل پایا، راقم کو اس سلسلہ میں مونگیر اور پٹنہ میں کوئی آٹھ دس بار مقیم رہنا پڑا (کبھی کبھی ایک ہفتہ کبھی کم وبیش) لیکن وہ جو ابتدائی خاکہ تیار ہوا تھا ، اس کے سلسلہ میں مجھے یہ بتا دینے میں تامل نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہے کہ اس ابتدائی مسودہ کا شاید کوئی ایک صفحہ بھی بعینہٖ باقی نہیں رہا؛ بلکہ ہوسکتا ہے کہ یکجا دو چار سطریں بعینہٖ نہ رہ پائی ہوں اس کمیٹی کی محنت اور بحث مباحثہ کے نتیجہ میں ایک بالکل نئی چیز تیار ہوئی ہے اس لئے یہ کہنا کہ یہ کتاب جو منظر عام پر آئی ہے، اس ابتدائی خاکہ کا ہی چربہ ہے اور اس مسودہ کی تصویب ہے (جیسا کہ بعض اخبارات کی رپورٹنگ میں یہ بات آئی ہے) حقیقت سے عدم واقفیت کی بات ہے، ابتدائی مسودہ کی اصل شکل باقی نہیں رہ گئی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری سے یہ کتاب اس معنی میں مشابہ ہے کہ عالمگیری کو علماء کی ایک جماعت نے تیار کیا تھا اگر چہ ان علماء کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ اورنگ زیبؒ جیسے فقیہ اور فقیر منش بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی جس کا وجود مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی خوش نصیبی تھی اس کے بعد شاید نظر لگ گئی (مولانا گیلانی کے الفاظ میں) ایسا فقیہ بادشاہ جو روزانہ کے کاموں کو خود دیکھتا اور سنتا تھا اور اس میں ترمیم یا تصویب کی ضرورت پیش آتی تو وہ بھی کرتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کے بعد ایسی اجتماعی کوشش عائلی قوانین مرتب کرنے کے لئے نہیں ہوئی، تو موجودہ کتاب ''مجموعہ قوانین اسلامی'' علماء کی اجتماعی کوشش کے لحاظ سے فتاویٰ عالمگیری سے مشابہ ہے؛ لیکن دوسرے پہلوؤں اور نوعیت کے لحاظ سے بھی بہت فرق ہے، مثلاً عالمگیری پوری شریعت کے مسائل پر حاوی ہے اور اس کی ضخامت اس سے کوئی پچاس گنا زیادہ ہے، اس کی تیاری میں علماء گرانقدر

معاوضہ پاتے تھے اور مستقل اسی کام میں لگے رہتے تھے جب کہ مجموعۂ قوانین اسلامی نامی اس کتاب (جو صرف عائلی قوانین پر مشتمل ہے) کی تیاری میں شریک علماء نے یہ کام (دوسری اپنی اپنی مستقل مشغولیتوں کے ساتھ) رضا کارانہ طور پر ثواب کی نیت سے لوجہ اللہ کیا، مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی اصابت رائے کی یہ دلیل ہے کہ انھوں نے ہندوستان بھر سے منتخب علماء کو یہ کام تفویض کیا، یہ بات ان کی مردم شناسی اور فراست کو ظاہر کرتی ہے، وہ خود بھی ایک اچھے فقیہ تھے اور اس کام کی انھوں نے سرپرستی بھی فرمائی اور بحثوں میں حصہ بھی لیا؛ لیکن بہرحال عالمگیر جیسی عظیم شخصیت کی بات دیگر تھی۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے انتقال کے بعد، ان کے صاحبزادے مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کے اہتمام میں تدوین کا کام جاری رہا اور اس کی بحثوں میں مولانا نے بھی حصہ لیا۔

سوال:- مسلم پرسنل لا سے متعلق مسائل پر کتابیں اور فتاویٰ موجود ہیں اس صورت میں کتاب ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' کس لحاظ سے منفرد وممتاز ہے اور کن خصوصیات کی حامل ہے؟ اس کی افادیت ومقبولیت کے لحاظ سے ذمہ داران بورڈ اور آں جناب کس حد تک پُر اُمید ہیں؟

جواب:- خدا کی ذات سے بہت اُمید ہے، مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ سے متعلق ہندوستانی زبان میں (بلکہ غالباً کسی اور غیر عربی زبان میں بھی) اس قدر مرتب و دفعہ وار کتاب اب تک موجود نہیں تھی اگر چہ اس موضوع پر بہت سے معتبر لوگوں کی کتابیں موجود ہیں؛ لیکن وہ انفرادی کوششیں ہیں، پھر ان کتابوں میں اس ترتیب وضرورت کا لحاظ نہیں ہے جو عصری تقاضوں کو پورا کرے اور ایک عام قاری کے لئے نہیں، قانون دانوں کے لئے بھی سہولت واطمینان کا باعث بن سکے، موجودہ کتاب ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' میں ہر (متعلقہ موضوع سے متعلق) شرعی حکم دفعہ وار درج ہے اور ہر دفعہ کا نمبر دیا ہوا ہے جب کہ اس

موضوع پر دوسری کتابوں میں ایسا نہیں بلکہ دفعہ کی بجائے عموماً لفظ ''مسئلہ'' درج ہے، اس کے علاوہ نہ تو ان میں باب کی ایسی تقسیم ہے اور نہ ہی عنوانات بعض کتابوں میں اتنے مفصل قائم کئے گئے ہیں بلکہ سلسلہ وار ایک کے بعد دوسری بات بیان کر دی گئی ہے، موجودہ کتاب میں دفعہ کے تحت مسائل قانونی زبان میں بڑے احتیاط سے آ گئے ہیں، ایسا اہتمام، سابقہ کتابوں میں بالعموم نہیں پایا جاتا پھر یہ کہ ہر مسئلہ کی دلیل اور اس کتاب کا حوالہ بھی اس کے حاشیہ پر دے دیا گیا ہے کتاب وسنت کے علاوہ اس کتاب میں چالیس سے زیادہ معتبر فقہی واُصولِ فقہ کی کتابوں کے حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔

سوال:- اخبارات کی رپورٹنگ سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعۂ قوانین اسلامی نامی کتاب میں فقہ حنفی کا لحاظ رکھا گیا ہے، ایسے حالات میں جب کہ بدقسمتی سے مسلکی اختلافات کو بآسانی مخالفت کا رنگ دے دیا جاتا ہے، کیا یہ کتاب سب کے لئے قابل قبول ہوگی یا یہ کہ اس امر کا لحاظ کتاب کی ترتیب وتدوین میں رکھا گیا ہے؟

جواب:- یہ بات اپنے اندر جزوی صداقت رکھتی ہے کہ اسے فقہ حنفی ہی کی کتاب کہا جائے، یہ مانا کہ اس کے اندر مسائل فقہ حنفی ہی کے زیادہ ذکر کئے گئے ہیں اور حوالے بھی اکثر فقہ حنفی ہی کی کتابوں سے زیادہ دیئے گئے ہیں؛ لیکن اس میں ایسے مسائل بھی شامل ہیں جو فقہ حنفی میں نہیں تھے، یا کسی مسئلہ میں اتنی سہولت فقہ حنفی کی رو سے نہیں ملتی تھی جتنی کہ دوسرے کسی مسلک میں اس لئے دوسرے مسلک سے بعض مسائل کا حل لیا گیا ہے؛ چنانچہ امام مالک کے مسلک سے متعدد مسئلے لئے گئے ہیں، مثلاً مفقود الخبر کی بیوی کے مسئلہ کا حل، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی ایسا کیا گیا ہے اس لئے یہ بات کہ اس میں فقہ حنفی کا لحاظ ہے کلی طور پر صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان، جہاں اسی فیصد سے زیادہ حنفی مسلمان بستے ہوں،

تو ظاہر ہے کہ مقدمات بھی اسی تناسب سے عدالتوں میں آئیں گے، اس کے علاوہ شاید آپ کے علم میں یہ بات ہوگی (اوپر بھی مختصراً تذکرہ آچکا ہے) کہ جب یہ قانون بنا تو اس میں اس کی گنجائش رکھی گئی کہ اگر فریقین کسی اور (غیر حنفی) مسلک کے ماننے والے ہوں تو عدالتی فیصلے میں فریقین کے مسلک کی رعایت کی جائے گی۔

سوال:- بورڈ نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کروا کر اس کتاب کی افادیت ونافعیت کا دائرہ کار وسیع کر دیا ہے، بلکہ غالبًا اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے پس پشت مقاصد میں سے اہم ترین مقصد قانون داں حلقوں کے ہاتھوں تک ایک معتبر ومستند مجموعۂ قوانین اسلامی پہنچانا تھا جو ریفرنس بک کا کام دے سکے اس لحاظ سے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کی اہمیت اور نزاکت دونوں بڑھ جاتی ہے، چنانچہ اس کے انگریزی ترجمہ سے متعلق آں جناب کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب:- چوں کہ میں انگریزی زبان سے زیادہ واقف نہیں ہوں اس لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کس حد تک معتبر ہے؛ البتہ یہ معلوم ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر طاہر محمود صاحب نے کیا ہے، میں ان کی ذات سے واقف ہوں، تقریباً پچیس برسوں سے میرے ان سے شخصی طور پر روابط ہیں، وہ انگریزی اور اُردو دونوں میں قانونی تعبیر کو سمجھنے اور قانونی زبان لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہیں، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر انھیں دسترس حاصل ہے، ہندوستان میں ایسی شخصیتیں کمیاب ہیں جو بیک وقت اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتی ہوں کہ علماء کی اُردو زبان بھی سمجھ لیتی ہوں اور قانونی احتیاط کو برتتے ہوئے اسے انگریزی میں لکھنے اور پیش کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہوں، ایسی شخصیتوں کی جو مختصر سی مختصر فہرست بن سکتی ہو تو اس فہرست میں ایک نام ڈاکٹر طاہر محمود کا بھی یقیناً شامل کیا جائے گا، اس وجہ سے اس کتاب کے انگریزی

ترجمہ کے تعلق سے اطمینان ہے، رسم اجراء کے موقع پر بھی ایسے لوگوں نے جو انگریزی اور قانونی زبان سے واقف ہیں اور جنھوں نے اس کتاب پر جزوی یا کلی طور پر نگاہ ڈالی تھی انھوں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے، بلکہ سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج صاحب سے میری گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا کہ جہاں تک اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا تعلق ہے تو اس میں بات صحیح کہی گئی ہے اور اس کتاب کو قانونی حوالہ کے طور پر پیش کرنا غلط نہیں ہوگا۔

سوال:- رسم اجراء کی رپورٹنگ میں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ اس کتاب کو مدارس میں شامل نصاب کئے جانے کی تجویز ہے، جناب والا کا تدریس سے بھی دیرینہ وگہرا تعلق ہے اس کتاب کو شامل نصاب کئے جانے سے متعلق آپ کی رائے؟

جواب:- اصل میں نصاب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اس لئے میرے نزدیک اسے شامل نصاب کئے جانے کی بات بہت زیادہ مناسب نہیں ہوگی، نصاب کی کتابوں کا ایک خاص نہج ہوتا ہے؛ البتہ اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کی جاسکتی ہے وہ بھی کسی ماہر فن استاد کی رہنمائی میں مطالعہ ہو۔

سوال:- اس کتاب کی اشاعت یا اس سے متعلق کوئی ایسی بات جو جناب والا کہنا چاہتے ہوں؟

جواب:- ایک بات جو بار بار ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کو قانونی حلقوں تک پہنچانے کی جس قدر ممکن ہو کوشش کی جائے، وکلاء، ججوں، قانون دانوں تک زیادہ سے زیادہ اس کتاب کو پہنچایا جانا چاہئے، مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں میں اس کتاب کی اشاعت میرے نزدیک زیادہ اہمیت اور افادیت کی حامل ہوگی، اس کتاب کا اصل مقصد بھی یہی ہے؛ البتہ عام مسلمانوں اور خاص طور پر طلباء کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، ہر ایک کے لئے اس کا مطالعہ ظاہر ہے کہ نفع سے خالی نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے پاس ان مسائل سے واقفیت کے لئے پہلے سے بہت سی کتابیں موجود ہیں، حکیم الامت

حضرت تھانویؒ اور دوسرے ممتاز علماء کے فتاویٰ موجود ہیں؛ لیکن خالص قانونی زبان میں میرے علم میں صرف عائلی مسائل پر اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب کم از کم اُردو میں موجود نہیں تھی، جسے ایسے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہو اور جس کی تیاری میں متعدد علماء نے اس قدر محنت کی ہو، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اس کتاب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (سابق صدر بورڈ) کا ایک بہت مفصل مقدمہ شامل ہے، جس میں بورڈ کے قیام کا پس منظر، مسلم پرسنل لا کی حقیقت نیز اس کتاب کی تدوین کے پس منظر سے متعلق، اس کے علاوہ بھی دیگر بہت سی قیمتی ومفید معلومات ہیں، کتاب کے شروع میں ایک مختصر سا ''پیش لفظ'' بورڈ کے موجودہ صدر، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کے قلم سے بھی شامل ہے۔

☆ ☆ ☆

''تاریخ عزتِ اسلام'' پر تبصرہ

مخدوم ومحترم دام مجدکم (بخدمت مولانا مفتی عبدالقدوس رومی صاحب دام مجدہم)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی؟

کئی مہینے قبل آپ کی طرف سے ''تاریخ عزتِ اسلام کا مقدمہ'' نامی کتاب (آپ کا جس پر یہ نوٹ بھی ہے کہ ''......تاثر مطالعہ سے مشرف فرمائیں'') ہم دست ہوئی تھی، مگر تاثر مطالعہ سے آپ کو مطلع کرنے کی نوبت ابھی تک نہیں آسکی؛ حالاں کہ اس کا مطالعہ تو ملنے کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا؛ لیکن دیگر مصروفیتوں اور مشاغل کی وجہ سے اس میں نہ تو تسلسل برقرار رکھا جاسکا نہ تیزی آسکی، پوری کتاب کے مطالعہ کی نوبت تو اب تک بھی نہیں آسکی ہے؛ لیکن اس کا معتد بہ حصہ، جس سے رائے قائم کر لینا ممکن ہوا، زیر مطالعہ آچکا ہے، مگر تاثر کے اظہار میں تامل ہو رہا ہے؛ کیوں کہ خطرہ ہے کہ ''ان تبدلکم تسوء کم'' کا مصداق ثابت ہو! بہر حال تعمیل حکم میں چند باتیں پیش کرنے کی جرأت کرنا تو ناگزیر معلوم ہو رہا ہے۔

۱- کسی ماہر فن حکیم جس کی پوری عمر اسی فن کی علمی وعملی خدمت میں گزری ہو اور اس کی ہر ہر پہلو پر نظر ہو اور جس کے سامنے پورا فن کف دست کی طرح ہو، کی رائے کے مقابلہ میں، اس فن کی بابت، کیا کسی ایسے شخص کی رائے کو وزن دیا جاسکتا ہے جو زیر بحث واقعات اور ان کے رواۃ کے سینکڑوں سال؛ بلکہ ایک ہزار سال سے زائد مدت بعد پیدا ہوا اور جس نے نہ تو باقاعدہ یہ فن پڑھا ہو اور نہ اس کی عمر کا معتد بہ حصہ اس میں گذرا ہو؛ بلکہ جس کا کل سرمایۂ معلومات یہ ہو کہ اس فن کی بس دو ایک کتابیں وہ بھی پوری نہیں، اِدھر اُدھر سے جستہ جستہ دیکھ لی ہوں اگر ایسا کیا جانا علم وعقل بلکہ عدل وانصاف کی بارگاہ میں درست قرار دیا جاسکے تو پھر یقیناً امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، نیز امام ذہبیؒ وغیرہم کے مقابلہ میں ان سے

سینکڑوں سال بعد آنے والے کسی شخص کے اس طرح کے تبصروں کو وزن دیا جاسکتا، مثلاً:

(الف) جس کے سبب وہ حضرات زہد وتقویٰ کے لباس زور میں چھپے ہوئے ایسے شاطروں کو پہچان ہی نہیں سکے۔ (ص:۳۲)

(ب) ان مفسدین کے نمائشی وریائی تقوے وپارسائی کے لباس زور کے دھوکہ میں آکر ان کے معتبر ہونے کا سرٹیفکٹ دے کر اپنا امام وپیشوا بھی تسلیم کر لیا ہو۔ (ص:۶۰-۶۱)

(ج) امام ذہبیؒ اس جماعت کے ریائی دین وصدق وورع سے دھوکا کھا گئے تو تعجب کی بات نہیں، مگر جو قاعدہ لکھ گئے اس سے مکاروں کو بڑی چھوٹ مل گئی، (ص:۱۰۲)

اس طرح کی رائے ظاہر کرتے وقت یہ بھی نہ خیال کیا گیا کہ جن کو ''ریاکار'' کہا گیا ہے، وہ امام ذہبی کے زمانہ سے زیادہ اقرب تھے یا آج کے کسی تبصرہ نگار کے زمانہ سے؟ جب سات سو آٹھ سو سال پہلے کے ایسے شخص کو دھوکہ لگ سکتا ہے کہ جس کے سامنے ہر راوی اور اس کی ہر روایت کف دست کی طرح تھی تو آج کے کسی ایسے شخص کو دھوکہ لگ جانا جس کا کل سرمایہ ہی فن کے چند اوراق ہوں اور چند حدیثیں اس کو یاد نہ ہوں، زیادہ قرین قیاس اور اقرب الی الواقعہ ہوگا یا نہیں؟ اور نہ یہ خیال کیا گیا کہ اس طرح کی رائے زنی سے منکرین حدیث کے ہاتھ میں کتنا بڑا ہتھیار آجائے گا، جس سے وہ پورے ذخیرۂ حدیث کو ڈائنامیٹ کر سکتے ہیں، (بلکہ بعض کی اسی طرح کی بے احتیاطیوں کی بنا پر کر بھی چکے ہیں)۔

(د) معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات (صحاح ستہ کے جامعین، جیسا کہ اوپر تصریح کی گئی ہے) کو جمع حدیث کی دھن اور سند کے اتصال کی زیادہ فکر تھی...... بر بنائے بشریت ان کی بے خبری میں دو چار دس حدیثیں ایسی بھی آگئیں جن کے راوی بدمذہب مگر ظاہری پارسا تھے۔ (ص:۱۲۸)

(ہ) آخر امام مسلمؒ نے اس میں نکارت کیوں محسوس نہیں کی، پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ تمام شارحین اور اساتذۂ مدارس برابر اسے صحیح واقعہ سمجھ کر بلانکیر قبول کئے جاتے ہیں۔ (ص:۱۳۰)

اس موقع پر بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ مذکورہ عبارت کے لکھنے والے صاحب ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور اپنی فراست ایمانی کے زعم میں گرفتار ہوکر یہ بھی بھول گئے کہ امام مسلم سے لے کر آج تک (گویا تقریباً بارہ سو سال تک) تمام اکابر محدثین اور علماء اُمت کو جو بات نہ سوجھی اور انھیں جس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی وہ موصوف کی نظر میں ایسی نمایاں خرابی ٹھہری کہ ''وہ سب لوگ غلط'' اور ''میں صحیح'' کا نعرہ بلند کرنے کی ہمت ہوگئی؛ حالاں کہ علم و دیانت بلکہ انصاف کا بھی تقاضہ یہ تھا کہ پوری اُمت کو متہم سمجھنے کے بجائے خود کو 'متہم' جانتے۔

۲- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غیبت کا مرتکب (وہ بھی عین وفات سے قبل، جب کہ فاسق بھی محتاط ہوجاتا ہے) قرار دینے کا ملزم تاریخ کو بنادیا وہ صرف اس وجہ سے کہ جس وقت (ان کے زخمی ہونے کے بعد جب وفات کا یقین ہوگیا تھا) ان کے سامنے چند امکانی جانشینوں کے نام پیش کئے گئے تو انھوں نے خیر خواہانہ طور پر ہر ایک میں خلافت کی اہلیت کے لحاظ سے جو کمی محسوس کی اسے ظاہر کیا تھا، اگر اس کا نام غیبت ہے تو پھر پورا فن اسماء الرجال غیبتوں کا مجموعہ قرار پائے گا (جب کہ بعض کوتاہ نظروں نے کہہ بھی دیا ہے) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظامؒ اور ائمہ مجتہدینؒ (جن میں امام اعظم بھی شامل ہیں) سے لے کر کوئی بھی غیبت سے بری قرار نہیں دیا جاسکے گا؛(۱) بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی، غالباً ان صاحب کے اُصول سے (العیاذ باللہ) اس سے بری قرار نہیں دیا جاسکے گا؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو ایک خاتون کو انھیں پیغام دینے والوں کی بابت اسی طرح کی رائے ظاہر فرمائی تھی، جسے موصوف کے فکر وفہم کے اعتبار سے 'غیبت' ہی قرار دیا جائے گا۔

(۱) کتاب الطلاق، حدیث نمبر: ۳۶۹۷، أما معاوية فصعلوک لا مال له.

۳- تیسری اور آخری بات کہہ کر راقم اپنی گذارشیں ختم کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ آیا

تمام صحابہ کرام قابل احترام ہیں؟ یا کچھ کا استثناء بھی ہے؟ یعنی وہ صحابہ کرام بھی قابل احترام ہیں یا نہیں جنھیں شیعہ اہمیت دیتے ہیں؟ مسلک اہل سنت تو یہی ہے کہ سب قابل احترام ہیں؛ مگر لگتا ہے کہ صاحب کتاب کے نزدیک شاید ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا (جو شیعوں کے نزدیک بھی قابل احترام ہیں) اتنا احترام ملحوظ رکھنا ضروری نہیں جتنا ان صحابہ کا جو شیعوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہیں، اگر ایسا نہیں تو پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں موصوف کی اس گوہر افشانی کی کیا توجیہ ہوگی؟ حضرت عمار رضی اللہ عنہ اتنا تو سمجھ سکتے تھے کہ مصر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت ہے...... مجھے ان کا ساتھ نہ دینا چاہئے،...... مگر مفسدین سبائیوں نے انھیں اُچک لیا...... خلیفہ کو اس کی اطلاع ہوگئی...... مگر انھوں نے یہ حرکت نظر انداز کردی۔ (ص: ۱۴۳)

خط کشیدہ الفاظ پر خاص طور سے غور کیجئے! یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ ''اُچک لیا''، ''یہ حرکت نظر انداز کردی'' جیسے جملے کیا کسی ایسے شخص کے بارے میں قلم سے نکل سکتے ہیں جس کا ادنیٰ سا احترام بھی صاحب قلم کے یہاں ہو! (ص: ۱۲۹-۱۳۰) پر ایک صحابی اور ان کے شاگرد تابعی کا جس طنز آمیز انداز میں تذکرہ کیا ہے وہ بھی سخت قابل اعتراض ہے، پھر وہی بات عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ صاحب معاملہ تو بات نہ سمجھے یعنی جس کے سامنے واقعات پیش آرہے تھے وہ تو نہ سمجھ سکا اور آج کا کوئی شخص (تقریباً چودہ پندرہ سو سال بعد) ایسا سمجھ لے کہ گویا وہ شاہد عینی ہے (یا للعجب!) ابھی کل ہی کی تو بات ہے حضرت مدنیؒ اور حضرت تھانویؒ وغیرہما کے بارے میں کیسے کیسے غلو آمیز نظریے ذہنوں میں بٹھادیئے گئے تھے کہ مخلص معاصرین تک کے لئے بعض مرتبہ، صحیح نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہورہا تھا (بلکہ اب تک کچھ اثرات باقی ہیں) تو چودہ پندرہ سو برس پہلے کے واقعات کے بارے میں کیا ایسی رائے زنی کرنے کو یہ کہ گویا اس وقت موجود تھے، صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟ پھر کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی تاثر ملتا ہے کہ تاریخی واقعات بلکہ احادیث تک میں سے جسے چاہو مانو جسے چاہو نہ مانو، کوئی حدیث یا واقعہ فی نفسہ لائق اعتبار نہیں، بس پڑھنے والے کی اپنی صوابدید پر

صحت یا عدم صحت موقوف ہے، اس طرح پورا اعتماد اُٹھ جاتا ہے، تمام قدیم علمی سرمایہ سے ان چند قابل تامل باتوں کے علاوہ اور بھی بہت ایسی باتیں ہیں، مثلاً نور اللہ شوستری کے سنی ہونے کی بات (ص: ۱۲۳) بلا دلیل اور حوالہ کے بغیر بہت سی باتیں مذکور ہونا (مثلاً ص: ۸۲ پر حضرت عمر بن عبد العزیز کا مغازی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو داخل نصاب کرنا) اور سیوطی وابن عبد البر جیسے اساطین اُمت کے بارے میں یہ کہنا کہ ’’فن تاریخ کی بدقسمتی سے یہ لوگ تاریخی نویسی کے میدان میں اُتر آئے۔ (ص: ۱۳۲)

اوپر کی سطروں سے اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ راقم کے نزدیک اس کا منظر عام پر نہ آنا ہی آنے سے بہتر ہے، کیوں کہ اس کے مطالعہ سے بجز انتشار فکر وتشکک کے اور کوئی مفید نتیجہ نکلنا مشکل ہے (اُمت پہلے ہی انتشار فکر میں کیا کم مبتلا ہے؟؟) چوں کہ آپ کے مزاج میں صاف گوئی ہے، اس لئے یہاں راقم نے بھی یہ انداز اختیار کرنے کی جرأت کی پھر بھی میں اپنی اس صاف گوئی، تلخ نوائی اور گستاخی پر صد بار معافی کا خواستگار ہوں۔

یہاں بس حکم کی تعمیل کی گئی ہے ورنہ خاموشی کو ترجیح دیتا، اس عریضہ کے موصول ہونے پر کم از کم وصولیابی کی مجھے اطلاع ضرور فرمادیں۔ دُعاء خیر کی بہت مؤدبانہ درخواست ہے۔

☆ ☆ ☆

’’القول الجلی‘‘ کے مقدمہ پر ایک قسم کے تنقیدی جائزہ

۱- اس کو یہ معلوم نہیں کہ کسی فعل کے ثواب کو یا گناہ کو فرض قطعی کے ثواب سے یا حرام قطعی کے گناہ سے زیادہ اور بڑا قرار دینا اللہ اور اس کے رسول کا کام ہے۔ (ص: ۵)

نوٹ:- لیکن کیا مقدمہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں اور کسی کی قبر پر ’’حاجت روائی‘‘ کے لئے جانا شرک ہے، جس کی تصریح اگلی عبارت ’’**مثل من کان یدعوا للات والعزی**‘‘ سے ہو رہی ہے، اللہ اور اس کے رسول نے ہی شرک کو سب سے بڑا گناہ بتایا ہے اور کیا مقدمہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ ’’شرک‘‘ کے گناہ ہونے کا منکر ’زنا‘ کے گناہ ہونے کے منکر سے بھی بڑھ کر کافر ہے۔

۲- اس مبارک حدیث کو سنانے والے اور قبر مطہر پر اپنا رخسار رکھنے والے صحابی جلیل القدر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ (ص: ۶، نیچے سے دوسری سطر)

نوٹ:- اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو بھی اس سے ’’حاجت روائی‘‘ کے لئے قبر پر جانا کہاں ثابت ہوتا ہے؛ حالاں کہ ’’تفہیماتِ الٰہیہ‘‘ کی جس عبارت کو الحاقی قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس میں صاف مذکور ہے ’’**لحاجة یطلبها**‘‘ اور اسے ہی لات وعزیٰ کو پکارنے کی مشابہ قرار دیا ہے۔

۳- ہماری ملی تاریخ میں کسی چیز پر اُمت کا مسلسل کاربند ہونا بجائے خود ایک شرعی دلیل اور حجت ہے۔ (ص: ۷، تیسری سطر)

نوٹ:- اُمت کے مسلسل کاربند ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا معاصی اور منکرات پر مسلسل کاربند ہونا بھی شرعی دلیل ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس ’تعریف‘ میں کیا وزن

رہ جاتا ہے۔

۴- تصرفات (ص:۷،۹) پر روحانی قوتوں (ص:۷، ۱۴) روحانی امداد۔ (ص:۷،۹)

نوٹ:- تصرفات، روحانی قوتوں اور روحانی امداد، بھی موہم تعبیرات ہیں، ان کے صحیح محمل بھی ہیں اور غلط بھی، غلط محمل کے لئے گذشتہ تاریخ کے بعض واقعات کو دلیل بنانا ایسا ہی ہے جیسا کہ مجرد زیارت قبور کے عمل سے استمداد باصحاب القبور کے لئے استدلال کرنا۔

۵- کاش مولانا فاروق ''چہاردہ صد سالہ تاریخ لکھتے۔ (ص:۸، ۲)

نوٹ:- اس طرح کے مسلک کو رائج کرنے والی سب سے نمایاں اہم شخصیت علامہ ابن تیمیہؒ کی ہے، ان کا زمانہ آٹھویں صدی کی ابتدا کا ہے، اس وقت تو صرف سات سو سال ہی ہوئے ہوں گے ہزار بھی نہیں، لہٰذا یہ ''نقد'' بے محل ہے۔

۶- اور اب مدعیانِ سنت کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو جانے والا مشرک ہے۔ (ص:۸، ۱۴)

نوٹ:- محض ''زیارت'' کے واسطے جانے والے کو مشرک کون کہتا ہے؟ اوپر گذر چکا ہے کہ بغرض حاجت روائی'' قبر پر جانا محل اعتراض ہے، اس لئے محض زیارت کے لئے جانے والے کسی واقعہ سے اس ''اعتراض'' کی نفی نہیں ہوسکتی۔

۷- ......انھوں نے مسنون مقام چھوڑا......۔ (ص:۸،۵)

نوٹ:- اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں، آیا یہ کہ خلیفہ اول ہی جب تارک سنت تھے تو ہمارے (مقدمہ نگار جیسے لوگوں کے) تارک سنت ہونے پر اعتراض کیوں؟ اگر یہی مقصد ہے تو ''بریں عقل ودانش بباید گریست''۔

۸- افسوس صد افسوس اب اس شخص کو مشرک کہا جاتا ہے جو آثار صالحین سے برکت حاصل کرے۔ (ص:۹،۶)

نوٹ:- افسوس صد افسوس اس بات پر کہ مقدمہ نگار تلبیس سے کام لے رہے ہیں،

یا پھر فہم سلیم سے محرومی کا اظہار کہ مجرد برکت کے حصول اور ''استعانت بغیر اللہ'' کے درمیان فرق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

۹- ......غلام نجف......۔ (ص:۹،۱۱)

نوٹ:- غلام نجف (شیعی؟) کا نسخہ تو قابل اعتبار ہو اور تاج کمپنی (جو صحت طباعت میں ضرب المثل ہے) کا نسخہ نا قابل اعتبار، یا للعجب!

۱۰- اللہ نے نبی سے دین اسلام روشن کیا (ص:۹، ۱۷) اللہ کے نبی نے دین اسلام کیا۔ (ص:۹،۱۹)

نوٹ:- ان دونوں تعبیروں میں مآل ومصداق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، پھر ''کے'' ''کا'' ''سے'' اور ''نے'' ''کا'' ''کے'' طباعت یا کتابت کے نتیجہ میں ہوجانا بعید نہیں، اسے ''تحریف'' قرار دینا، مچھر کو ''اونٹ'' کر دینے کے مترادف ہے۔

۱۱- پھیر لاوے گا۔ (ص:۱۰،۸)

نوٹ:- یہ ''رجعہ'' کا ترجمہ ہے، اگر ''رجعت'' میں یہی (اتحاد محل) ضروری ہے تو ''إلى الله مرجع الأمور'' جیسی آیات کا کیا عمل ہوگا؟ علاوہ ازیں سورۃ الطارق میں ''بعث بعد الموت'' کا مفہوم متبادر ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سب کچھ ہے۔

۱۲- آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف کو اس خاندان کی طرف منسوب کر دیا ہے اور درحقیقت وہ تصانیف اس میں سے کسی کی نہیں۔ (ص:۱۰، ۱۷)

نوٹ:- غالبًا یہ کتاب (القول الجلی ۹ ہی اس کا نمونہ ہے۔

۱۳- اور پھر باقاعدہ پندرہ شعبان کو مکہ مکرمہ میں اس کام کو شروع کیا۔ (ص:۱۷، ۲)

نوٹ:- گیارہ شعبان کو رابغ میں اور پندرہ کو مکہ مکرمہ میں پہنچنا محل تعجب ہے، کیوں کہ اتنی مسافت عموماً ایک ہفتہ میں طے ہوتی ہے۔

۱۴- لیکن اب اس کتاب کا کامل نسخہ تکیہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری کے علاوہ غالبًا

دوسری جگہ نہیں ہے۔(ص:۱۷،۷)

نوٹ:- یہ بات اس نسخہ کو مشکوک بنانے والی، بلکہ تحریف سے داغ دار کی جاسکنے کی بھی دلیل بن سکتی ہے، اور اس طرح کے واقعات جو شاہ صاحب کی ان کتابوں میں نہیں ملتے جو ان کی وفات کے بعد سے برابر لوگوں میں پھیلی رہیں، اب چھپ رہی ہیں اور شائع ہو رہی ہیں، اس کتاب (القول الجلی) میں موجود ہونا، خاص طور سے اس کے اس حصہ میں جس کا ایک ہی قلمی نسخہ دنیا میں ہے، اس کا قوی قرینہ ہے کہ یہ پوری کتاب یا کم از کم اس کا پہلا حصہ جعلی اور الحاقی ہے یہاں یہ سوال پیدا ہونا قدرتی ہے کہ اگر یہ واقعہ شاہ صاحب ہی کے ملفوظات ہیں تو اتنی مدت تک پردۂ خفا میں کیوں رہے؟ جب کہ شاہ صاحب اور ان کے اولا د امجاد کے ایک ایک حرف شائع کرنے کا اہتمام رہا ہے۔

۱۵- ......آپ کو یہ الہام ہوا کہ یہ فقیر چند نسبتیں رکھتا ہے، ایک نسبت سے ولی اللہ ، ایک سے انسان ہے، ایک سے حیوان ہے، ایک سے نامی، ایک سے جسم، ایک سے جوہر اس اعتبار سے پتھر بھی ہوں، درخت بھی ہوں، گھوڑا بھی، اونٹ بھی، بھیڑ بھی، آدم کو اسماء کی تعلیم میں تھا، نوح کا طوفان میں تھا، ابراہیم پر جو گلزار ہوا وہ میں تھا، موسیٰ کی تورات میں تھا، عیسیٰ کی مردے کو زندہ کرنا میں تھا، مصطفیٰ ﷺ کا قرآن میں تھا۔ (ص:۱۹، ۱۲ تا ۲۰ کا خلاصہ)

نوٹ:- خط کشیدہ حصہ کے بارے میں اگر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے وہ بات کہی ہو جو صفحہ:۱۱۱ پر گذر چکی ہے، تو کیا غلط کہا، کیا اس عبارت کے ظاہر سے اگر یہ واقعہ شاہ صاحب ہی کا ہے، تو مدعی نبوت ہونا ظاہر نہیں ہو رہا ہے؟ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس عبارت کی نسبت مشکوک ہونے کے علاوہ) صرف کشف ہے جو بالاتفاق حجت نہیں۔

۱۶- اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے والد پابندی سے میلاد مبارک کے دن خوشی کا کھانا اور شیرینی تقسیم کیا کرتے تھے......۔(ص:۲۳،۷)

نوٹ:- اس سے ”پابندی“ کا ثبوت کہاں ملتا ہے؟ اگر ایک آدھ مرتبہ بھی ایسا

کر لیا تو یہ کہا جاسکتا کہ......۔

۱۷- ......اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کی طرف سے مکرر اشارہ ہوا کہ ان حضرات کی فاتحہ کرائی جائے۔(ص:۲۳ سب سے آخری سطر)

نوٹ:- اگرچہ اس ملفوظ کی نسبت بھی اسی طرح مشکوک ہے، جس طرح دوسرے ایسے ہی ملفوظات کی، پھر زیادہ سے زیادہ اس سے کشفی اشارہ معلوم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ حجت نہیں۔

۱۸- حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی مبارک روح میں ایک خاص قسم کا امتیاز تمکنت ظاہر ہوئی۔(ص:۲۴، ۴)

نوٹ:- یہ بات خود اس ملفوظ کو جعلی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے؛ کیوں کہ اس سے تو جعفر صادق کا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات حسنین سے بھی برتر ہونا معلوم رہا ہے
۔

۱۹- آپ کے صاحبزادہ و جانشین سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیزؒ تا حیات مجالس محرم کرنے کے پابند رہے......۔(ص:۲۴ کا حاشیہ)

نوٹ:- جب شیخین (شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادہ) نے پوری عمر رد شیعیت کیا تو ان کی مجالس محرم کیا آج کی مجلسوں کی طرح ہوں گی؟ اغلب یہی ہے کہ یہ دونوں رد شیعیت و رفضی ان مجالس میں کرتے ہوں گے، نہ کہ مفروضہ اور مبالغہ آمیز فضائل اہل بیت بیان کر کے علاج بالمثل۔

۲۰- اپنی تجہیز و تکفین اور دیگر مابعد مراسم تعزیت (فاتحہ وغیرہ) کے لئے چند ہزار روپیہ ورثہ کو دے۔(ص:۲۵ کا حاشیہ)

نوٹ:- یہ تشریح (فاتحہ وغیرہ) ایجاد بندہ ہے، شاہ صاحب کی عبارت نہیں ہے۔

۲۱- علم باطن کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اثنا عشر ائمہ سے زیادہ قوت والا کوئی نہیں۔(ص:۲۷،۱)

نوٹ:- اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اہل سنت کا اتفاق کہ حضرات شیخین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں غلط ہے، پھر بھی اسے صاحب مقدمہ اہل سنت کا مسلک بتا رہے ہیں۔

۲۲- ......احادیثِ صحیحہ کی مشعل ہاتھ میں رہے۔(ص:۲۷،۱۰)

نوٹ:- احادیثِ صحیحہ کی مشعل ہاتھ میں رہے تو ایسی باتیں کہنے اور لکھنے کی نوبت ہی نہ آئے جو یہاں لکھی اور یکجا کی جا رہی ہیں۔

۲۳- ......شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے عرس میں ان کے مقبرہ میں نغمہ سرائی کا ہنگامہ برپا تھا۔(ص:۲۸،۲)

نوٹ:- گانا بجانا (نغمہ سرائی اور سرور) بالاتفاق حرام ہیں، جو اعمالِ متفقہ طور پر حرام ہیں ان کی تحسین کیا شاہ صاحبؒ جیسے محقق سے ممکن ہے؟ تو پھر اس ملفوظ کے جعلی ہونے میں کیا شبہ؟ اور اگر یہاں نغمہ سرائی سے مراد کسی عارفانہ شعر کا خوش الحانی سے گنگنانا (بغیر ساز اور چنگ کے) ہے تو اس سے موجودہ طرز کی قوالی ومحفل سماع پر استدلال درست نہیں۔

۲۴- ......حضرت شاہ ولی اللہؒ کو کشف کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ان تینوں سے باز پرس نہ ہوگی۔(ص:۲۹،۱۸)

نوٹ:- اوپر گذرا کہ ’’کشف‘‘ اگر شرعی حکم سے متصادم ہو تو واجب الرد ہے، پس یہ واقعہ اگر ثابت ہے تو دو حال سے خالی نہیں کہ (۱) بلا عذر ترک جماعت پر مؤاخذہ نہیں ہوا ،ظاہر ہے کہ شریعت سے متصادم ہونے کی وجہ سے قابل رد (۲) عذر سے جماعت ترک ہوئی ، بظاہر یہ دوسری صورت قرین قیاس ہے کہ مریض کی تیمار داری اور بھوکے، کو کھانے کی فراہمی ترک جماعت کے بغیر نہ ہوسکتی ہو تو یہ ’عذر‘ ہے، پھر اس ملفوظ میں کوئی ندرت نہیں رہی، پھر نہ جانے کس مقصد سے یہاں نقل کیا گیا۔

۲۵- ......وہاں نغمائے طیبہ (اچھے گانے) ہو رہے تھے......۔(ص:۳۰،۱)

نوٹ:- نغمائے طیبہ کا ترجمہ ’’اچھے گانے‘‘ (گانے کے موجودہ مفہوم کو سامنے رکھے ہوئے) درست نہیں؛ بلکہ ’’پاکیزہ نغمے‘‘ (یعنی اچھے اشعار خوش الحانی سے پڑھے جا رہے تھے) اس کا قرینہ حافظ کا شعر پڑھنے کا تذکرہ ہے۔

۲۶- نواب صدیق حسن خاں (بھوپالی) کے پاس القول الجلی کا نسخہ تھا اور وہ اس کو مستند سمجھتے تھے...... باوجودیکہ وہ اہل حدیث کے امیر اور غیر مقلدین اور وہابیوں کے اپنے عہد میں امام تھے۔(ص:۳۴،۸)

نوٹ:- یہ عبارت تو صاف تردید کر رہی ہے، مقدمہ نگار کے اس بیان کی جو ص: ۱۸ پر گذرا، پھر یہ کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ سید صدیق حسن صاحب کے پاس جو حصہ تھا؛ بلکہ جتنا نقل کیا، وہ اسے ہی مستند سمجھے، نہ کہ پوری کتاب کو اور مقدمہ نگار خود لکھ چکے ہیں کہ یہ حصہ جس میں یہ خرافات ہیں یعنی حصہ اول ان کے پاس نہ تھا۔

۲۷- ’’......وایں رغبت بہ الہام حق ظاہر نماید......‘‘۔(ص:۴۰ نیچے سے دوسری سطر)

نوٹ:- اس سے معلوم ہوا کہ الہام وکشف میں غلطی ہوسکتی ہے۔

۲۸- ......زیرا کہ وجود سلطنت در اولیائے ایں امت بہ الہام حق......صورت نہ یافتہ (ص:۴۲ کی عبارتیں اور نوٹ ص:۷ پر دیکھے جائیں۔(ص:۴۱،۱)

نوٹ:- اگر اولیائے اُمت سے مراد خلفائے خمسہ کے علاوہ ہیں تو زیادہ اشکال نہیں۔

۲۹- اور اسے امیر شید کے بورڈ کا ایک ممبر بنا دیئے۔(ص:۴۳،۱۴)

نوٹ:- ’’اسے‘‘ سے کون مراد ہے؟‘‘

۳۰- ......کشف وکرامات کا بیشتر حصہ ضائع کر کے اس کو ناقص کر دیا گیا۔(ص:۶۵،۶)

نوٹ:- اس کے برعکس یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اصل نسخہ میں ’’وہ حقائق وکشف

وکرامات'' موجود ہی نہ ہوں؛ بلکہ صرف اسی ''محفوظہ'' نسخے میں الحاق کئے گئے ہوں: نظر بظاہر یہی زیادہ قرین قیاس ہے؛ کیوں کہ شاہ صاحب کی دوسری تصنیفات کے مطالعہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ اس طرح کے کشف وکرامات موجود ہی نہ ہوں ۔

۳۱- ...... کیوں کہ مجدد کی بات انبیاء کی بات کے مثل خطا وغلط فکر یہ سے پاک ہوتی ہے۔(ص:۷۳،۱۲)

نوٹ:- یہ تو معصوم ہونے کی شان ہوئی اور ظاہر ہے کہ مجدد معصوم نہیں ہوتا۔

۳۲- ...... بدون نصب امام بوجہ مشروع صورت نہ می بندد۔(ص:۴۲ سطر ۵)

نوٹ:- یہاں صرف امیر جہاد مراد ہے، نہ کہ مطلق امیر، جس کی طرف شاہ صاحب کی گذشتہ عبارت مشیر معلوم ہوتی ہے۔

۳۳- وہ تو حضرت سید احمد شہیدؒ صاحب کو امام معصوم بھی لکھ گئے ہیں۔(ص:۴۲ حاشیہ
)

نوٹ:- کسی کتاب میں؟ حوالہ کے بغیر ایسی خطرناک بات کسی کی طرف منسوب کرنا بددیانتی ہے اور مولانا عبیداللہ سندھی تو سید صاحب کے ناقد مشہور ہیں، اگلے صفحہ کی عبارت سے بھی ان کا ناقد ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔

۳۴- آنحضرت کے اس ارشاد کا مطلب ہے......۔(ص:۷۹، حاشیہ)

نوٹ:- حدیث کا یہ مطلب باطنیہ کی جیسی توجیہ ہے۔

۳۵- ...... مجھے دین ودنیا کے مواخذہ سے معصوم فرمایا......۔(ص:۸۰، سطر:۱۶)

نوٹ:- یہ عبارت جس انداز کی ہے وہ کسی نبی کی زبان سے بھی مستبعد معلوم ہوتی ہے، چہ جائیکہ کسی اُمتی سے کہ اس میں تھوڑی (چیلنج) کا سا رنگ نظر آتا ہے؛ حالاں کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین سراپا عجز وانکسار اور خداوند تعالیٰ کی کبریائی وبے نیازی سے لرزاں رہتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

صحیح البخاری کی ایک خدمت

التصویبات لما فی حواشی البخاری من التصحیفات

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص کی بنا پر آخری دین کی حفاظت کا وعدہ فرمایا، پھر اس کے ایفاء کی ایسی شکلیں اور صورتیں مہیا فرمائیں، ن کی نظیر گذشتہ ادیان اور ملتوں کی تاریخوں میں ملنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے، اس سلسلہ میں بسا اوقات حاملین ملت (اُمت محمدیہ علی صاحبہا التحیہ کے باتوفیق افراد) کو ایسے ایسے کاموں کی توفیق عطا فرمائی، جن کی طرف ان کاموں کے سامنے آنے سے پہلے عام طور پر بآسانی ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا؛ لیکن جب وہ سامنے آجاتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی دین کی خدمت اور اس کی حفاظت کا ایک شعبہ ہے، جو اب تک تشنۂ تکمیل تھا، اور صاحبِ توفیق شخص کے لئے چند بات تشکر وامتنان کے ساتھ دُعاء خیر دل سے نکلتی ہے۔

اُمت محمدیہ میں بلا مبالغہ بے شمار ایسی بھی کوششیں کی گئیں، جن کے ذریعہ کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ کی تفسیر وتشریح کرنے والوں کی محنتوں کی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے، جو دراصل دین قیم کی حفاظت ہی کی ایک شکل اور اسی کا ایک شعبہ ہے؛ کیوں کہ اس دین کی بنیاد ہی نقل وروایت پر ہے، اس لئے اصل ماخذ کتاب اللہ وسنت ~~رسول اللہ کے متون ہی نہیں ان کے معانی و~~مفاہیم بھی منقول ومتوارث ہیں (اسی بنا پر

''کتاب اللہ'' کے ساتھ ''رجال اللہ'' کی بقاء وحفاظت کا بھی وعدہ کیا گیا ہے اور اسی سبب سے نصوص کی وہی تشریح وتفسیر حجت ہے، جو سلف سے منقول ہو) اسی جذبہ کے تحت اسماء الرجال جیسا بےنظیر اور عظیم الشان، فن وجود میں آیا کہ جس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور صفات کی روایت کرنے والوں کے ہی احوال محفوظ نہیں ہوئے بلکہ اس کے ساتھ اولین شارحین ومفسرین کے اقوال نقل کرنے والوں کے اوصاف وحالات (کہ جن پر ان کے ثقہ ومعتبر ہونے نہ ہونے کا دارومدار ہے) کا بھی پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

یہ واحد حفاظتی طریقہ اس وقت تک، اسلاف کے اقوال واعمال نیز ان کی طرف انتساب کی صحت یا عدم صحت جاننے کا رہا جب تک کہ یہ علوم، سینہ سے سفینہ میں منتقل نہیں ہوئے تھے، علوم کی تدوین کتابی صورت میں جمع وتالیف، کا دور آجانے کے بعد مطابع ایجاد سے قبل ایک جماعت نے قلمی نسخوں یعنی مخطوطات کی حفاظت اور ان کی تصحیح وتصویب کا غایت درجہ اہتمام کیا، اس کے علاوہ کاتبوں اور نقل نویسوں یا دوسرے لوگوں سے تصانیف میں ہوجانے والی غلطیوں (تصحیفات) کی نشاندہی کی خاطر (خواہ وہ غلطیاں راویوں کے ناموں میں ہوگئی ہوں یا متون میں) مستقل کتابیں لکھ کر اس راہ میں بھی، اسی برگزیدہ جماعت نے نقش جمیل چھوڑا، چنانچہ ابواحمد الحسن العسکری (م: ۳۸۲ھ) کی ''تصحیفات المحدثین'' خطیب بغدادی (م: ۴۶۳ھ) کی ''تلخیص المتشابہ فی الرسم'' اور ان ہی کی ''الکفایہ'' (بحث فی تغیر النقط ...... والتصحیف) ابوعبداللہ النیشاپوری الحاکم (م: ۴۰۵ھ) کی ''معرفۃ علوم الحدیث'' (النوع الرابع والثلاثون) ابوعبداللہ محمد احمد الذہبی (م: ۷۴۲ھ) کی ''المشتبہ'' اور اس پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م: ۸۵۲ھ) ''تبصیر المتنبہ بتحریر المشتبہ'' اور ابن صلاح (م: ۶۴۳ھ) کے شہرۂ آفاق ''مقدمہ'' (کی النوع الخامس والثلاثون) جیسے ناموں اور کاموں سے اہل علم واقف ہی ہیں۔

چھاپے خانہ کی ایجاد نے اس باتوفیق جماعت دین اور اس کے اُصول کی حفاظت کرنے والی جماعت کو ایک بار پھر طریق کار بدلنے اور نئے اسباب ورسائل کے تقاضہ کے

مطابق نئی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کیا اور یہ کہ اسلاف کے ذخیرہ ہائے کتب، بالخصوص دینی کتابوں کی طباعت کے وقت صحت کا، اسے عبادت سمجھ کر، اس درجہ اہتمام کیا کہ مطبوعہ کتب میں غلطی نکالنا مشکل بلکہ گویا ناممکن ومحال کام بن گیا، جیسا کہ عصر حاضر کے مشہور شامی محقق عالم وعظیم محدث شیخ عبدالفتاحؒ ابوغدہ نے ایک مرتبہ کہا تھا: پرانی مطبوعہ کتابوں کو اسی طرح پڑھنا ہوگا جیسی کہ وہ چھپی ہیں، چاہے بادی النظر میں کہیں غلطی ہی نظر آئے؛ لیکن رفتہ رفتہ طباعت (دینی کتابوں کی طباعت بھی) جب ''عبادت'' کے بجائے ''تجارت'' بن گئی تو اسی برگزیدہ گروہ (دین کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس رکھنے والے افراد) کو ایک مرتبہ اور، میدان کار میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا، کہ مطبوعہ ذخیرہ کی غلطیوں کی نشاندہی کے لئے مستقل کتابیں، یا رسالے، حسبِ ضرورت لکھ کر شائع کئے جائیں اور اس طرح اسلاف کی متاع گرانمایہ کو ضائع ہونے (یا اس کے ذریعہ غلط فہمی یا گمراہی پھیلنے کے خطرہ) سے بچایا جائے، چنانچہ ہندوستان میں بھی، ایسی اب تک متعدد قابل قدر کوششیں سامنے آچکی ہیں، جن میں تقریباً ربع صدی قبل کی جانے والی ایک اہم کوشش بلکہ ضروری خدمت وہ ہے جو حضرت مولانا حکیم محمد ایوب صاحبؒ سہارنپوری (عزیز قریب حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ) نے طحاوی شریف (شرح معانی الآثار) کی مطبعی غلطیوں کی نشاندہی کے لئے مستقل کتاب تصنیف فرما کر انجام دی، اس پر تمام اہل علم بالخصوص حدیث سے اشتغال رکھنے والے حضرت موصوف کے احسان مند اور مرہون منت ہیں۔ (۱) (فجزاہم اللہ احسن الجزاء)

اسی قبیل کی ایک اور سعی مشکور کا مختصر تعارف کرانا، اس وقت راقم سطور کے پیش نظر ہے یوں تو ہندوستان میں حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی اور اس کے فیضان کا سلسلہ بہت قدیم زمانہ سے جاری ہے؛ لیکن عمومی اشاعت اور اس علم شریف کے فیوض خاص وعام تک پہنچانے کی ہمہ گیر سعی حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ (مجدد سرہندیؒ کے

معاصر) کے مبارک وجود کی رہین منت معلوم ہوتی ہے، اس کے بعد یہ شرف مسند الہند، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صوری ومعنوی اولاد و احفاد کے حصہ میں آیا، اسی طلائی سلسلے کی ایک اہم کڑی حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری (تلمیذ رشید حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ)

(۱) اسی سلسلہ کی ایک کڑی حکیم صاحب کی تازہ تصنیف ''تصویب التقلیب الواقع فی التہذیب التہذیب'' ہے۔

کی ذاتِ گرامی ہے، جن کا حاشیہ بخاری، (۱) جو دراصل تمام معتبر شروح کا خلاصہ گویا 'عطر مجموعہ' اور 'دریا بکوزہ' کا حقیقی مصداق ہے، اس کے منظر عام پر آنے کے بعد سے وہ آج تک تمام اہل علم، بالخصوص اصحاب درس، کی توجہات ومطالعہ کا مرکز بنا ہوا ہے، محشی نے حاشیہ ترتیب وتصنیف پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا؛ بلکہ اس کے صحیح اور قابل اعتماد طریقہ پر محفوظ وعام کرنے کے لئے انھوں نے خود پریس قائم کیا اور غایت درجہ تصحیح کا اہتمام کر کے خود چھپوایا کہ اس میں غلطی نکالنا محال تھا، حاشیہ کی افادیت ومقبولیت زمانہ کے مرور کے ساتھ برابر بڑھتی ہی رہی، نیز اس کی قیمت کے ساتھ مادی قیمت میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا بدقسمتی سے یہی ہنر اس میں عیب پیدا ہو جانے کا سبب بن گیا، یعنی عبادت، کے جذبہ کی جگہ تجارت کے مفادات نے لے لی تو اصحابِ مطابع اسے صرف پوری منافع حاصل کرنے کی غرض سے چھاپنے لگے، پھر نہ تصحیح کا اہتمام رہا اور نہ اس کی عمدہ طباعت ہی کا وہ معیار شروع میں اندازہ ہوتا ہے کہ اہل مطابع کی طرف سے اہتمام میں کمی ہوئی، مگر بعد وہ مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہونے لگے، چنانچہ آج کل اس کے جو نسخے تجارتی کتب خانوں سے ملتے ہیں، ان میں ہزاروں مقامات، طباعت کی وجہ سے اتنے مسخ ہوگئے کہ اصلی مراد تک پہنچنا محال ہوگیا ہے، اس کا پورا اندازہ ان حضرات ہی کو ہوسکتا ہے، جو تدریس میں مشغول رہنے کی وجہ سے مطالعہ کے وقت سخت دشواری اور ذہنی اُلجھن کا شکار ہوتے ہیں؛ کیوں کہ بعض مقامات کا مطلب حل کرتے ہوئے، سنگین قسم کی مطبعی غلطیوں کی وجہ سے دانتوں پسینہ آجاتا ہے،

(اگر) حواشی بخاری کی تصانیف میں ہندوستان [illegible] ہو جاتا ہے (بھی) چھپا لی گئی ہے
(تاکہ اصل کے ساتھ جلد بندھوائی جاسکے)۔

گذار گھاٹی سے کم وبیش، تمام ہی مدرسین کسی نہ کسی طرح گذر جاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ

(۱) یہاں اس بات کی وضاحت تو ضروری نہیں معلوم ہوتی؛ کیوں کہ اہل علم جانتے ہیں کہ آخر کے پانچ پاروں کا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (تلمیذ ارشد مولانا احمد علی کا مرتب کردہ ہے، مگر استاد وشاگرد کے کام میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، یہ ایسا امتیاز ہے جو دنیا میں کم شاگردوں کو ہی میسر آسکا ہے۔ فرحمہا اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۲) راقم کا اس پر ایک مستقل مقالہ ہے جو شائع بھی ہو چکا ہے، اصلاً وہ الامام النانوتوی سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔

جزائے خیر عطا فرمائے مشرقی یوپی کے مشہور قصبۂ مئو (جو بعد میں مستقل ضلع بن گیا کے ممتاز عالم اور فاضل اجل مولانا عبدالجبار صاحب اعظمیؒ (تلمیذ رشید محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کو کہ موصوف نے تدریس بخاری کے دوران اس مشکل کو حل کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور نہ صرف خود یہ دشوار گذار گھاٹی طے کر لی، بلکہ اس راہ کے دوسرے مسافروں کے لئے بھی خطرناک مواقع (غلطیوں) کی نشاندہی کے ساتھ، حدیث کی معتبر شرحوں اور دیگر کتابوں نیز قدیم مطبوعہ نسخہ، کے گہرے مطالعہ کے بعد ان کی اصلاح بھی فرمائی اور پھر اسے دو جلدوں میں ''**التصویبات لما فی حواشی(۱) البخاری من التصحیفات**'' کے نام سے جمع ومرتب کر کے اہل علم پر احسانِ عظیم فرمایا، مدرسہ جامعہ مظہر العلوم بنارس (جس میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب موصوف استاذ حدیث ہیں) کے منتظمین بھی تمام اہل علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے اس قلمی نسخہ کو طباعت کے ذریعہ عام کر دیا۔ **فجزاهم الله خير الجزاء**۔

مولانا محترم کی ژرف نگاہی اور عرق ریزی کا اندازہ کرنے کے لئے آئندہ صفحات میں، تصویبات، کا معتد بہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے، اجمالی طور پر اتنا بتا دینا شاید بے محل نہ ہوگا کہ پوری بخاری شریف کے حواشی میں مولانا نے کوئی تین چار ہزار کے درمیان طباعت کی غلطیاں نکالی ہیں، جن میں سینکڑوں ایسی ہیں کہ مولانا کی نشاندہی اور تصحیح کے بغیر جن کا سمجھنا تقریباً ناممکن تھا، مختصر یہ کہ کتاب کا کوئی بھی صفحہ غلطی سے خالی نہیں ہے، کم وبیش ایک درجن صفحات تو ایسے ہیں جنھیں ہر صفحہ پر دس سے زیادہ غلطیوں کی مولانا نے نشاندہی کی ہے (مثلاً

ص: ۲۰۷۵ میں ۱۴، ص: ۳۸۳، ۶۸۳، ۱۲، ص: ۶۸۴ میں ۱۱، ص: ۱۰۰۷ میں ۱۳ اور ص: ۸۳۱ میں ۱۴) اس میں شک نہیں کہ اس میں بعض غلطیاں معمولی نوعیت کی بھی ہیں (مثلاً صرف ایک نقطہ کم، یا زیادہ ہوگیا ہے) لیکن خاصی تعداد ایسی غلطیوں کی ہے جن کا عمل مولانا کی اس

(۱) حاشیہ کی جمع حواشی کی تعبیر برصغیر میں ہی مستعمل ہے، ورنہ عرب علماء اس کے لئے عموماً ہامش، یا التعلیقات (تعلیق کی جمع) استعمال کرتے ہیں۔

کاوش سے پہلے عام اہل علم کے لئے آسان نہ تھا، ذیل میں پہلے ایسی ہی سنگین غلطیوں کی فہرست کا ایک حصہ "التصویبات لما فی حواشی البخاری من التصحیفات"(۱) سے نقل کیا جا رہا ہے:

چند اہم غلطیاں جن کا پتہ چلانا مشکل تھا، التصویبات (جلد اول)

التصویبات کا صفحہ نمبر	کالم نمبر	بخاری کا صفحہ نمبر	حاشیہ وسطر نمبر	الخطاء	الصواب
۵	۲	۱۰	۲/۹	معناء خیار الخیر	معناہ حیازۃ الخط
۵	۲	۱۶	حل اللغات	الفہم من ضرب	الفہم من علم
۶	۲	۲۶	اسماء الرجال	مات ۱۱۷	مات ۱۱۷ھ
۸	۱	۶۱	۱/۱	یحییٰ بن بی الزبید القطان	یحییٰ بن سعید القطان
۸	۲	۷۰	حل لغات	کتب بفتحتین	کتب بضمتین
۸	۲	۷۴	اسماء الرجال	عشیم بن بصر بضم الموحدۃ	عشم بن بشیر بضم الموحدۃ
۹	۱	۸۱	۳/۶	فی فضل صلوٰۃ العصر	فی فضل صلوٰۃ الفجر
۱۲	۲	۱۷۰	۱/۷	ای منبتر عالا وجو باعقلیا	ای شرعیا لا وجو باعقلیا
۱۳	۲	۱۹۴	۳/۳	بنانہ بضم الموحدۃ والنون	بفتح الموحدۃ والنون
۱۶	۱	۲۶۶	۱/۱	نہر کث	نہکت
۱۷	۲	۳۰۵	۶/۶	عثمان الغنی	عثمان البتی

۱۸	۱	۳۰۸	۲/۷	اذا اقدر علی الفساد	اذا اقدر علی السفاد
۲۱	۱	۳۶۲	۲/۸	ہذا یتعلق بکتمان الشہادۃ	لا یتعلق بکتمان الشہادۃ
۲۱	۱	۳۶۸	۲/۵	یمین المدعی علیہ أم لا	یمین المدعی علیہ سواء رضی المدعی بیمین المدعیٰ علیہ أم لا
۲۲	۱	۳۸۱	۶/۷	ان یاخذوا من المسلمین عنوۃ	ان یاخذوا من المسلمین غرۃ (غ، ر، ۃ)

۲۳	۲	۴۱۵	۱۰/۵	محمد البزار الدولابی	فی ان محمد بن الصباح، وفی قس محمد بن صباح البزار
۲۴	۱	۴۲۴	۲/۱۲	تجعل اسر نفسہ	تجعل نفسہ اسیرا
۲۵	۱	۳۳۸	حل لغات	وعملہا للام	وتحیلہا الی الامام
۲۵	۱	۴۴۲	اسماء الرجال	سعید بن کثیر بن غنم	سعید بن کثیر بن عفیر
۲۵	۲	۴۴۹	۲/۶	قاتل اسم من المقاتلۃ	قاتل اسم فاعل لا فعل من المقاتلۃ
۲۷	۱	۴۷۵	اسماء الرجال	قال المعتری	قالہ المسعودی
۳۱	۱	۵۳۸	۶/۴	انکار لہ بہ	انکار مالا علم لہ بہ
۳۲	۱	۵۰۳	۳/۱۰	کانت فی خلافۃ أبی بکر	ماتت فی خلافۃ أبی بکر

التصویبات (جلد ثانی)

۴	۲	۵۹۹	۱/۲	لا یکفون القسم	لا یکفون انفسہم
۶	۱	۶۲۴	۸/۹	کان یقال لہا الکعبۃ الشامیۃ	کان یقال الکعبۃ الیمانیۃ والتی بمکۃ
۹	۱	۶۸۴	ے	خط بالطاء المہملۃ	حظہٗ بالحاء المہملۃ
۹	۱	۶۸۶	۶/۱۱	انما یتحاظ	انما یتجہ اذا

۱۰	۱	۷۰۰	۶/۳	قولہ علیہ السلام ففہمت	قولہ علیہ السلام لہا احمدی اللہ ففہمت
۱۰	۲	۷۰۰	۲۲/۸	ذہب اک وحلفہ منفعل تان	ذہب ذاک وحلفہ مفعول ثان
۱۲	۲	۷۳۴	۲/۵	شرۃ الخلق بفتح القاف	شدۃ الخلق بفتح الخاء وسکون الاّم
۱۵	۲	۷۸۰	ما ــ	ارادت تھاثری	اردات ان ضرتہا تری
۱۶	۲	۷۹۵	ما ــ	المحب لا یکون الا گوباد بالقلس	المحب لا یکون اِلاّمحبوباد وبالعکس
۲۰	۱	۸۳۱	۲/۱۳	قال الکسائی سرعان اخفادہم	قال الکسائی سرعان القوم اخفاءہم
۲۹	۱	۱۰۰۹	ــ	فاستعیر السکت للکلام	فاستعیر الکسب لا فانیۃ فی الکلام
۲۹	۲	۱۰۱۶	۶/۲	قال الجوہری	قال صاحب الجوہر النقی
۲۹	۲	۱۰۱۸	۱/۵	عنہ البخاری باختصار الجمہور	عنہ البخاری بالاختصار المجف
۳۶	۲	۱۱۲۷	۱۲/۱	جاءغرءافلا بلاہا	جاءعزیز فاملاہا
۳۶	۲ آخری	۱۱۲۹	۳۶/۵	فیخرجون من اللہ	فیخرجون من النار

مذکورہ بالا غلطیاں ''مشتے نمونہ ازخروارے'' کے طور پر نقل کی گئیں ہیں، ورنہ اس کے علاوہ بھی بکثرت غلطیاں تو ایسی بھی ہیں جنھیں ''التصویبات'' میں نقل کرکے ان کی تصویب وصحیح کردی گئی ہے، بعض غلطیاں تو ایسی بھی ہیں جن میں نفی کا اثبات اور اثبات کی نفی ہوگئی ہوان میں سے چند بطور نمونہ کے ذیل میں نقل کی جارہی ہیں :

چندوہ غلطیاں جن سے نفی کا اثبات کی نفی جیسا عظیم فرق ہوگیا

۱۶ جلد ثانی	۲	۷۹۳	۲/۸	قال الحنفیۃ، لایصح طلاق المکرّہ	قال الحنفیہ یصح طلاق المکرّہ
۱۶ جلد ثانی	۲	۷۹۳	۲/۸	قالت الائمۃ الثلاثۃ بصح	قالت الائمۃ اللاثہ لا یصح
۴۵	۱	۱۰۹۸	۲/۸	مع أنہ مانع من دخولہم	مع أنہ لا مانع من دخولہم

یہاں شاید یہ بات ذکر کردینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ خود مصوب مدظلہ سے بھی بعض فردگذاشتیں ہوگئی ہیں، ظاہر ہے کہ ایسا ہوجانا بعید نہیں تھا اور نہ محل تعجب! نیچے بس ایسی چند ہی فروگذاشتو کی نشاندہی کی جارہی ہے اور اسی کے ساتھ'' کیا ہونا چاہئے'' بھی ذکر کردیا ہے۔

خود مصوب کی چند فروگذاشتیں اور مبہم عبارتیں جن کی اصلاح نیز تصویب وتشریح کی ضرورت ہے :

التصویبات کا صفحہ نمبر	کالم نمبر	سطر نمبر	فروگذاشت (جسے التصویبات میں صواب قرار دیا گیا ہے)	کیا ہونا چاہئے
۶	۱	۲۷	ابوزرعۃ بفم الزاء (بالہمزۃ)	ابوزرعۃ بضم الزای (بالیاء، یعنی زای)
۷	۱	۱۸	محمد بن حازم بالخاء والزاء (بالہمزۃ)	محمد بن حازم بالخاء والزای (بالیاء)
۳۰	۲	۱۷	اُوداُبوداؤد (بالہمزہ) بہذاالحدیث	اُورداُبوداؤد (بالراء) بہذاالحدیث (۱)
۲۳	۱	۱۱	شرق بالکسرلفہر ملأ الکف	شرق بالکسر وفہرایضاً بالکسر وہو الحجر ملأ الکف وقیل ہوالحجر مطلقاً
۲۷	۱	۲۰	ای اُنجتہا	اُنحتہا

ظاہر ہے کہ یہاں ''التصویبات'' کی فروگذاشتوں کا استیعاب کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ چند مواقع کی نشاندہی محض اسی غرض سے کردی گئی ہے کہ مولانا محترم دوسرے ایڈیشن کی

اشاعت کے وقت نظر ثانی فرما سکیں ؛لیکن اس میں فروگذاشتوں کی تعداد اتنی کم ہے جس کی اس عظیم کارنامہ کے مقابلہ میں — جو مولانا نے ’تصویبات‘ کے ذریعہ انجام دیا ہے،کوئی حیثیت نہیں (پھران میں مطبعی خامیوں کا احتمال بھی ہے)۔

(۱) لطیفہ: راقم حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہ کے زمانہ قیام سہارنپور وہاں حاضری کے وقت حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایسی ہی ایک حاضری کے وقت موصوف نے مجھ سے متعلقہ اسباق کی بابت دریافت فرمایا اس زمانہ میں ابوداؤد کا سبق بھی مجھ سے متعلق تھا تو میں نے عرض کیا......اور ابوداؤد (بالواؤ) اس پر موصوف نے مسرت آمیز تعجب کا اظہار فرماتے ہوئے کہا عموماً لوگ ابوداؤد (بالھمزہ) کہتے ہیں تم نے صحیح تلفظ کیا’’ مولانا علیہ الرحمہ سے واقف، سب جانتے ہیں کہ موصوف کو تمام علوم متوادلہ، بالخصوص عربیت میں بڑا اتقان حاصل تھا، اس لئے ان کے نزدیک معمولی فروگذاشت بھی بالخصوص جو طلبۂ علم کی طرف سے ہونا قابل برداشت ہوجاتی تھی۔

مولانا نے حواشی ، کی تصحیفات (غلطیوں کے احاطہ کا اگرچہ دعویٰ نہیں کیا ہے ، جیسا کہ موصوف نے التصویبات کے شروع ’’ ملاحظات وتنبیہات‘‘ کے تحت صراحت کردی ہے) لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ آں محترم نے اپنی دانست میں چھوٹی غلطیوں کی نشاندہی کردینے کی بھی حتی الامکان کوشش کی ہے، چنانچہ اس طویل فہرست میں بڑی تعداد ایسی غلطیوں کی ملتی ہے جنھیں معمولی قرار دیا جانا چاہئے ، ذیل میں اس کی بھی چند مثالیں ’’التصویبات‘‘ سے نقل کرکے پیش کی جارہی ہیں :

معمولی نوعیت کی اخطاء

بخاری کا صفحہ نمبر	حاشیہ نمبر	سطر نمبر	خطاء	صواب
۳۲۰	۲	۲	معقلات بالغناء (بشکل غین)	معقلات بالفناء (بالفاء)
۳۵۱	۲	۲	فلن (بالفاء ایک نقطہ)	قلن (بالقاف، دونقطہ)
۶۸۳	ب		جمع غصتۃ (نقطہ تھوڑا سا ہٹ گیا)	جمع عضتۃ بالعین المھملۃ والضاد المعجم
۷۴۶	۱	۲	فھوخریمۃ (بغیر نقطہ)	فھوخزیمۃ (بالنقطہ)
۸۲۴	۵	۴	للجاجتۃ (ایک نقطہ زیادہ ہوگیا)	للحاجتۃ

خلاصہ کلام یہ کہ مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی (استاذ تفسیر وحدیث جامعہ مظہر العلوم بنارس) کی یہ سعی مشکور بڑی ہی نافع اور اہل علم ، بالخصوص بخاری شریف کے درس وتدریس میں مشغول حضرات کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔

تمام خدام علم کی طرف سے حضرت مولانا مدظلہ بجا طور پر شکریہ کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے شایانِ شان جزاء خیر عطا فرمائے، ان کی علم ودین کی خدمت قبول فرمائے۔

ایں دُعاء از من و از جہاں آمین باد

☆ ☆ ☆

علامہ کشمیریؒ اور فیض الباری کی عظمت واہمیت اور اس پر محنت کی ضرورت

برصغیر ہند پر آفتاب اسلام کی شعائیں اگرچہ پہلی صدی ،ہجری سے ہی پڑنے لگی تھیں ،مگر ان کے عام ہونے اور تمام گوشوں تک پہنچنے اور منور کرنے میں صدیاں لگیں، پھر تو یہ سرزمین جو نامعلوم زمانہ سے ضلالتوں کی ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی تھی ،نور اسلام سے ایسی جگمگائی کہ اس پر سارا عالم، حتیٰ کہ وہ علاقے بھی جہاں اسلام کا سورج طلوع ہوا تھا، رشک کرنے لگا اور آخری دور میں بارہویں صدی سے پہلے شاہ ولی اللہؒ اور ان کی اولاد واحفاد امجاد کی بدولت ، پھر دارالعلوم دیوبند کے فیض سے تو اسے بالخصوص علوم عالیہ اور بالاخص حدیث نبوی کی خدمات میں بلا شبہ ایسا امتیاز حاصل ہوا کہ علامہ رشید رضا مصری جیسے باخبر اور متبحر ومتیقظ اور عالم اسلام پر گہری نظر رکھنے والے مصری عالم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ

''ہمارے ہندوستانی علم دوست بھائی اگر اس فن شریف کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو دنیا سے یہ مٹ گیا ہوتا (موصوف کے الفاظ آگے ذکر کئے جائیں گے) مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے، جنھیں معلوم بھی ہے ان میں سے کم ہی افراد کی اس طرف توجہ ہوئی ہوگی کہ علامہ موصوف نے یہ تاریخی جملہ کب کہا اور اس کا پس منظر کیا تھا؟ جاننے والے تو جانتے ہیں، اگر چہ وہ بہت تھوڑے ہیں؛ لیکن جو نہیں جانتے انھیں جنانے کے لئے یہ حقیقت — جو خوش فہمی یا افسانہ نہیں بلکہ ایک مسلم تاریخی واقعہ ہے، ظاہر کی جاتی ہے کہ علامہ نے یہ اظہار حقیقت ہندوستان کے دورے سے واپسی پر کیا اور بتانے کی ضرورت نہیں کہ موصوف نے اپنے اس تاریخی دورے میں مادر علمی، از ہر ہند، علومِ حدیث وغیرہ کی خدمات میں مشغول ایسے ادارہ (دارالعلوم دیوبند) کی زیارت اور وہاں کے طریقۂ درس اور علمی و عملی نمونوں کے دیکھنے کے بعد کیا، جس کی نظیر برصغیر تو کیا پورے عالم اسلام میں بھی ادھر کئی صدی سے ملنا مشکل ہے اور از ہر ہند کے اس سفر کی خاص بات، جسے یقیناً علامہ رشید رضا کو متاثر کیا، خاتم المحدثین، بخاری زماں، فرید عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ ونور اللہ مرقدہ، جن کے ذکر و تذکرہ سے قلوب منور کرنے اور جن کے نقش پا سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے یہ محفل پر پا گئی ہے، موصوف کی وہ تعارفی تقریر تھی جس میں علم وفن کے ایسے نایاب موتی لٹائے گئے تھے، جس سے علامہ رشید رضا حیران رہ گئے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ میں نے آج تک ایسا شیخ نہیں دیکھا، مشہور وسیع النظر محقق عالم ومؤرخ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ناقل ہیں:

> دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ رشید رضا کرسی سے اُٹھ اُٹھ جاتے تھے اور جب وہ تقریر جو عربی میں ہورہی تھی ختم ہوگئی تو علامہ رشید رضا کی زبان پر بار بار بے ساختہ یہ جملہ آتا تھا: ''**ما رأیت مثل هذا الاستاذ الجلیل قط**'' اور اس درسگاہ جس کا یہ اعلیٰ اور نادر نمونہ رشید رضا نے دیکھا — کے بارے میں فرمایا ''**لولا**

> **رأيتها رجعت من الهند حزينا**'' اگر دیوبند کے دارالعلوم کو دیکھے بغیر لوٹتا تو بہت صدمہ ہوتا۔(۱)

رشید رضا مصری کا اعتراف اسی پر ختم نہیں ہوجاتا؛ بلکہ جب ان کی ہندوستان سے واپسی کے خاصے عرصہ بعد حدیث کا پہلا مشہور جامع انڈکس ''مفتاح کنوز السنة'' شائع ہوا تو اس کے مقدمہ (ص: ق) میں موصوف نے ہندوستانی ......علماء کی حدیث پر خدمات کا نہایت شاندار الفاظ میں برملا اعتراف کیا اور لکھا:

> **ولو لا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضى عليها بالزوال ...... فقد ضعف في مصر والشام والعراق والحجاز حتى بلغ منتهى الضعف.**
>
> اگر ہمارے ہندوستانی علم دوست دینی بھائی علوم حدیث کی اشاعت وخدمت وغیرہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم دنیا سے رخصت ہوگیا ہوتا؛ کیوں کہ اس علم شریف کے جو قدیم مراکز تھے مثلاً، مصر، شام، عراق اور حجاز وہاں یہ ضعف کے انتہائی درجہ تک پہنچ چکا ہے۔

اس کے لئے کون اس بات سے انکار کرسکتا ہے کہ علامہ رشید کا یہ اعتراف درحقیقت دارالعلوم دیوبند اور اس کے ابناء وانجال کی خدمات کا اعتراف ہے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ یہ کتاب (مفتاح کنوز السنة) پہلی بار اسی سال شائع ہوئی جس سال علامہ کشمیریؒ نے دنیائے دنی سے کوچ کیا (یعنی ۱۳۵۲ھ، مطابق ۱۹۳۴ء) علامہ کشمیریؒ کے بارے میں ایک جلیل القدر مصری عالم کی شہادت سن لینے کے بعد اب ایک ہندی محقق عالم کہ جس کی جلالت شان پر سب واقف متفق ہیں، کی شہادت پر مطلع ہوجانا بھی بے محل ہوگا، اس دوسری شہادت کی اہمیت، بعض اعتبارات سے پہلے سے بھی

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت: ۱/۳۵۸۔

زیادہ ہے کہ یہ ایک علم استاد اور شریک کار نیز ایک طرح سے معاصر کی شہادت ہے، سب جانتے ہیں کہ ہم عصروں کی چشمک اعترافِ حق وحقیقت سے بالعموم روکتی ہے، ایسی صورت میں ہم عصری کی شہادت بلا شبہ سب پر فائق ہونے کے لائق ہے، بالخصوص جب کہ وہ خود مبصر اور عظیم الشان حیثیت کا حامل ہو، میری مراد متکلم اسلام، مفسر قرآن اور محدث جلیل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے ہے، موصوف نے علامہ کشمیری کی عظمت وجلالت کا اعتراف جن بلند کلمات میں کیا ہے وہ بجائے خود تاریخی اہمیت کا ایک واقعہ ہے۔

علامہ عثمانی علیہ الرحمہ نے اپنی شہرہ آفاق اور بے نظیر کتاب ''فتح الملہم''، شرح مسلم میں ایک سے زیادہ بار حضرت کشمیریؒ کی بلندیٔ مرتبہ کا تذکرہ کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :

الشيخ العلامة التقى النعى الذى لم تر العيون مثله ولم يرهو مثل نفسه ولو كان فى سالف الزمان لكان له ، شأن فى طبقة أهل العلم عظيم وهو سيدنا ومولانا الأنور الكشميرى ثم الديوبندى ۔ (۱)

علامہ کشمیری کے غیر معمولی حافظہ اور وسعت مطالعہ کا اعتراف ہر وہ شخص کرنے پر مجبور ہوا جس نے انھیں دیکھا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق معتمد تعلیم مولانا عبد السلام ندوی مرحوم سے راقم نے خود سنا کہ :

مولانا سید محمد طلحہ حسینی ٹونکی (جو بڑے فاضل اور وسیع النظر عالم اورنٹیل کالج لاہور کے پروفیسر تھے) کہا کرتے تھے اگر ہم نے علامہ کشمیریؒ کو نہ دیکھا تو محدثین سابقین کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات منقول ہیں ان پر یقین کرنا مشکل ہوتا۔

ایسی شخصیت اور اس کے کارناموں — بلکہ کسی ایک کارنامہ — پر قلم اُٹھانا راقم بڑی جرأت وجسارت کی بات سمجھتا ہے، اس لئے مخدوم زادۂ گرامی مرتبت حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری، خلف حضرت علامہ کشمیریؒ کا حکم نامہ ملنے کے بعد بھی قلم کو حرکت دینا

آسان نہیں معلوم ہوا، پھر ''الامر فوق الادب'' کے تقاضہ سے قلم کو جنبش دینے کا ارادہ کیا تو علامۂ مذکورہ کی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں میں سے کس کو اختیار کیا جائے، یہ سوال دامن کش ہوگیا؛ کیوں کہ یہاں صورتِ حال ''گل حسن تو بسیار'' کی موجودگی اور ''تنگ دامنی'' واقعی معنی میں سامنے آکر حجاب سا بنتی نظر آنے لگی، مگر پھر بھی ہمت کرکے علامہ کے سب سے اہم یا اہم کارناموں سے ایک ''فیض الباری'' کے مطالعہ پر تاثرات ظاہر کرنے کی جرأت کا بایں خیال ارادہ کرلیا کہ اہل علم کے سامنے جب فیض الباری کے مطالعہ پر مبنی یہ تاثرات وخیالات آئیں گے تو بہر حال فائدہ سے خالی نہ ہوں گے؛ کیوں کہ اندازہ ہے کہ سامعین

(۱) فتح الملہم: ۱/۳۳۵، طبع اول۔

میں سے ایک تعداد ضرور ایسی ہوگی جسے اس کے مطالعہ کا یا اس سے استفادہ کا براہ راست موقعہ نہ ملا ہوگا تو اسے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا۔

یوں تو امیر المومنین فی الحدیث امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ کی ''الجامع الصحیح'' کی بے شمار شروح وحواشی نیز درسی تقاریر منظر عام پر بھی آچکی ہیں (جن کی تفصیل حضرت شیخ الحدیث مرشدنا وشیخنا مولانا محقق شہیر محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ کے قلم سے ''لامع الدراری'' کے مقدمہ میں دیکھی جاسکتی ہے) مگر فیض الباری (جو حضرت کشمیری کے درس بخاری کے افادات پر مشتمل املائی تقریر ہے (جسے حضرتؒ کے بلند پایہ ورشا گردوں — مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ — نے مرتب وقلم بند کیا) بالکل امتیازی حیثیت کی حامل ہے، راقم کا ارادہ متن بخاری کی شرح کے سلسلہ میں جو علامہ نے موتی بکھیرے ہیں انھیں سمیٹنے یا پیش کرنے کا بالکل نہیں ہے کہ وہ تو عام شروح میں بھی بالعموم مل جاتے ہیں؛ بلکہ اس وقت پیش نظر ان امتیازات کا پیش کرنا ہے، جو راقم کی نظر میں علامہ کی اس درسی تقریر کا خاص حصہ ہیں، یہ مطالب نہیں کہ وہ باتیں کہیں اور ملتی ہی نہیں یا یہ کہ وہ

سب کی سب علامہ کا ابتکارِ فکر ہیں ؛ بلکہ یہ ہے کہ اس سے قبل صحیح بخاری بلکہ حدیث کی کسی کتاب کے درس کا یہ اندازہ نہیں ملتا، جس کا فیض ’’فیض الباری‘‘ کے ذریعہ عام ہوا (گویا اسم بامسمیٰ کا مصداق ہے) اگرچہ اس میں بلا شبہ بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کا ذکر اور کہیں ملنا مشکل ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ تمام خصوصیات و امتیازات کا ذکر کرنا اس وقت نہ مقصد ہے اور سیمیناروں کے شرکاء کے لئے محدود وقت کی گنجائش کے پیش نظر نہ یہ ممکن اور پھر یہ کہ تفصیل کے کے لے مقالہ نہیں کتاب کی ضرورت ہے، اس لئے سر دست پہلی جلد ہی کے بس چند امتیازی پہلوؤں پر گفتگو وہ بھی مختصر انداز میں کی جا رہی ہے۔

ان امتیازی پہلوؤں کی چند قسمیں کی جا سکتی ہیں :

۱- ابتکار

یعنی علامہ سے پہلے کسی کے یہاں یہ تحقیق نہیں ملتی ، یا کم از کم ایسی وضاحت وصراحت سے دوٹوک انداز میں نہیں ملتی ، مثلاً تواتر کی اقسام اربعہ تواتر من حیث الاسناد، تواتر من حیث الطبقہ ،تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک (ص:۷۰) یہ آخری قسم اس صراحت وعنوان کے ساتھ کہیں اور نہیں ملتی ،عموماً پہلی تین قسمیں ہیں، بیان کی جاتی ہیں :

۲- دقیق وکمیاب علمی حقائق کا بیان

اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

(الف) عوالم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا :

العوالم عند الصوفية على انحاء عالم الأجساد العنصرية ، وهى التى فيها المادة والمقدار وعالم المثال وهى التى لا مادة فيها مع بقاء الكم والمقدار كالشبح المرئى فى المرأة وعالم الأرواح وهى التى

لا مادة فيها ولا كم ولا مقدار و قد صرحوا ان عالم المثال لتجرده عن المادة أقوى من عالم الأجساد وليس كما زعمه بعض الجلاد انه من التخيلات الصرفة ...... واما عند علماء الشرع فليس هناك الا عالمان ، عالم الارواح وعالم الاجساد وقد يخطر بالبال ان ما سماره الصوفية عالم المثال هو الذى سماه أهل الشرع عالم الأرواح ...... اماما سماه الصوفية " الأرواح المجردة " فلم يبحث عنها العلماء ...... ولا أدرى أحداً من علمائنا ذهب إلى تشكل الأرواح الانسانية غير الشيخ الأكبر ـ (۱)

(۱) مقدمہ فیض الباری: ۲۲ طبع اول۔

اسی موضوع پر علامہ نے آگے بھی مزید کچھ نادر باتیں ارشاد فرمائی ہیں مثلاً یہ :

اعلم أن عالم المثال ليس اسماً للحيّز بل هو اسم لنوع من الموجودات ...... ثم اعلم أن مارّونه (لعله " ان ما يراه ") الأولياء من الاشياء قبل وجودها ، الفاظ حديث : " وأجد نفس ربكم من قبل اليمن " ـ (۱) فى العالم لها ايضاً نحو من الوجود كما أن با يزيد البسطامى رحمه الله لما مر من جانب مدرسة وهبت ريح قال : انى اجد منها ريح عبد من عباد الله فنشاء الشيخ ابوالحسن الخرقانى وكما قال النبى صلى الله عليه وسلم : انى أجد نفس الرحمن من اليمن فنشاء منه الأويس ـ (۲)

(ب) ويمكن عندى رؤيته صلى الله عليه وسلم يقظة

لمن رزقه الله سبحانه كما نقل عن السيوطى رحمه الله (وكان زاهداً ......) انه رأه صلى الله عليه وسلم اثنين و عشرين مرة وسأله عن أحاديث ثم صححها بعد تصحيحه صلى الله عليه وسلم وكتب اليه الشاذلى يستشفع به فيه ضرر نفسى وضرر الأمة لأنى زرته صلى الله عليه وسلم غير مرة ولا أعرف فى نفسى أمراً عير أنى لا أذهب إلى باب الملوك فلو فعلت أمكن أن أحرم من زيارته المباركة ...... والشعرانى أيضاً كتب انه رأه صلى الله عليه وسلم وقرأ عليه البخارى ...... فالرؤية يقظة متحققه وإنكارها جهل ۔ (۳)

(۱) مسنداحمد:۲/۵۴۱۔ (۲) مسنداحمد:۱۸۲۔ (۳) فیض الباری:۲۰۴۔

(ج) واعلم ان المفسرين أخرجوا آثار آتحت قوله تعالىٰ : " وان من شيئ الا يسبح بحمده ويستفاد منها انقطاع فانه لا يسبح فى زمان مع أن الآية تدل على العموم ففى الآثار أن الثوب إذا كان أبيض فانه يسبح وإذا التسخ فانه لا يسبح وهكذا الماء إذا كان جاريا يسبح وان ركد ينقطع عنه التسبيح وكذلك المرأة إذا حاضت وأما الحمار والكلب فانهما لا يسبحان أصلاً ، ومن هنا تبين لى وجه كونهما قاطعين بصلاة المصلى ...... ولذا غضبت عائشة رضى الله عنها وقالت عدلتمونا بالكلاب والحمر وقيد الحائضة وان لم يكن فى عامة الطرق ، لكنه عند ابى داؤد ، يقطع الصلاة المرأة الحائضة ...... ولم أر أحداً

منهم تنبه بهذه الدقيقة ، قلت ولذا يتجس بوقوع النجاسة كما اختاره الحنفية وهكذا الحال فى الحجر اذا ثبت فى مكان واذا اقلع والشجر اذا كان رطبا واذا يبس والذى تبين لى والله اعلم ان هذه الاشياء كلها تسبح فى الحالين كما شهد به النص (اى القرآن الكريم) إلا انه يتغير نوع تسبيحها ...... لا أنه لا يسبح اصلاً ...... ۔ (۱)

(د) أشهر المستخرجات (على صحيح البخارى من اثنين وعشرين مستخرجا) للإسماعيلى وقد رأيت خطبة فى اعلىٰ ذروة الفصاحة ورأيت مقولة

(۱) ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ باب ما یقطع الصلوٰۃ:۷۰۳۔

رافضى (؟) قال " من أراد العربية كفى له القرآن وكتاب البخارى والهداية " قلت لاريب انه حق ، وعندى ابن الأثير وصاحب مقامات البديع من البلغاء واما الحريرى فلا نقل ان مقاماته لما طارت الى الأفاد دعاه ، بعض الخلفاء العباسيين وامره أن ينشأ مضموناً وكان إذا كتب شيئاً أو تكلم فى نتف لحيته فلم يقدر عليه وانقلب خائباً ۔ (۱)

(ہ) استقبالِ قبلہ کی بحث کے دوران ،قبلہ سے متعلق بعض غامض و نادر حقائق علامہ کی زبان فیض ترجمان سے بیان ہوئے ہیں،جن کا کچھ حصہ نذر کیا جارہاہے :

استقبال القبلة كان من الاجتهاد أو من الوحى ؟

محقق ابن القيم رحمه الله فى " هداية الحيارى" ان

مـكـة شـرفها الله وبيت المقدس كانتا قبلتين من قبل وكـان ابـراهيـم عـليـه السـلام عيـنهمـا فـالقبلتـان ابـراهيـميتان وذهب جماعة إلى أن بيت المقدس لم تـكـن قبـلـة قـط وانـمـا كـان بنو اسرائيل مـامورين بـاستـقبـال التـابـوت فـي صـلـوتهـم ...... وانما كانوا يستـقبـلـون بيـت المقدس من عند أنفسهم ووجه أن سـليـمان عليه السلام لما نباه فى زمانه وضع التابوت فـي البيت فجعلوا يستقبلونه لاجل التابوت ...... قلت ولـي فيـه تـردد والأصل ان الذبيح اثنان اسحاق عليه السـلام وقـرب بـه فى بيت المقدس فكانت قبلة بني اسـرائيـل وقـرب باسماعيل عليه السلام فى بيت الله

(۱) مقدمہ فیض الباری: ۳۷۔

فـجـعـلـت قبـلـة بنيه وفى التوراة تصريح بأن يعقوب عـليه السلام كان غرز خشبة فى بيت المقدس وكان أوصـى لبيـنـه أن يـجـعـلـوها قبلة عند ما يفتح عليهم الشـام ...... وحيـنـئـذ تـحـصـل أن القبلتين كانتا على تـقسيـم البـلاد فثبت الله كانت قبلة لأهل بلدته لانهم كـانـوا بـنـي اسـماعيل عليه الصلاة والسلام فى مكة تـوجـه إلى البيت تبعا لاهل بلدته ...... فلما تحول إلى الـمـدينة توجه إلى ما كان أهل تلك البلدة يتوجهون اليهـا ...... لـا أن بيـت الله كـانـت قبلة ثم صارت بيت الـمـقـدس قبلة بل كلتاهما كانتا قبلتين ...... فلم تكن

الـقبـلـتان فى مكة والمدينة من اجتهاده صلى الله عليه

وسـلـم بـل كـانتـا عـلى الأصل يعنى من لدن ابراهيم عليه الصلاة والسلام۔ (۱)

۳- بالغ نظری وجرأت

علامہ کی نظر وسیع ہونے کے ساتھ دقیق بھی تھے اور پھر انھیں اپنے مطالعہ اور تحقیق پر اس درجہ اعتماد تھا کہ وہ دوسرے بڑے سے عالم کی رائے پر جرأت کے ساتھ نقد فرما دیتے تھے، جوان کے اعتماد اور حق گوئی کی بین دلیل ہے، اس کی مثالیں علامہ کے یہاں بکثرت ملتی ہیں، ان میں سے چند یہاں ذکر کی جارہی ہیں :

(الف) صابی کی حقیقت کے بارے میں زمانۂ قدیم سے علماء میں اختلاف چلا آتا ہے اور کبار علماء کی آراء متفاوت بلکہ متضاد ملتی ہیں، علامہ کشمیری ان گنے چنے ہندوستانی علماء میں ہیں جن کی نظر علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں پر بھی وسیع اور گہری تھی؛ حالاں کہ اس

(۱) مقدمہ فیض الباری: ۱۳۳۔

زمانہ میں علماء بالعموم علامہ ابن تیمیہ سے یا تو پوری طرح واقف نہ تھے یا بہت بدظن تھے، مگر علامہ کشمیری بایں طور منفرد تھے کہ علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں اور نظریات سے پورے طور پر واقف بھی تھے اور ان کے بے جا نقاد نہ تھے؛ بلکہ ان کی عظمت کے قائل تھے، چنانچہ انھیں حافظ، کے لقب سے یاد کرتے ہیں، بعض مواقع پر ان کی تعریف کی اور ان کی تحقیق سے اتفاق بھی کیا (مثلاً دیکھئے، ص: ۱۱۵) لیکن جہاں اختلاف رائے کیا اس کا برملا اظہار کیا، جیسا کہ دوسرے علماء کی رائے وتحقیق سے اختلاف کی صورت میں ان کا اندازہ ملتا ہے، وہی اس موقع پر بھی رہا مرعوبیت کا شکار نہیں ہوتے، چنانچہ ’صابی‘ کی حقیقت کے بارہ میں علامہ ابن تیمیہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے، فیض الباری میں اس کی تفصیل یوں ہے :

...... رأيـت فـي ” الـمـلـل والنحل “ ان الحنيف مقابل

لـلـصـابي وليعلم منه ان الحنيف هو المعترف بالنبوة

والصابی هو المنکر بالنبوة ومر علیه الحافظ ابن تیمیه رحمه الله تعالیٰ فی مواضع ولم یکتب شیئاً شافیاً ...... ولما لم یدرک حقیقة الصائبین غلط فی تفسیرها ففسر قوله تعالیٰ (إن الذین آمنوا والذین هادو والنصاری والصائبین الخ) من آمن بالله والیوم الآخر بالصابئین الذین کانوا مؤمنین وزعم أن الیهود والنصاری کما انهم کانوا مؤمنین فی زمنهم ...... کذلک الصائبون ایضاً کانوا مؤمنین ...... مع انهم لم یؤمنوا قط فان فریقاً منهم کان یتدین أول المبادی علی طریقه الفلاسفه ، وفرقة أخری کانت تتعبد بالنجوم فی هیاکلهم وأخری کانت تخت الأصنام وتعبدها ۔ (۱)

(۱) فیض الباری:۱۲۸۔

(ب) ایک مشہور اُصولِ فقہ کے مسئلہ (کتاب اللہ کی تخصیص وزیادۃ ایک ہی ہے چیز ہے یا الگ الگ دو حقیقتیں) میں علامہ کشمیریؒ نے محقق ابن ہمام (حنفیہ میں ان کا جو مقام ہے وہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں) جیسے عظیم المرتبت شخص کی رائے سے اختلاف کیا، فیض الباری میں اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے :

جعل الشیخ ابن الهمام مسئلة الزیادة والتخصیص من واد واحد وقال انه زیاده کتقیید المطلق إلا انهم لا یسمونها زیادة اصطلاحاً بل یسمونها تخصیصها والتقیید زیادة ، اقول هما مسئلتان مختلفتان ، ولیس التخصیص من باب الزیادة ۔ (۱)

اس موقعہ پر مرتب نے علامہ کی بات کے صحیح فہم میں کچھ تردد ظاہر کیا ہے۔

(ج) فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار پر ایک مسئلہ کی نقل میں — علامہ کشمیریؒ نے نقد کیا اور صاحب کتاب کی فروگذاشت کی نشاندہی کی اور ساتھ ہی اس کے شارح (علامہ ابن عابدین شامیؒ) کی اس جگہ خاموشی پر تعجب کا اظہار کیا (گویا ان پر بھی ایک طرح کی تنقید کی) فرماتے ہیں :

ثم فی الدر المختار (ص:۴۴) مسألة سهافیها صاحبه ...... وهو سهو بین ...... والعجب من ابن عابدین حیث لم یتعقب علیه ۔ (۲)

(د) بنی اسرائیل پر فرض نمازوں کی تعداد کے بارے میں قاضی ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی کے بیان کی — جو ان کی شہرہ آفاق تفسیر ''انوار التنزیل واسرار التاویل' معروف بہ تفسیر بیضاوی — سورۂ بقرہ کے آخر میں ہے، تغلیط بایں طور پر فرمائی :

واعلم ان الصلاة کانت فی بنی اسرائیل ایضاً وعند

(۱) مقدمہ فیض الباری:۵۲۔ (۲) ردالمحتار: ۳۱۶۔

النسائی فرضت علیهم صلاتان لا کما فی البیضاوی انها کانت خمسین ۔ (۱)

یہ بات (خمسین صلاۃ) متعدد تفسیروں، حدیث کی شرحوں اور اُصولِ فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے، اس غلطی کی بنیاد اور تفصیل جاننے کے لئے راقم کا سب سے پہلا مطبوعہ مقالہ دیکھا جائے جو تقریباً چالیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور پہلی بار ماہنامہ'' دارالعلوم دیوبند اور تذکرہ دیوبند'' (مارچ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا (مقالہ کا عنوان تھا: ''قوم یہود اور پچاس نمازیں'' ماہنامہ 'تذکرہ' حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے بعد جاری ہوا مگر چند سال بعد بند ہوگیا۔

کتب، شخصیات اور مراتب علماء پرنظر

علامہ کشمیری کے ذوقِ مطالعہ نے انھیں کسی خاص موضوع کی کتابوں کے اندر محدود نہیں رکھا بلکہ دستیاب کتابوں میں سے تقریباً ہر موضوع کی کتب کا مطالعہ کیا؛ لیکن ان میں حدیث کے ساتھ تذکرہ علماء حدیث، تفسیر وفقہ کا نمایاں مقام ہے، اس کا مطالعہ کسی ایک خاص طبقے یا چند طبقوں تک محدود نہیں تھا؛ بلکہ ہر فن کے رجال پر حتیٰ کہ طب، فلسفہ اور تاریخ کے لوگوں پر تھا، چنانچہ علامہ کے درس میں اس پہلو پر بھی خاصی روشنی ڈالی جاتی تھی، خاص بات یہ ہے کہ علماءِ پیشیں کا صرف تذکرہ ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ بسا اوقات ان کے مراتب کی تعیین بھی ہوتی جو ایک نہایت مشکل کام ہے اور کبھی کبھی ان کے تفصیلی احوال بھی بیان ہوتے تھے، یہاں صرف چند مثالیں اس......کی بھی پیش کی جارہی ہیں :

۱- ''وفاء الوفاء باخبار المصطفیٰ'' (مدینہ طیبہ کے حالات پر بہت مستند کتاب) کے مصنف کا ذکر؛ اگرچہ مختصر انداز میں ہے (صرف ''للسمہودی'' کہا ہے) مگر ایک مفید بات کا اضافہ کیا، جو کم لوگوں کو معلوم ہے، کہ وہ حافظ ابن حجرؒ کے شاگرد تھے، (**وھو تلمید ابن حجر**)۔ (۲)

(۱) فیض الباری: ۲۳۷۔ (۲) فیض الباری: ۱۳۴۔

(ب) داؤد ظاہری کے بارے میں عام طور پر علماء کی رائے اچھی نہیں ہے؛ بلکہ اکثریت ان کی شخصیت سے بجز نام کے ناواقف سی ہے، مگر علامہ کشمیریؒ ان کے بارے میں وضو کے وقت بسم اللہ پڑھنے کی بحث کے دوران فرماتے ہیں :

ولعل البخاریؒ ایضاً اختار الوجوب کما اختاره رفیقه فی السفر داؤد الظاهری وکنت أری انه لیس رجلاً محققاً فلما طالعت کتبه علم انه عالم جلیل القدر رفیع الشان۔ (۱)

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ بخاریؒ کے ہم عصر تھے۔

(ج) مسئلہ ''تجسد ارواح وتروح اجساد'' کی بحث کے دوران صدر الدین شیرازی (مشہور فلسفی عالم) کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا :

لا هو صوفی شیعی ، لا لیست الصحابة رضی الله عنهم ولكنه يسيئ الأدب فی شان الأشعری والرازی۔ (۲)

بنظر اختصار، فیض الباری میں علامہ کشمیری کے افادات کا بیان اسی پر ختم کیا جاتا ہے، آگے بعض ان قابل توجہ پہلوؤں کی نشاندہی کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی گئی ہے، جو غالباً اس قیمتی مجموعہ کے مرتب وشائع ہونے سے قبل ہی علامہ کی وفات کا حادثہ پیش آجانے کی بنا پر اس میں رونما ہوئے۔

اس قیمتی نعمت پر مزید محنت کی ضرورت

جیسا کہ اوپر اشارةً ذکر آیا، اس بیش بہا علمی ذخیرہ 'فیض الباری' میں باوجودیکہ یہ نعمت عظمیٰ ہے اور اس کی ترتیب واشاعت اہل علم پر غیر معمولی احسان ہے، مگر کچھ باتیں قابل توجہ اور نظر ثانی کی محتاج نظر آتی ہیں اور یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں؛ کیوں کہ کوئی انسانی کام بھی اس سے خالی نہیں ہوسکتا (**الا من عصمه الله**) اس کا غالباً سبب یہ ہوا کہ

(۱) فیض الباری: ۲۴۳۔ (۲) فیض الباری: ۲۱۔

علامہ کی وفات اس کے مرتب وشائع ہونے سے قبل ہی ہوگئی، جس کا تأسف کے ساتھ اظہار فاضل مرتب نے بھی کیا ہے :

وكانت لی أمانی أن اكون جمعته فی حياة الشيخ رحمه الله ليطالعه ويصلح ما وقع من الخطأ والنسيان فيه۔ (۱)

پھر یہ بھی ذہن سے اوجھل نہ رہنا چاہئے کہ فاضل مرتبین اور اُردو سے عربی کے قالب میں ڈھالنے والے، اگرچہ بعد میں بہت نامور، عالمگیر شہرت کے حامل، صاحب

اتقان اور مرجع کے حیثیت رکھنے والے علماء بنے، مگر وہ ترتیب وتعزیب کے وقت (بے شک بے حد ذہین اور ذی استعداد ہونے کے باوجود جوان اور نوخیز تھے) ظاہر ہے کہ علم و تجربہ نیز عربیت کے اندر یقیناً وہ اس وقت اس درجہ پر فائز نہ تھے جو بعد میں انھیں حاصل ہوا (حالاں کہ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ بڑا علمی کارنامہ تھا، جس کی بنا پر بلا شبہ سارے علماء کی گردنیں ان کے بار احسان سے جھکی ہوئی ہیں کہ ان کی بدولت ایسی بیش بہا نعمت سے علماء کو مستبعد ہونے کا موقع مل گیا، اسی طرح اس کی اشاعت کرنے والے افراد اور ادارہ (مجلس علمی ڈابھیل) کے بھی سب علماء ممنون ہیں) مزید یہ کہ اس دور میں عربی لکھنے اور بولنے کا ایسا شوق اور رواج بھی نہ تھا جو بہت بعد میں ہوا ، بایں وجوہ کتاب میں فروگذاشتوں کا ہونا مستعبد ہی نہیں طبعی تھا؛ چنانچہ فاضل مقدمہ نگار (علامہ بنوریؒ) نے اپنی فیض الباری کے مقدمہ (صفحہ: ۳) میں اس کا اظہار کر دیا ہے، راقم اگر چہ خود اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ فروگذاشتوں کی نشاندہی کی جرأت کر کے ’’چھوٹا منھ بڑی بات‘‘ کا مصداق بنے (کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است) مگر پھر یہ خیال کر کے ہمت کر بیٹھا کہ پورے عالم اسلام کے اہل علم کا بالخصوص عرب علماء کا عام مزاج یہ ہے کہ معمولی فروگذاشتوں خصوصاً زبان وبیان کی خامیوں کی وجہ سے ـــــ کتاب، یا بات ـــــ ان کی نظر سے گر جاتی ہے اور استفادہ

(۱) مقدمہ فیض الباری: ۶۹۔

کے لئے حجاب بن جاتی، نتیجتاً محرومی کا سبب ہوجاتی ہے، جس سے قیمتی کتاب کی اشاعت اور اس سے مستفید ہونے والوں کی تعداد محدود رہ جاتی ہے، غالباً ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی بیش بہا قیمتی کتاب کے ایڈیشن تقریباً پون صدی میں بہت کم نکلے، جب کہ اس سے کم درجہ کی کتابوں کے بہت کم مدت میں کہیں زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں، اہل علم کے لئے ایہ ایک افسوسناک ہی نہیں قابل تشویش بات ہے، یا ہونی چاہئے، جس کی تلافی کا

جذبہ غالباً ہر اس صاحب علم کے دل میں ہوگا، جو اس کی فی الجملہ قدر و قیمت سے واقف ہے، مزید سوء اتفاق یہ ہوا کہ اس کتاب کے جو ایڈیشن بعد میں شائع بھی ہوئے وہ جوں کے توں (راقم کے علم کے مطابق) پہلے ایڈیشن کا عکس شائع ہوئے؛ البتہ حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ (جو اسے عربی جامہ پہنانے والے ہیں) نے اپنے ذاتی نسخہ میں اپنے قلم سے کچھ مفید حواشی، وترمیمات، کا اضافہ کیا تھا، مگر بدقسمتی سے اس نسخہ کے تمام حصے شائع نہیں ہو سکے، ان کے فرزند ارجمند مولانا آفتاب عالم صاحب مدنی مدظلہ، پہلے دو حصوں کے فوٹو بعینہ شائع کر کے (غالباً اہل علم کی طرف سے خاطر خواہ قدردانی نہ ہونے کی بنا پر ہمت ہار بیٹھے، کاش کتاب کی مکمل اشاعت ہو جاتی، بہر حال حضرت علامہ کشمیریؒ کے قدر دانوں ہی کے لئے نہیں تمام علم دوستوں کے لئے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے، یا ہونی چاہئے، کہ کتاب کی آئندہ اشاعت، اس پر اچھی طرح محنت کرنے کے بعد، جلد ہو جانی چاہئے، مزید تاخیر کی گنجائش نہیں، ان چند گذارشوں کے بعد ذیل میں نمونہ کے طور پر صرف چند ایسے پہلوؤں کی نشاندھی کی جرأت کی جارہی ہے، جو قابل توجہ ہیں؛ تاکہ پھر اللہ کا کوئی باہمت بندہ اس کو آتے بڑھا کر تکمیل تک پہنچا سکے، فروگذاشتوں کو حسب ذیل چند قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے :

تعبیرات میں فروگزاشتیں

زبان وادب ہی اظہار خیال اور دوسروں تک بات پہنچانے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں، اگر اظہار میں کسی طرح کی خامی ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ مخاطب بات کے سمجھنے میں دشواری محسوس کرے گا؛ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ غلط مطلب لے لے، اس لئے انبیاء علیہم السلام بالخصوص نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو مافی الضمیر کے اظہار و بیان پر ایسی قدرت دی گئی جس سے بڑھ کر ممکن نہیں، اس لحاظ سے جب ہم ’’فیض الباری‘‘ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں بہت سی جگہ ایسی تعبیرات پاتے ہیں جو متکلم کی مرادظاہر کرنے میں ناکافی،

بلکہ بعض جگہ بالکل غیر مفہوم ہیں (اس کے ایک سبب کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے) مثلاً (الف) ''حدیث ہرقل'' کی تشریح کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مختلف حکمرانوں کو نامہ ہائے مبارک ارسال فرمانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :

أرسل في تلك المدة ، الخطوط إلى الملوك ۔ (۱)

عربیت سے معمولی شد بد رکھنے والے کو بھی یہ تعبیر کھٹکے گی؛ کیوں کہ لفظ ''خطوط'' کا اس معنی میں عربی کے اندر استعمال نہیں ملتا جس معنی میں بالعموم اُردو والے کرتے ہیں، اگر چہ یہ لفظ عربی کا ہے، مگر اس کے عربی میں معنی ''لائن'' اور لکیر وغیرہ کے ہیں، اس لئے آج کل ہوائی راستوں کے لئے اس کا استعمال عام ہے، (ایئر لائنز "Air Lines" کو ''الخطوط الجویۃ'' کہا جاتا ہے، جہاں تک راقم کو معلوم ہے اُردو داں لفظ 'خط' کو جس معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس میں (یعنی انگریزی لفظ "Letter" کے معنی میں) کبھی بھی عرف میں یہ مستعمل نہیں تھا نہ آج ہے، اس لئے عرب سمجھ ہی نہیں سکیں گے کہ حضرت علامہ کیا فرمانا چاہتے ہیں (الا یہ کہ سیاق وسباق سے کچھ مطلب نکال لیں؛ مگر پھر صاحب عبارت کے بارے میں جاننے کا تاثر قائم ہوجائے تو بعید نہیں)۔

(ب) پہلی مرتبہ وحی کے نازل ہونے کی تفصیل جس حدیث (حدیث جبرئیل) میں بیان کی گئی ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں راوی کے الفاظ ''ترجف فوائدہ'' کی تشریح کے درمیان، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر ایسا اثر نہ ہونے کی وجہ

(۱) فیض الباری: ۷۳۔

بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''**لانها لم تكن صاحب الواقعة**'' (ص:۲۶، اسی سطر میں یہ آگے بھی آیا ہے) یہاں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اُردو میں ''واقعہ'' کا جو مفہوم بالعموم لیا جاتا ہے (اور یہاں لیا گیا ہے) ٹھیک وہ مفہوم اس لفظ کا عرب میں نہیں لیا جاتا ہے (اگر چہ عربی ہی لفظ ہے) عربوں کے لئے مجموعی طور پر اس تعبیر (صاحب الواقعہ) کا صحیح

مطلب سمجھنا مشکل ہوگا۔

(ج) امام رازیؒ کے بارے میں ایک مشہور عام مقولہ (یا، لطیفہ) کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے ''**انه يعترض نقداً ويجيب نسيئة**'' ظاہر ہے کہ ''اعتراض'' اور ''نقد'' عربی الفاظ ہونے کے باوجود، اس مفہوم میں اہل عرب انھیں استعمال نہیں کرتے جس میں ہندوستانی استعمال کرتے ہیں (اور یہاں ہوئے ہیں) اس لئے وہ غالباً سمجھ سکیں گے کہ علامہ کیا فرمارہے ہیں؟

(د) ''محاورات'' کا استعمال اُردو میں عام بول چال میں کسی لفظ کا خاص مفہوم لینے کے لئے ہوتا ہے؛ لیکن عربی میں اس کے معنی 'لفظی جدال' ومباحثہ کے ہیں، (قرآن مجید کے اندر اسی مفہوم میں آیا ہے ''**قد سمع الله قول التي تجادلك ...... والله يسمع تحاوركما الخ**'' اس سورہ کا نام ہی ''مجادلہ'' ہے) مفسر فیض الباری میں ایک سے زیادہ جگہ، محاورات اُردو والے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے مثلاً دیکھئے: ص: ۸۴۔

(ہ) ''مجبور'' کا لفظ اُردو میں ''اختیار'' کی ضد کے معنی میں عام طور سے مستعمل ہے؛ حالاں کہ عربی میں اس کے معنی مختلف ہیں (جو جبر وغیرہ تعبیرات سے واضح ہیں جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں) مگر ''فیض الباری'' میں (ص:۱۱۱ پر) اُردو والے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے، استسلام، کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے ''**فمعناه الإسلام صلحاً يعنى على طريق المصالحة مجبوراً**'' اسی طرح کی مثالیں کتاب میں بکثرت جابجا ملتی ہیں، یہاں سردست ان ہی کے پیش کرنے پر اکتفاء کیا جارہا ہے؛ کیوں کہ استیعاب نہ مقصود ہے نہ آسان، بس مثالیں ہی دینا پیش نظر ہے۔

۲۔ علمی فروگذاشتیں

(الف) مرجئہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے کتاب میں ذکر ہے :

ان الإقرار ليس بشطر ولا شرط للإيمان فالتصديق

وحده يكفي للنجاه عندهم ۔ (۱)

حالاں کہ حافظ ابن حجر نے کہا ہے :

المرجئة قالوا اعتقاد ونطق ۔ (۲)

حافظ کی عبارت کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ مرجۂ کے نزدیک ایمان کے اجزاء تصدیق قلبی واقرار لسانی ہیں، حافظ کے علاوہ دیگر مختلف ''فرق ومذاہب'' کے موضوع پر موجود کتابوں کے مصنفین نے بھی اقرار کو مرجۂ کے یہاں ایمان کا جزء قرار دیا ہے، مثلاً عصر حاضر کے مشہور محقق مصری عالم شیخ ابوزہرہ نے بھی مرجئہ کے وجود کا پس منظر، نیز اس کی مختلف شاخوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کا عقیدہ یہ نقل کیا ہے کہ: ''**إن الإيمان اقرار و تصديق**''۔(۳)

اب یہاں دو صورتیں ہی ممکن نظر آتی ہیں یا تو فیض الباری کے اندر مرجئہ کا مذہب نقل کرنے میں ـــ مرتب یا مترجم سے ـــ لغزش قلم ہوئی، یا پھر علامہ کی تحقیق ہی یہ ہے پہلی صورت اہون معلوم ہوتی ہے، اس لئے اور بھی کہ فاضل مرتب نے جا بجا اعتراف کیا کہ اس کا امکان ہے علامہ کی بات سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوگئی ہو'' ایسا اعتراف بڑی ہی قابل تعریف بات ہے، دوسری صورت میں (کہ اگر علامہ کی تحقیق واقعی یہی ہے تو) حاشیہ پر اس کی صراحت کردی جاتی تو اچھا تھا، اگر علامہ نے خود نہیں کی تھی'' ورنہ علامہ نے بسا اوقات، ایسی صورت میں صراحت کردی ہے، جیسا کہ قبلہ کی بحث میں (جس کا ذکر اس مضمون میں بھی آچکا ہے) مزید بہتر یہ ہوتا کہ اس تحقیق کا ماخذ بھی بتادیا جاتا۔

(۱) فیض الباری:۴۹۔ (۲) فتح الباری:۱/۴۶، طبع المکتبۃ السّلفیہ۔

(۳) تاریخ المذاہب الإسلامیۃ:۱/۱۳۵، طبع دار الفکر۔

(ب) بخاری کے ''باب کفران العشیر''میں امام بخاریؒ کے ارشاد ''کفر دون کفر'' کے بارے میں علامہ نے فرمایا کہ :

لانه قول عطاء بن رباح ونقل نحوه عند ابن كثير عن

ابن عباس رضی الله عنه فی قوله تعالى " ومن لم يحكم بـمـا أنـزل الله فـأولئک هم الكافرون " أى بكفر دون كفر ولعل الحافظ لم يدركه ولذا نسبه إلى عطاء ۔ (۱)

علامہ نے حافظ ابن حجر پر حضرت عبداللہ بن عباس کے اس قول سے بے خبر ہونے کی بات فرمائی ہے (جیسا کہ یہاں مرتب نے نقل کیا ہے) حالاں کہ اگلے ہی باب (باب ظلم دون ظلم) میں حافظ نے یہ مقولہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا نقل کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ:**وهو معنى قوله تعالىٰ " ومن لم يحكم بما انزل الله الخ**'' چنانچہ مولانا بدر عالم صاحبؒ (مترجم) نے اپنے ذاتی نسخہ میں اپنے قلم سے ''فیض الباری'' کی اس عبارت(**لعل الحافظ لم يدركه**......) پر حاشیہ لکھا ہے:''**بلى ذكره فى باب ظلم دون ظلم**'' کاش مولانا موصوف کتاب کی طباعت سے قبل اس پر مطلع ہوجاتے اور اصل کتاب میں ـــ طبع ہونے سے قبل ہی ـــ اس کی رعایت کر لیتے تو علامہ کشمیریؒ پر حافظ کے قول سے بے خبری کا شبہ کرنے والوں کو کچھ کہنے کا موقع ملتا، علاوہ ازیں اسی جگہ فتح الباری کی جو عبارت ہے اس سے یہ متعین نہیں ہوتا کہ حافظؒ کے نزدیک یہ حضرت عطا کا قول ہے؛ کیوں کہ حافظؒ نے جو کچھ کہا ہے اس سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہونے کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اثبات کی گنجائش ہونا بعید نہیں، حافظ کی عبارت یہ ہے :

أما قول المصنف وكفر دون كفر فأشار إلى اثر رواه أحـمـد فـى كـتـاب الإيـمـان من طريق عطاء بن رباح وغيره ۔ (۲)

(۱) فیض الباری:۱۱۴۔ (۲) فتح الباری:۱/۸۳۔

اس سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عطا وغیرہ کے واسطہ سے (طریق سے)

ایک اثر امام احمد نے کتاب الایمان میں کیا ہے؛ لیکن وہ اثر کس کا ہے؟ اس سے یہاں بظاہر سکوت ہے، نہ کہ وہ اثر حضرت عطا کا ہے، عموماً اثر کا اطلاق صحابی ہی کے قول کے لئے ہے، تابعی کے قول وغیرہ کے لئے نہیں (یا بہت کم) ایک حدیث کے الفاظ ”**ینبت به الکلأ والعشب** “ کی تشریح میں ”فیض الباری“ کے اندر یہ ملتا ہے: ”**العشب عام للرطب والکلأ**“ (ص:۱۸۹) حالاں کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کے برعکس مفہوم بتایا ہے :

هو من ذكر الخاص بعد العام لأن الكلأ يطلق على الرطب واليابس معاً والعشب للرطب فقط ۔ (۱)

یہاں بھی وہی عرض کرنا مناسب ہوگا جو اس سے قبل ”الف“ کے تحت عرض کیا گیا ہے۔

محنت کے بعض اور پہلو

اوپر جو گذارشیں کی گئیں ان کا مقصد — جیسا کہ قارئین پر واضح ہو چکا ہوگا — علامہ پر اعتراض کرنا یا کتاب کی اہمیت گھٹانا نہیں ہے؛ بلکہ عرض ومعروض کا حاصل یہ ہے کہ اس ......قیمتی علمی خزانہ کی حفاظت اور اس کی افادیت بڑھانے کے لئے علامہ کشمیریؒ کے مستفیدین اور ان کی، نیز ان کے افادات کی قدر کرنے والوں کو — محنت کرنے کی ضرورت ہے، جن گوشوں پر محنت کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، ان کی نہایت اختصار کے ساتھ نشاندہی کی ایک معمولی سی کوشش ان سطروں میں کی گئی ہے، مذکورہ بالا پہلوؤں کے علاوہ کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر محنت کرنا...... ازبس ضروری ہے، مثلاً علامہ تو علم کا بحر بیکراں تھے، بحر کی طرح روانی میں بہت سے قیمتی موتی اچھل کر باہر آجاتے تھے، مگر انھیں چمکانے اور آبدار بنانے کی ضرورت ہے، یعنی ان کے حوالہ اور مراجع ڈھونڈھ کر نکالے جائیں اور انھیں پیش کیا جائے، علامہ کے زمانہ میں بہت سی کتابیں قلمی شکل میں تھیں، مگر اب ان

(۱) فتح الباری: ۱/۱۷۶۔

میں سے بہت سی طبع ہو گئیں ہیں، اس لئے اب ان کی دستیابی اور ان سے استفادہ کرنا نسبتاً

آسان ہو گیا ہے، اسی کتاب میں بعض باتیں مجمل بیان ہوئی ہیں، ان کی تفصیل کی ضرورت ہے، تاکہ استفادہ تام اور عام ہو، مثلاً ”فیض الباری“ کے عنوان پر ”**الایمان وتفسیره عند الشرع**“ کے تحت یہ عبارت آئی ہے: ”**ثم العجب علی صدر الشریعة حیث اعترض علی شیخ التسلیم**“ (ص:۴۷) عام قاری حیران ہوگا کہ ”شیخ التسلیم“ سے کیا مراد ہے؟ (خوش قسمتی سے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تقریر درس بخاری ”فضل الباری“ میں اس کی تشریح کردی گئی ہے: ”**المراد به ! الشیخ نظام الدین الملقب بشیخ التسلیم لأنه أدخل فی الایمان التسلیم**“ یہ اس کے بغیر مراد تک پہنچا ہی نہیں جاسکتا، حاصل یہ کہ اگرچہ کتاب میں بہت سی جگہ تعلیقات وحواشی ہیں اور ان میں بعض بہت قیمتی ہیں، مگر ضرورت ہے کہ مزید حواشی وتعلیقات کا اضافہ کیا جائے۔

☆ ☆ ☆

تکملۂ تفسیر فتح العزیز (مخطوطہ)

ایک تعارف

سرزمین ہند میں یوں تو بے شمار علماء وفقہاء نیز اصحاب درس وافتاء اور ارباب سیف وقلم پیدا ہوئے، مگر ہندوستان کی پوری علمی تاریخ میں شاہ ولی اللہؒ (م: ۱۱۷۶ھ) ان کی اولاد واحفاد کو جو امتیاز حاصل ہوا اور ان کے ذریعہ جتنا اور جیسا فیض پہنچا وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آسکا؛ لیکن ان میں موصوف کے فرزند اکبر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز (م: ۱۲۳۹ھ) قدس سرہ العزیز کی بلاشبہ ستاروں میں آفتاب کی سی حیثیت ہے، نہ صرف اس لئے کہ اسی چراغ سے خانوادۂ ولی اللّٰہی کے تمام چراغ روشن ہوئے؛ بلکہ اسی سراج منیر سے پورے ہندوستان میں علم کا (بالخصوص علم حدیث کا) چراغاں ہوا، شاید اسی بنا پر انھیں ''سراج الہند'' کا لقب دیا گیا، شاہ صاحب موصوف کو تمام علوم متداولہ میں مہارت تامہ فقہ وتفسیر میں تو انھیں وہ امتیاز حاصل تھا کہ قدیم علماء میں بھی ان کے ہم پلہ چند ہی گذرے ہوں گے، معاصرین یا بعد کے علماء میں تو ان کی نظیر ملنا ہی مشکل ہے۔

تفسیر فتح العزیز

لیکن تقدیری بات کہ ان دونوں موضوع پر بھی شاہ صاحبؒ کا تحریری ذخیرہ بہت کم ملتا ہے، تفسیر کی صرف تین جلدیں (جن میں سورۂ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل پہلی جلد ناتمام اور دوسری وتیسری جلد سورۃ الملک سے لے کر تا آخر قرآن مجید) ملتی ہیں، اس تفسیر کے بارے میں ہندوستان کے ممتاز عالم اور علماء کے تذکروں کا خصوصی ذوق اور ان پر وسیع نظر رکھنے والے محقق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

تفسیر قرآن مسمّٰی بہ ''فتح العزیز'' جسے آپ نے (شاہ عبدالعزیزؒ

نے) شدتِ مرض اور ضعف کی حالت میں املا کرایا تھا، یہ کئی جلدوں میں تھی، جس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا اور صرف شروع اور اخیر کی دو جلدیں بچ گئیں۔(۱)

اسی کے بارے میں ایک دوسری جگہ موصوف یہ لکھتے ہیں:

حضرت شاہ صاحبؒ کا دوسرا علمی واصلاحی کارنامہ تفسیر فتح العزیز کی شکل میں ہے، جسے ''تفسیر عزیزی'' اور ''بستان التفاسیر'' کا نام بھی دیا گیا ہے، یہ شاہ صاحبؒ کی باقاعدہ املا کی ہوئی مستقل تصنیف ہے، خود شاہ صاحبؒ کی تصریح کے مطابق وہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ پھر سورۃ الملک سے آخر قرآن تک ہے؛ لیکن سورۂ بقرہ مکمل نہیں ہوسکی، جس کے اسباب معلوم نہیں ہوسکے، صرف ربع پارۂ دوم کے قریب تک آیت ''وان تصوموا خیر لکم'' تک طبع ہوسکی — کتاب تین جلدوں میں ہے، پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے لے کر پارۂ دوم کے ربع کے قریب تک، دوسری جلد سورۃ الملک (۲۹ویں پارے) سے لے کر ''سورۃ المرسلات'' تک ہے، تیسری جلد سورۂ عم یتساء لون (سورہ نباء) سے شروع ہوکر آخر قرآن تک ہے۔(۲)

شاہ صاحبؒ کی تفسیر کا اصلی رنگ تو منقول تفسیروں والا ہے؛ لیکن جگہ جگہ ان کی مجتہدانہ اور محققانہ خصوصیات بھی نمایاں نظر آتی ہیں جن کی وجہ سے اسے ایک ایسا امتیاز حاصل ہوگیا جو معاصر — بلکہ قبل وبعد کی بھی بہت سی — تفسیروں کو نہیں حاصل ہوسکا، اس

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۵۳، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ (پہلا ایڈیشن)

(۲) تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۵۷، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ (پہلا ایڈیشن)

بیان میں غالباً مبالغہ نہیں سمجھا جائے گا کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہوگئی ہوتی، یا مکمل محفوظ رہ جاتی تو دوسری تفسیروں سے بڑی حد تک بے نیاز کردیتی، اس کے نامکمل رہ جانے یا بڑے حصہ کے ضائع ہوجانے کی وجہ سے جو خلا محسوس ہوتا ہے، بعید نہیں کہ اسے پر کرنے کی متعدد کوششیں کی گئی ہوں گی، مگر ہمارے سامنے بس ایک کوشش وہ بھی ناتمام آسکی ہے، جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ہی کے ایک شاگرد نے مولانا حیدر علی فیض آبادی (م:۱۲۹۹ھ) نے کی۔

صاحبِ تکملۂ فتح العزیز کا مختصر تعارف

مولانا حیدر علی موصوف کا تذکرہ، ہندوستان کے رجال علم وفکر کی مشہور تاریخ ''نزہۃ الخواطر'' میں اس طرح ملتا ہے :

عبد القادر الدهلوي ثم الفيض آبادي ، قرأ العلم ...... من علماء الشيعة بفيض آباد ، ثم سافر دهلي وأخذ عن ...... الشيخ رفيع الدين واستفاض عن الشيخ عبد العزيز ولازمه زمانا حتى برع في كثير من العلوم ثم قدم لكهنو ...... ثم سافر إلى بهوپال ...... ثم إلى حيدرآباد فولاه نواب مختار الملك العدل والقضاء ...... مع اشتغاله بالتصنيف والتاليف ...... ومات ۱۲۹۹ھ ۔ (۱)

حیدر علی محمد حسن بن محمد ذاکر بن عبدالقادر دہلوی پھر فیض آبادی نے پہلے فیض آباد کے شیعہ علماء سے پڑھا اس کے بعد دہلی جاکر شیخ رفیع الدین سے اور شیخ عبدالعزیز کے پاس لمبے عرصہ تک ٹھہر کر بڑا فیض اُٹھایا، یہاں تک کہ وہ بہت سے علوم میں ماہر بن گئے، پھر لکھنؤ آئے اس کے بعد بھوپال، پھر حیدرآباد چلے گئے

(۱) نزہۃ الخواطر للعلامۃ الحکیم عبدالحی: ۷/ ۱۵۵-۱۵۴ (مطبوعہ: دائرۃ المعارف حیدرآباد)۔

وہاں نواب نے قاضی بنادیا اس کے ساتھ وہ تصنیف وتالیف میں بھی لگے رہے۔

تکملہ کا محرک

تفسیر فتح العزیز کے تکملہ کی خدمت والیہ بھوپال نواب سکندر بیگم کے ایماء پر انجام دی، جیسا کہ اسی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' میں ہے ''**وله تكملة ، فتح العزيز في مجلدات كبار صنفها بأمر نواب سكندر بيكم ملكة بهوپال**''۔(۱)

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی —— صاحب ''مقالات طریقت'' کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ ''مولوی حیدر علی صاحب ''منتہی الکلام'' نے حسبِ خواہش سکندر بیگم والیٔ بھوپال تفسیر ''فتح العزیز'' کا تکملہ ستائیس جلدوں میں کیا، راقم نے دیکھا ہے۔(۲)

تکملۂ فتح العزیز کا باقی ماندہ حصہ

لیکن اسے بھی قسمت کی ستم ظریفی کہا جائے یا کچھ اور؟ کہ —— تکملۂ فتح العزیز کا بھی —— اصل فتح العزیز کی طرح، اکثر حصہ زمانہ کی دستبرد سے غالباً محفوظ نہ رہ سکا، بس اس کی ستائیس جلدوں میں سے چار جلدیں ہی ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں (مخطوطات کے شعبہ میں) محفوظ ہیں، ان ہی کا تعارف ذیل کی سطروں میں کرانا مقصود ہے :

تکملۂ فتح العزیز کا تعارف

پہلی جلد: سورہ بقرہ کی آیت ''**وأن تصوموا خير لكم**'' سے شروع ہوکر دوسرے پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

دوسری جلد: تیسرے پارے کے شروع سے لے کر تیسرے ہی پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

(۱) نزہۃ الخواطر للعلامۃ الحکیم عبدالحی: ۷/ ۱۵۵ (مطبوعہ: دائرۃ المعارف حیدرآباد)۔

(۲) مقالات طریقت، بحوالہ: تاریخ دعوت وعزیمت: ۵/ ۳۵۷، یہ عبارت صاحب مقالات کی ہی ہے (مولانا علی میاں صاحب کی نہیں ہے) اور صاحب مقالات ہی کا دیکھنا یہاں مراد ہے۔

تیسری جلد: چوتھے پارے کے شروع سے لے کر چوتھے ہی پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

چوتھی جلد: پانچویں پارہ کے شروع سے لے کر پانچویں ہی پارے کے ختم تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

اس تفصیل سے یہ دلچسپ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے ہر جلد ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں مکرر ہے، یعنی ہر ایک کے دو دو قلمی نسخے ہیں، ایک ہی نسخے کی چاروں جلدوں کے مجموعی اوراق کی تعداد ۱۵۵۰ یعنی ۳۱۰۰ صفحات (تین ہزار ایک سو صفحات) ہوتی ہے اور صفحات کا سائز بھی اتنا بڑا ہے کہ آج کوئی بھی کتاب (بجز حدیث وفقہ کی نصابی کتابوں کے) اتنے بڑے سائز پر غالباً نہیں ہے۔

پہلی جلد: جس کے کتب خانہ کے رجسٹر کے مطابق (خاص) نمبرات: ۱۴، ۳۸ ہیں، کے بارے میں کچھ تفصیلات :

کتب خانہ کا نمبر: ۳۸ آغاز :

کہ گفت بسفر دریا بارادۂ جہاد در کشتی سوار بودیم کہ ناگاہ منادی آواز میزند کہ اہل کشتی درنگ کنید کہ بامری خبر دہیم۔

کتب خانہ کا نمبر ۳۸ پہلی جلد کا اختتام :

انبیاء و رسل کہ باوج کمال رسیدہ و بغایت شرف و بزرگی فائز کردیدہ اند آنہا نیز مدارج خویش اختلاف دارند۔

کل اوراق: ۳۳۴، سائز: ۳۰×۱۹ (حوض کا سائز: ۲۴×۶ء۱۲)

نوٹ: ہر جگہ سائز کی پیمائش سنٹی میٹر (C.M) میں دی گئی ہے۔

ہر صفحہ میں ۱۹/سطریں، کتابت بخط فارسی سیاہ روشنائی سے، ہر صفحہ پر تین لائن کا باڈر جس میں دو لائن سرخ روشنائی سے اور ایک سیاہ سے۔

کتب خانہ کے نمبر: ۱۴، پہلی جلد کا آغام نمبر: ۳۸ ہی کی طرح۔

اختتام: تلک الرسل فضلنا بعضہم علی بعض (بخط نسخ، سرخ روشنائی سے) آں پیغمبراں کہ حال شاں سمت ذکر یافت بزرگی دادیم وفضیلت نہادیم جمعی از ایشاں رابفضائل وکمالات علی بعض (بخط نسخ، سرخ روشنائی) ہر جمعی دیگر منہم من (آیات بخط نسخ، سرخ روشنائی سے، تفسیر بخط فارسی سیاہ روشنائی سے)۔

کل اوراق: ۴۱۲، سائز: ۲۹×۱۷ (حوض کا سائز: ۷ء۲۳×۱۲)، ہر صفحہ میں ۱۹/سطریں اور تین لائنوں کا باڈر جن میں دو سرخ اور ایک سیاہ۔

دیگر خصوصیات: تفسیر کا خط فارسی، عمدہ، کاغذ بادامی، دبیز اچھی حالت میں، پیشانی پر مہر، محمد جمال الدین (خان مدار المہام) حاشیہ پر لکھا ہے ”تکملہ تفسیر فتح العزیز پارہ سیقول از مولوی حیدر علی“ (نیلی روشنائی سے)۔

کچھ اور قابل ذکر باتیں :

۱- اصل تفسیر فتح العزیز کی پہلی جلد کا اختتام ناقص جملہ پر ہوا ہے، آیت ”أن تصوموا خیر لکم“ کی تفسیر میں فضائل روزہ کی روایات کے ضمن میں حضرت یحییٰ سے متعلق ایک حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) بیان کرتے ہوئے یہ روایت اصل تفسیر میں ذکر کی گئی ہے :

حضرت عیسیٰ علیہ السلام را وحی شد کہ بحضرت یحییٰ بگو پند کہ حق تعالیٰ شمارا۔

بس یہیں فتح العزیز کی پہلی جلد (مطبوعہ) ختم ہوجاتی ہے، تکملہ میں یہ واقعہ دوسرے نمبر کی روایت سے ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے، تکملہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اس میں ایک اور حدیث نبوی کے حوالہ سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، جو اصل تفسیر میں بھی فتح العزیز میں مذکور بالا ناقص واقعہ سے پہلے، مذکور ہے:

لیکن اس تکرار کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی،(۱) مزید برآں یہ کہ تکملہ میں سب سے پہلے جو واقعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت مذکور ہے، وہ شروع سے ناقص معلوم ہوتا ہے، اس کا کچھ ابتدائی حصہ یقیناً رہ گیا ہے،(یہ دونوں واقعات سیوطیؒ کی مشہور تفسیر درمنثور سے لئے گئے معلوم ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اس میں بھی یہ دونوں اسی آیت کے تحت مذکور ہیں)۔

۲- نمبر:۱۴ کی پیشانی پر مہر ہے، نمبر:۳۸ پر نہیں ہے۔

۳- نمبر:۱۴ کا اختتام ''**تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض ...... الخ**'' ہوتا ہے؛ لیکن نمبر:۳۸ تکملہ کی دوسری جلد (کتب خانہ کا خاص نمبر:۱۵،۴۸) کے بارے میں بعض معلومات نمبر:۱۵،۴۸ دوسری جلد کا آغاز :

تلک الرسل فضلنا بعضهم (بخط نسخ، سرخ روشنائی سے)

آں پیغمبراں کہ حالی شاں سمت ذکر یافت بزرگی دادیم (بخط فارسی، سیاہ روشنائی سے)۔

دوسری جلد کا اختتام :

والحمد لله علی ذلک حمدا کثیراً (بخط فارسی، سیاہ روشنائی) نمبر:۱۵ کے کل اوراق:۳۴۷، نمبر ۴۸ کے کل اوراق:۴۲۱، ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں، نمبر:۱۵ کا سائز:۲۹×۱۷ (حوض کا سائز:۲۴×۱۲) پہلے صفحہ کے بائیں طرف لکھا ہے :

تکملہ تفسیر فتح العزیز پارہ تلک الرسل از مولوی حیدر علی صاحب

نمبر:۴۸ کا سائز:۲۸×۵ء۱۷ (حوض کا سائز:۲۴×۱۲) نمبر:۴۸ کے شروع میں دو مہریں تھوڑے فصل سے (خان مدار المہام) مہر کا اوپر کا حصہ کٹ گیا۔

بعض اور قابل ذکر باتیں :

نمبر:۱۵ جگہ جگہ سے کرم خوردہ، آیات سرخ روشنائی سے اور حدیث کی اکثر کتابوں

کے

(۱) تکرار کی ایک وجہ یہ ممکن معلوم ہوتی ہے کہ صاحب تکملہ کو تفسیر فتح العزیز کا وہ نسخہ ملا ہو جس میں وہ پہلا واقعہ ناتمام مذکور ہو اس کے بعد پھر دوسری جلد کا مسودہ شروع ہو جاتا ہو۔

نام بطور حوالہ بھی سرخ روشنائی سے دونوں نسخے (نمبر:۱۵،۴۸) تقریباً یکساں ہیں؛ البتہ ۴۸ کا خط کچھ اور بہتر ہے، اگرچہ دونوں کے خط فارسی اچھے ہیں، دونوں میں سرخ روشنائی بھی جگہ جگہ (آیات وعنوانات اور حوالوں کے لئے) استعمال ہوئی ہے؛ لیکن نمبر:۱۵ میں سرخ روشنائی کا استعمال کچھ زیادہ ہے (نمبر:۴۸ کے مقابلہ میں) تکملہ کی تیسری جلد (کتب خانہ کا خاص نمبر:۱۶،۱۷) نمبر:۱۶،۱۷ تیسری جلد کا آغاز :

لن تنالو البر (بخط نسخ، سرخ روشنائی سے) ہرگز نیابید نکوئی یا نرسید بہشت را۔ (فارسی خط سیاہ روشنائی سے)

تیسری جلد نمبر:۱۶ کا اختتام :

ان الله کان غفورا رحیما والله اعلم (بخط فارسی، شروع صفحہ پر مہر: محمد جمال الدین (خاں مدار المہام)۔

تیسری جلد:۱۷ کا اختتام :

ان الله کان غفورا رحیم والله اعلم وعلمه احکم تمت تمت (بخط فارسی)۔

۱۶ کے کل اوراق:۳۲۰ (دبیز کاغذ) سائز:۳۰×۱۷ (حوض کا سائز:۲۴×۱۲)

۱۷ کے کل اوراق:۳۷۹ (باریک کاغذ) ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں۔

دیگر خصوصیات :

۱۶ جگہ جگہ سے کاغذ پھٹ گیا ہے اور بٹر پیپر لگا کر جوڑا گیا ہے، کرم خردہ بھی ہے، بعض جگہ سے حروف بھی کٹ گئے ہیں۔

۱۷ کہیں کہیں اور نصف کے بعد جگہ جگہ، کناروں پر کیڑا کھا لینے کے نشانات ہیں،

مگر اصل مکتوب حصہ محفوظ ہے، ۱۷ کے شروع میں مہر نہیں ہے، دونوں ۱۶، ۱۷ کے خط ایک جیسے ہیں۔

۱۶ ورق ۲۳۲ کے بعد پورے پچاس ورق نہیں ہیں، حالاں کہ اوراق پر نمبر مسلسل پڑے ہوئے ہیں، اس لئے سرسری نظر سے دیکھنے پر مکمل معلوم ہوتی ہے، یہ نسخہ بوسیدہ بھی زیادہ ہے (بنسبت ۱۷ کے) تکملہ کی چوتھی جلد (کتب خانہ کا خاص ۱۸، ۱۹)۔

چوتھی جلد ۱۸، ۱۹ کا آغاز :

والمحصنات من النساء الا مالکت ایمانکم (بخط نسخ، صرف ۱۹ میں سرخ روشنائی سے اور ۱۸ میں سیاہ سے) وحرام کردہ شد برشما شہور داران از زمان تر اب مختلف نشود ونسب ضائع نکردد (بخط فاسی سیاہ روشنائی سے)۔

چوتھی جلد ۱۸، ۱۹ کا اختتام :

اوسبحانہ وحق تعالیٰ شکایت غیر خود را ہم نہی پسند دچہ جائی شکایت ذات خود راز یرا کہ

چوتھی جلد ۱۸ کی کل تعداد اوراق: ۳۲۲ ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں، سائز: ۱۷×۳۰ (حوض کا سائز: ۱۲×۲۴) پہلے صفحہ کے حاشیہ پر (نیلی روشنائی سے) لکھا ہے: ''تکملہ تفسیر فتح العزیز'' آخری صفحہ پر (سیاہ روشنائی سے) لکھا ہے: ''**تم الجزء الخامس**''۔

اُمور دیگر قابل ذکر :

کاغذ اچھا چکنا، اوسط درجہ کی دبازت، درمیان میں متفرق جگہ پر مختلف قسموں کا کاغذ استعمال ہوا ہے، آیات قرآنی بخط نسخ (سیاہ روشنائی سے) تفسیر بخط فارسی (سیاہ روشنائی سے) خط عمدہ جلی، کہیں کہیں کرم خوردہ وشکستہ، بٹر پیپر سے جوڑا گیا، ہر صفحہ پر باڈر، سرخ لائن ڈبل اور ایک سیاہ لائن (کل تین لائین) سے بنا گیا گیا ہے، ۱۹ (چوتھی جلد) سائز: ۱۸×۳۱ (حوض کا سائز: ۱۲×۲۴) ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں کل اوراق: ۲۸۸ پہلے صفحہ کی پیشانی پر مہر: محمد جمال الدین (خاں مدار المہام) پنسل سے اسی صفحہ کے بالائی کنارہ پر

لکھا ہے: ''تکملہ فتح العزیز'' سیاہ روشنائی سے حاشیہ پر لکھا ہے ''تفسیر وعلوم قرآن''۔

دیگر اُمور قابل ذکر :

قرآنی آیات کی کتابت بخط نسخ عمدہ جلی (سرخ روشنائی سے) تفسیر بخط فارسی (سیاہ روشنائی سے) خط اوسط درجہ کا ''عمدگی میں، درمیان بعض عنوانات بھی سرخ روشنائی سے ہیں، کہیں کہیں سے کرم خوردہ، پہلا صفحہ پانچ جگہ سے کرم خوردہ اور اس کا اثر تین جگہ کا، کئی ورق تک پڑا پوری جلد میں کاغذ یکساں، اچھا، چکنا، اوسط درجہ کی دبازت، ہر صفحہ پر باڈر ڈبل سرخ لائن اور ایک سیاہ لائن کا، چوتھی جلد کا اختتام ناقص ہوا ہے کہ جملہ بھی پورا نہیں ہوسکا، تمام جلدوں میں اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ہی طرز خط کی پیروی کی گئی ہے، چنانچہ تقریباً ہر جگہ ''گ'' کو ''ک'' کی شکل میں (ایک ہی 'مرکز' سے) اور اکثر جگہ یائے معروف (ی) ہی کی صورت میں یائے مجہول (ے) بھی لکھی گئی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ تکملہ کی ان جلدوں میں سے کسی ایک پر بھی نہ تو کاتب (ناسخ) کا نام ملتا ہے نہ سن تاریخ کتابت کا ذکر۔

تکملہ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر

یہ تکملہ، اصل تفسیر (فتح العزیز) سے منقولی رنگ — احادیث وروایات نیز قصص وحکایات کی کثرت — میں تو بالکل مشابہ ہے، بلکہ بعید نہیں کہ بعض جگہ کثرت روایات وآثار، نیز قصص وحکایات میں اصل سے کچھ بڑھ گیا ہو؛ لیکن شاہ عبدالعزیزؒ کی مجتہدانہ نظر، ژرف نگاہی اور عبقریت کی جو شان اصل تفسیر (فتح العزیز) میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہے اس کی، تکملہ، میں توقع رکھنا ہی بے محل ہے اور اس کی تلاش سعی لاحاصل، پھر بھی بڑی حد تک اصل کی کچھ خصوصیات برقرار رکھنے کی صاحب تکملہ نے کوشش کی ہے، خاص طور سے فرقِ باطلہ کی تردید، ملحدین اور متفلسفین کے قرآن مجید پر اعتراضات کی جوابدہی، قرآن مجید کی آیتوں پر بظاہر وارد ہونے والے لغوی، نحوی نیز دوسرے قسم کے اشکالات کا حل، آیت کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال کی موجودگی کی صورت میں کسی قول کو بدلائل

ترجیح اور مختلف المعانی لفظ میں سے ایک یا چند معنی اختیار کرنے کے وجوہ واسباب، جیسے اُمور سے خاطر خواہ بحث کی گئی ہے، اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تکملہ خاص حد تک اصل کا رنگ لئے ہونے کے ساتھ تفسیر کے طالب علم کے لئے پراز معلومات اور یکجا بہت سی نقول فراہم کرنے کا ایک کامیاب ذریعہ وماخذ بن گیا ہے؛ لیکن متقدمین کی اکثر تصانیف اور خود اصل تفسیر فتح العزیز کی طرح یہ بھی اجمالی حوالوں کا ہی مواد فراہم کرتا ہے، جس سے بس کتاب کے نام کی حد تک ماخذ کی نشاندہی ہوتی ہے، موضع اور محل کا تعین نہیں ہوتا، اس لئے مکمل حوالہ کی تلاش اور صحیح موقع کے تعیین کے طالب کو خاصی محنت کرنا ناگزیر ہے۔

اصل کی طرح، تکملہ کی بھی زبان (فارسی) بڑی سہل اور سلیس وشیریں ہے کہ معمولی فارسی خواں بھی استفادہ اور اخذ مطلب — بیشتر حصہ میں — کرسکتا ہے اور جیسا کہ اوپر اشارہ ذکر آیا، خط بھی بہت صاف اور جلی ہے (کہ کچھ کمزور بینائی والا شخص بھی اسے پڑھ سکتا ہے) اتنی ضخیم تفسیر کا لکھنا قطع نظر اس کی دیگر خصوصیات کے بجائے خود ایک عظیم کارنامہ ہے؛ لیکن اب تک نہ چھپ سکنے کے باعث اس کی احادیث محدود ہی نہیں گویا معدوم ہوگئی ہے، حتی کہ اس کے وجود سے واقفیت بھی بہت محدود حلقہ میں ہے، رہی سہی کسر اس کی بقیہ جلدوں کے دستیاب نہ ہونے سے پوری ہوگئی۔

تکملہ کے کچھ نمونے

تکملہ سے یہاں مختصر طور پر چند نمونے پیش کئے جارہے ہیں؛ تاکہ قارئین خود تھوڑا بہت اس کی قدر وقیمت اور بعض خصوصیات کا اندازہ کرسکیں۔

۱- تکملہ پہلی جلد کتب کا ۱۴ سورہ بقرہ آیت ’’**وأن تصوموا خير الكم**‘‘ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> تقدیر آیت کہ متضمن برشرط است موافق فہم اکثر مفسرین اینست کہ اگر دایند فضیلت صوم را اختیار کنید وتخلف نورزید

> چوں ماقبلش دلالت بریں جزا دارد، لفظ ’’اختر تموہ‘‘ را ساقط فرمودہ اند، بعض گفتہ اند کہ مراد از علم، خوف است چنانچہ فرمودہ اند: ’’**انما يخشى الله من عباده العلماء**‘‘۔

آیت کا ترجمہ کرکے لکھتے ہیں :

> گویا چنیں فرمودند کہ اگر شما خوف خدا کنید مشقت وتکلیف روزہ خود برداشتن بہتر خواہد بود براے شما وحاجت بفدیہ نخواہد نمود۔ (ورق: ۳، ب)

۲- تکملہ دوسری جلد، کتب خانہ کا ۱۵ سورہ آل عمران آیت: ’’**يوتى الحكمة من يشاء** ...... الخ‘‘ کے تحت مذکور ہے :

> مراد لفظ حکمت علم است یا فعل صواب ومروی است از مقاتل لفظ حکمت کہ در قرآن مجید واقع شد بچار معنی تفسیر کردہ اند یکے مواعظ ونصیحتہائے قرآنی۔

پھر اس کے آگے شواہد بھی ذکر کئے ہیں۔(۱)

’’دوم آنکہ حکمت بمعنی فہم وعلم است‘‘ (پھر شواہد کا ذکر ہے)...... ’’معنی سوم آنکہ مراد ازاں نبوت وپیغمبری است‘‘ (یہاں بھی آگے شواہد لکھے ہیں)...... ’’چہارم قرآن مجید است کہ بحکمت ازاں تعبیر میرود بسبب آنکہ عجائب اسرار دراں ودیعت نہادہ اندی‘‘۔ (ورق: ۹۰، الف)

۳- تکملہ چوتھی جلد کتب خانہ کا ۱۹ سورۃ النساء کی آیت ’’**ولولا فضل الله عليك ورحمة لهمت طائفة منهم أن يضلوك**‘‘ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں :

> درینجا اعتراض وارد می شود کہ ظاہر ایں آیت نفی می کند موجود شدن قصد منافقین را باز لال آنجناب ...... جوابش آنکہ ضرور

نیست کہ 'لہمت' جواب 'لو' باشد بلکہ ایں کلام تواند بود کہ مقدم باشد بر 'لو' وجواب آں درتقدیر ومقول باشد برطریق قسم ،

(۱) پہلے معنی کے لئے: ''ماانزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم به'' دوسرے کے لئے: ''ولقد آتینا لقمان الحکمة الخ'' تیسرے کے لئے: ''فقد آتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمة'' اور چوتھے کے لئے: ''ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة'' شواہد پیش کئے ہیں۔

وجواب 'لو' محذوف بود...... وتقدیرش آں کہ ''لقد همت طائفة منهم ان یضلوک ولولا فضل الله ورحمة لأضلوک۔ (ورق:۲۴۲،الف)

بس اسی پر اپنی گفتگو ختم کرنے کی اجازت چاہتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔

☆ ☆ ☆

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور فن تفسیر

صادق ومصدوق علیہ افضل التحیات والصلوات نے فرمایا ہے: ''مثل أمتي مثل المطر لا یدری أو له خیر أم آخره'' (۱) واقعہ یہ ہے کہ اُمت مرحومہ کی پوری تاریخ اس فرمان کی صداقت پر گواہی دیتی نظر آتی ہے، تاریخ رجال پر جس کی ادنیٰ سی بھی نظر ہے وہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرے گا کہ تقریباً ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ علی صاحبہا التحیہ کے اندر ایسے افراد پیدا کئے ہیں جن سے اس درجہ نفع پہنچا کہ اصحابِ دعوت وعزیمت کے تذکروں پر جو لوگ نگاہ رکھتے ہیں ان کے لئے بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ ہمارے عصر یا قریبی زمانہ کی فلاں شخصیت سے اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب نے اُمت کی خیر خواہی اور اصلاح کا، خواہ وہ عقائد سے متعلق ہو یا معاشرت سے، عبادات کے شعبہ میں ہو یا معاملات کے، تہذیب وثقافت کے لحاظ سے ہو یا تعلیم وتربیت کے، جو کام جس پیمانہ پر لیا ہے اور جس درجہ اس کے گہرے اثرات ہوئے ہیں، وہ کیا اس سے پہلے خیر القرون کے بعد کسی اور شخص اور جماعت سے لیا تھا یا نہیں؟ ایسی ہی ایک عظیم شخصیت

جس کے مختلف النوع کارناموں اور ہمہ گیر اثرات کی بنا پر اسے اپنے بہت سے معتقدین پر

(۱) سنن ترمذي ، أبواب الأدب:۲۸۶۹،بحوالہ مشکوۃ:۲/ ۵۸۲،باب ثواب هذه الأمة، وفي المرقاة لملا علي القاري في شرح هذا الحديث ، قال الترمذي : هذا حديث حسن غريب ، ورواه أحمد عن عمار بن ياسر وابن حبان في صحيحه عن سلمان ...... قال بعض المحققين : حديث ''مثل أمتي'' حديث حسن له طرق قد يرتقي بها إلى الصحة ، ونقل القاري عن بعض الشراح لا يحمل هذا الحديث على التردد في فضل الأول على الآخر ، فإن القرن الأول هم المفضلون على سائر القرون من غير شبهة ...... وإنما المراد به نفعهم في بث الشريعة والذب عن الحقيقة " (مرقاة :۱۱/ ۴۶۶، مكتبة امداديه، ملتان)

عظمت و برتری حاصل ہے، شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرّانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی بھی ہے، سچ تو یہ ہے کہ شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کے عام کارناموں کے لئے نہیں بلکہ اس کے تھوڑے سے حصہ کے مختصر بیان کے لئے بھی دفتر چاہئے، اس لئے مقالہ نگار کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ شیخ کی زندگی کے کس شعبہ پر گفتگو کرے اور کسے چھوڑے :

از سر تا بقدم ہر جا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

بالآخر عنوانات فہرست پر نظر ڈال کر ایک ایسے عنوان پر کچھ خامہ فرسائی کا ارادہ کیا جو راقم کو اپنے ذوق سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوا اور صاحب تذکرہ کے علمی مقام کے اعتبار سے بھی، اگرچہ عنوانات کی فہرست ہیں اس کا نمبر تیرہواں ہے، یعنی ''ابن تیمیہ اور تفسیر''، لیکن شروع میں ہی یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ زیر نظر عنوان کا حق ادا ہونا ایک مقالہ میں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اس لئے کسی مقالہ نگار سے یہ توقع رکھنا کہ وہ موضوع کا حق ادا کریں گے، موضوع ہی سے نہیں شیخ الاسلامؒ کے مقام سے بھی ناواقفیت کی علامت ہوگا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ علوم دینیہ اور فنون عالیہ میں فن تفسیر ہی ایسا فن ہے جس کے بارے میں اہل نظر کا اندازہ ہے کہ وہ ابھی تک تشنہ و خام ہے جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصری (م: ۹۷۰ھ) کی کتاب کے حوالہ سے علاء الدین حصکفی

(م:۱۰۸۸ھ) نے بیان کیا ہے، یہ بات اتنے بلیغ اور جامع انداز میں کہی گئی کہ اسے نقل کر کے سامعین کی ضیافت کا سامان فراہم کرنے کا جی چاہتا ہے، مزید برآں یہ کہ اس میں نہ صرف فن تفسیر بلکہ دیگر علوم کا بھی بڑا اچھا تلا جائزہ لے لیا گیا ہے، لیجئے سنئے :

العلوم ثلاثة : علم نضج وما احترق ، وهو علم النحو والأصول ، وعلم لا نضج ولا احترق وهو علم البيان والتفسير ، وعلم نضج واحترق وهو علم الحديث والفقه ۔ (۱)

(۱) الدر المختار مع الرد:۱/ ۳۱

اور جس نے مختلف علوم وفنون بالخصوص فن حدیث وتفسیر کا گہرا اور تقابلی مطالعہ کیا ہے اس کے لئے مذکورہ بالا تجزیہ کا مبنی برحقیقت ہونا محتاج دلیل نہیں ہے، اس پس منظر میں شیخ الاسلام کی فن تفسیر سے متعلق خدمات کی اہمیت کتنی بڑھ جاتی ہے، اس کا اندازہ کر لینا کسی صاحب شعور کے لئے مشکل نہیں، مگر چوں کہ عام طور پر شیخ الاسلامؒ کی شہرت ایک محدث متکلم، یا مناظر و مصلح کی حیثیت سے زیادہ ہے، اس لئے ہوسکتا ہے راقم کی مذکورہ رائے پر (فن تفسیر میں موصوف کے مقام بلند کی بابت) کچھ لوگوں کو تعجب ہو؛ لیکن یہ رائے طبع زاد نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے، جس کی صحت کا پتہ علامہ کے علمی کارناموں کی فہرست ہی پر ایک نظر ڈالنے سے بآسانی چل سکتا ہے، ان کے علوم کی دائرۃ المعارف (جو مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نام سے شائع ہوئی ہے) میں پوری چار بلکہ پانچ ضخیم جلدیں تیرہ تا سترہ، صرف فن تفسیر کے مباحث پر مشتمل ہیں، تیرہویں جلد اُصولی مباحث کے لئے مخصوص ہے، اس سے پہلے بھی علامہ کے مختلف سورتوں کے متعدد تفسیری مجموعے شائع ہوچکے ہیں، علاوہ ازیں تقریباً سب سے معتبر تذکرہ نگاروں نے ان کا فن تفسیر میں بھی اختصاص و امتیاز ذکر کیا ہے، ان میں علامہ کے جلیل القدر معاصر تذکرہ نگار بھی شامل ہیں، مثلاً امام ذہبی (م:۷۴۸ھ) فرماتے ہیں :

كان آية في الذكاء ...... وتقدم في علم التفسير ......

وقد لقبه بعض العلماء الآخرين ببحر القرآن ، وقال :
وأما التفسير فمسلم إليه ، وله فى استحضار الآيات
من القرآن ـ وقت إقامة الدليل بها على المسألة ـ قوة
عجيبة ...... ولفرط إمامته في التفسير وعظم إطلاعه
يبين خطأ كثير من أقوال المفسرين ، ويوهي أقوالاً
عديدة ـ (۱)

(۱) بحوالہ پیش لفظ مقدمۃ فی اصول التفسیر: ۸-۹، للدکتور عدنان زرزور۔

اور عصر حاضر کے مشہور بالغ نظر مصنف اور ائمہ کے افکار وسوانح کے خصوصی شارح وکاتب شیخ ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب (ابن تیمیہ : حیاته و عصره) میں لکھا ہے :

لقد قال المؤرخون ناقلين عن تلاميذه أنه جمع قدراً
كبيراً في تفسير القرآن الكريم ، وقالوا : إنه يقع في
أكثر من ثلا ثين مجلداً ـ (۱)

علامہ کے اس موضوع سے متعلق انہاک بلکہ ایک درجہ کی فنائیت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے جو خود انھوں نے ذکر فرمائی ہے ''ربما طالعت على الآية الواحدة نحو مأة'' اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ موصوف مطالعہ میں ایسی شدید ریاضت ومشقت اُٹھانے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنتوں کے بھر پور صحیح استعمال کے باوجود ان پر اعتماد کرنے کے بجائے اللہ علیم وخبیر اور معطی ووہاب کی بارگاہ میں فہم صحیح کے لئے یوں دُعاء کرتے تھے ''یا معلم آدم وابراهيم علمني'' اور اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ایسی مؤثر دُعاء کے ساتھ عبدیت اور نیازمندی کا جو عملی انداز اختیار کرتے تھے وہ اس سے بھی زیادہ قابل توجہ ہے، اسے موصوف کے الفاظ میں سنئے :

وكنت أذهب إلى المساجد المهجورة ونحوها
وأمرّغ وجهي في التراب وأسأل الله تعالى وأقول : يا

معلم إبراهيم فهمني ـ (۲)

ایسی عبدیت کے اظہار اور انابت کے بعد بھی کریم آقا کی طرف سے بندہ نوازی نہ ہوتی تو محل تعجب تھا، اس بارے میں علامہ کے ایک مستفید وتلمیذ اور قدیم ترین معاصر تذکرہ نویس حافظ عمر بن علی البزار (المتوفی: ۷۴۹ھ) کا بیان کردہ ایک واقعہ جو شیخ الاسلام کے بالکل بچپن اور تعلیم کے بالکل ابتدائی مراحل سے متعلق ہے، شاید موصوف کی افتادِ طبع سمجھنے

(۱) ابن تیمیہ حیاتہ وعصرہ: ۵۱۰، مطبوعہ دار الفکر العربی۔
(۲) حوالہ سابق: ۵۱۱۔

اور بعد کی ترقیوں کے راز کی پردہ کشائی میں معاون ہو جیسے انھوں نے شیخ الاسلام کے ایک ابتدائی استاذ (حفظ قرآن کے استاذ) کے حوالہ سے نقل کیا ہے، یہاں اسے مصنف کے الفاظ میں ہی پیش کیا جارہا ہے، شیخ کے استاذ نے بتایا کہ :

قال لي أبوه وهو صبي يعنى الشيخ أحب إليک أن
توصيه وتعده بأنک إن لم تنقطع عن القراء ة
والتلقين أدفع إليک كل شهر أربعين درهما ، قال
ودفع إلي أربعين درهما ، وقال : أعطه إياها فإنه صغير
وربما يفرح بها ، فيزداد حرصه في الاشتغال بحفظ
القرآن ودرسه ، وقل له : لک في كل شهر مثلها ،
فامتنع من قبولها ، وقال : يا سيدى ! إني عاهدت الله
تعالىٰ أن آخذ على القرآن أجراً ولم يأخذها ـ (۱)

اس سے جہاں شیخ کے والد ماجد کے حسن تربیت اور جذبۂ تحریص علم کا پتہ چلتا ہے، وہیں شیخ کی عقل سلیم اور طبع مستقیم کا اندازہ بھی ہوتا ہے، یقیناً اس وقت کے اہل بصیرت شیخ سعدیؒ کی زبان میں پکار اُٹھے ہوں گے :

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

اور بعد کے واقعات سے یہ پیشین گوئی حرف بحرف بلکہ توقع سے کہیں بڑھ کر صحیح اور سچی ثابت ہوئی، خیر یہ توضمناً ایک سبق آموز واقعہ ذکر میں آ گیا، اصل بات شیخ کے فن تفسیر سے متعلق چل رہی تھی، اسی طرف پھر لوٹتے ہیں، علامہ نے پورے قرآن مجید کی تفسیر اگرچہ مصلحتاً نہیں لکھی؛ لیکن جتنا کچھ ذخیرہ محفوظ رہ گیا ہے، وہ خود اس فن میں ان کے صحیح مقام

(۱) الأعلام العلية في مناقب ابن تيميه:۷۰،تاليف الحافظ عمرؒ ابن على البزار ، طبعة ثالثة، المكتب الإسلامي، بيروت.

کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے، ان کا طرز تفسیر کیا تھا؟ اس بارے میں شیخ کی مجلس درس کے ایک شریک ومستفید (حافظ عمر بن علی البزار) سے ان کا آنکھوں دیکھا حال سنایا جارہا ہے، فرماتے ہیں :

ولقد كان إذا قرئ في مجلسه آيات من القرآن العظيم يشرع في تفسيرها فينقضي المجلس بجملته والدرس برمته ، وهو في تفسير بعض آية منها ، وكان مجلسه في وقت مقدر بقدر ربع النهار ، يفعل ذٰلك بديهة من غير أن يكون له قارئ معين يقرأ له شيئاً معيناً يبينه ليستعد لتفسيره ، بل كان من حضره يقرأ ما تيسر ويأخذ هو في القول على تفسيره ، وكان غالباً لا يقطع إلا ويفهم السامعون أنه لولا مضي الزمن المعتاد لأورد أشياء أخرى في معنى ماهو فيه من التفسير ، لكن يقطع نظراً في مصالح الحاضرين ولقد أملى في تفسير " قل هو الله أحد " مجلداً كبيراً وقوله تعالٰى " الرحمٰن على العرش استوى" نحو خمس و ثلاثين كراسة .

اس کے بعد موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ :

ولقد بلغني أنه شرع في جمع تفسير لو أتمّه لبلغ خمسين مجلداً . (۱)

موصوف کے تفسیری افادات کس قسم کے ہوتے تھے اس کے لئے ہم یہاں عصر حاضر کے ایک بالغ نظر مفکر، عالم اسلام کی مشہور شخصیت اور شیخ الاسلام کے غایت درجہ عقیدت مند تذکرہ نگار (حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ) کی شہرہ آفاق کتاب سے اقتباس پیش کرتے ہیں :

(۱) الاعلام العلية:۷۰-۷۱۔

ان کے طریقۂ تفسیر کی بھی (دوسری تصنیفات کی طرح) بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے ربط ہے...... ان کا مصنف آیاتِ الٰہی کو اپنے گردوپیش کی زندگی اور اپنے معاصر انسانوں پر منطبق کرتا ہے، اور ان آیات کے نقطۂ نظر سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے ہم عصر لوگوں اور اُمت کے مختلف طبقوں کا احتساب کرتا ہے، وہ بتلاتا ہے کہ ان آیات وحقائق سے زندگی میں کہاں انحراف ہورہا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہورہے ہیں ۔(۱)

موصوف نے شیخ الاسلام کے طرز تصنیف کی بابت اور بھی بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں، مثلاً لکھا ہے :

وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اس پر اتنا مواد اور رسالہ جمع کردیتے ہیں جو بیسیوں کتابوں اور سینکڑوں صفحات میں منتشر ہوتا ہے۔

اس کے بعد آں محترم نے اس طریقہ کا ایک فطری نتیجہ یہ بتایا ہے کہ :

اکثر اس مواد اور نقول کے پیش کرنے میں بحث کا بڑا ہاتھ سے جاتا

رہتا ہے اور مطالعہ کرنے والا نقول کی کثرت میں گم ہوجاتا ہے۔

لیکن پھر وہ اس طرزِ تحریر کا ایک خاص فائدہ بیان کرتے ہیں، وہ یہ کہ :

ان کا بڑا علمی احسان ہے کہ انھوں نے بہت سا قدیم مواد و مسالہ محفوظ کردیا اور بہت سے افکار وآراء کو اپنی کتابوں میں نقل کرکے ضائع ہونے سے بچالیا۔ (۲)

شیخ کے اس طرزِ کلام کو بات میں بات نکالنے سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، جو غیر

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت: ۱۴۵، حصہ دوم، بار پنجم مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۲) حوالۂ سابق۔

معمولی ذہانت اور قوت ادراک کی علامت ہے، یہاں اس کی صرف ایک مثال ان کے تفسیری ذخیرہ سورۂ اخلاص کی تفسیر سے ہی پیش کی جاتی ہے، موصوف نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''لم يكن له كفواً أحد'' کی تشریح وتفسیر میں نفی مثل کے مظاہر ومصداقات کی تعیین کرتے ہوئے اپنے زرنگار اور سیال قلم کے ذریعہ کتنے مباحث سمیٹ لئے ہیں اور کن کن خفی اور دور افتادہ گوشوں کو روشن کردیا ہے؛ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ذرا صبر وتحمل کے ساتھ اگلی سطریں سماعت فرمائیے :

لما حج النبي صلى الله عليه وسلم استلم الركنين اليمانيين ولم يستلم الشاميين ، لأنهما لم يبنيا على قواعد إبراهيم فدل ذلک على أن التمسح بحيطان الكعبة غير الركنين اليمانيين وتقبيل شيئ منها غير الحجر الأسود ليس بسنة ، فمعلوم أن جميع المساجد حرمتها دون الكعبة ، وأن مقام إبراهيم بالشام وغيرها وسائر مقامات الأنبياء دون المقام الذي قال الله فيه : " واتخذوا من مقام إبراهيم

مصلیٰ'' فعلم أن سائر المقامات لا تقصد للصلاة فيها كما لا يحج إلى سائر المشاهد ولا يتمسح بها ولا يقبّل شيئ من مقامات الأنبياء ولا المساجد ولا الصخرة ولا غيرها ، ولا يقبل وجه الأرض إلا الحجر الأسود ''۔ (۱)

اس کے بعد یہاں پر شعار کفار کی بحث بھی بہت تفصیل کے ساتھ چھیڑ دی ہے اور پھر اسی ذیل میں ارض خرابی کا حکم اور اس بارے میں فقہاءِ اُمت کے اقوال، نیز دیگر

(۱) تفسیر سورۃ الاخلاص: ۱۴۷، الطبعة الاولیٰ ۱۳۴۳ھ، المطبعة الحبيبيه مصر۔

اراضی کا حکم، خاص طور پر ان علاقوں کا حکم جن کو مسلمانوں نے کافروں سے جنگ کرنے کے بعد حاصل کیا ہے، ذکر فرماتے ہوئے مکہ معظّمہ کی اراضی اور وہاں کی عمارت کے احکام شرعیہ سے حسبِ عادت نہایت شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں قرآن مجید سورۃ الحج کی آیت :

إن الذين كفروا ويصدون عن سبيل الله والمسجد الحرام الذي جعلناه للناس سواء العاكف فيه والباد ۔

سے اس طرح استشہار کیا ہے :

وهذه هي العلة التي اختصت بها مكة دون سائر الأمصار ، فإن الله أوجب حجها على جميع الناس ، وشرع اعتمارها دائماً ، فجعلها مشتركة بين جميع عباده ، كما قال : " سواء العاكف فيه والباد" ولهذا كانت منى وغيرها من المشاعر من سبق إلى مكان فهو أحق به حتى ينتقل عنه كالمساجد ، ومكة نفسها من سبق إلى مكان فهو أحق به والإنسان أحق

بمسكنه ما دام محتاجاً إليه وما استغنى عنه من
المنافع فعليه بذله بلا عوض لغيره من الحجيج
وغيرهم ، ولهذا كانت الأقوال في إجارة دورها وبيع
رباعها ثلا ثة : قيل : لا يجوز لا هذا ولا هذا ، وقيل :
يجوز الأمر ان : والصحيح أنه يجوز بيع رباعها ولا
يجوز إجارتها ، وعلى هذا تدل الآثار المنقولة في
ذلک عن النبی صلی الله علیه وسلم وعن الصحابة
رضی الله عنهم .

اس کے بعد پھر اصل موضوع توحید اور نفی مثل سے متعلق بعض اُصولی اُمور مثلاً ''مشاہد'' اور ان کی تعظیم کی حیثیت بیان کر کے نیز ''بناء مساجد'' اور ''عمارۃ مساجد'' کے مابین فرق بتا کر ان کے احکام بیان کئے ہیں، لکھا ہے :

عمارتها بالعبادة فيها كالصلاة ...... وأما نفس بناء
المساجد فيجوز أن ينبيها البَر و الفاجرو المسلم والكافر .

قبور وغیرہ کے ضمن میں بعض دلچسپ بلکہ تاریخی حقائق اور فکر انگیز باتیں شیخ زبان قلم کے ذریعہ منظر عام پر لائے ہیں، جن پر یہ جانے کتنے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے (ان کی وجہ سے عوام تو عوام اکثر خواص بھی غلط فہمیوں میں مبتلا تھے) سنئے! کیسے کیسے عجیب انکشافات کئے اور علمی نکتے بیان فرمائے ہیں :

أهل المشاهد كثير من مشاهدهم أو أكثرها كذب ،
فإن الشرک مقرون بالكذب في كتاب الله كثيرا ،
قال الله تعالىٰ : " واجتنبوا قول الزور حنفاء لله غير
مشركين " .

پھر اس کی متعدد مثالیں دی ہیں :

وذٰلک كالمشهد الذي بني بالقاهرة على رأس

الحسين ، وهو كذب باتفاق أهل العلم ...... وقد قيل
إنه كان رأس راهب ...... وكذلک مشهد علي رضي
الله عنه إنما هو قبر المغيرة بن شعبة رضي الله عنه ،
وعلي رضي الله عنه إنما دفن بقصر الإمارة بالكوفة ،
ودفن معاوية بقصر الإمارة بدمشق ، ودفن عمروبن
العاص بقصر الإمارة بمصر خوفاً عليهم إذا دفنوا في
المقابر البارزة أن ينبشهم الخوارج المارقون ، فإن
الخوارج كانوا تعاهدوا على قتل الثلا ثة . (۱)

(۱) حوالہ سابق: ۸/ ۱۳۸-۱۳۷

ان علمی انکشافات کی اہمیت وافادیت سے کون صاحب نظر انکار کر سکتا ہے؛ لیکن یہاں سامعین کی توجہ اس طرف مبذول کرانی ہے کہ وہ سوچیں! کیا کسی بڑے سے بڑے ذہین شخص کا طائرِ فکر یہاں تک پرواز کر سکتا ہے کہ وہ ''لم یکن له کفواً احد'' کی تفسیر کے تحت ایسی ایسی عجیب نکتہ آفرینیاں اور مناسبتیں تلاش کر سکے کہ جن کے ذریعہ مکہ معظّمہ کی سرزمین کے احکام سے لے کر مشاہد کے احکام تک اور پھر اسی کے ساتھ ممتاز ترین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام دفن کا سراغ بھی مل جائے۔

علامہ نے آیات کی تفسیر میں کلامی مباحث بھی حسب معمول نہایت وسیع پیمانہ پر نہ صرف اُٹھائے بلکہ ان کے بارے میں فیصلہ کن رائیں، مدلل طریقہ پر، پیش کی ہیں، ان میں اندازہ ہے کہ مسئلہ صفات سب سے زیادہ اہم اور معرکۃ الآراء ہے اس میں اہل حق واہل باطل (اہل سنت واہل بدعت) کے درمیان ہی نہیں خود اہل حق (اہل سنت) کے مابین بھی خاصے اختلافات رہے ہیں، خاص طور پر متقدمین ومتاخرین (اہل سنت) کا اختلاف تاویل اور عدم تاویل کی بابت تو بہت مشہور ہے، جس سے علم عقائد کا معمولی طالب علم بھی ناواقف نہ ہوگا؛ چوں کہ اب یہ بات غالباً سب یا اکثر اہل علم کے دائرہ علم میں آچکی

ہے کہ شیخ الاسلام کا مسلک صفات باری کے سلسلہ میں متقدمین والا (عدم تاویل کا) ہے، اس لئے موصوف کی عبارتیں اور نقول پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اسی سلسلہ کی ایک کڑی آیاتِ متشابہات کی تاویل ہے، **راسخین فی العلم** (کی باخبری اور بے خبری) کے بارے میں علماء کا اختلاف بھی ہے، جو دراصل سورۂ آلِ عمران کی مشہور آیت '' **وما يعلم تأويله إلا الله** '' پر وقف ہونے نہ ہونے سے پیدا ہوا ہے (جیسا کہ شیخ نے اور ان کے علاوہ عام طور پر مفسرین نے بیان کیا ہے، مثلاً دیکھئے: تفسیر کشاف آیت محولہ بالا) یہاں یہ بتانا تو ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ پہلے زمرہ میں (آیات متشابہات کی تاویل کا علم اور اس کے لئے دلائل پیش کئے ہیں، یہ بحث خاصی طویل ہے، از راہ اختصار یہاں ذکر نہیں کی جا رہی ہے، تفصیل کے طالب '' مجموعۂ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ'' کی تیرہویں جلد دیکھیں (از ص: ۲۷۳، طبع اولیٰ کا عکس) اس وقت مباحث میں محاکمہ کر کے کسی پہلو کو ترجیح دینا ہمارا مقصد، بلکہ منصب بھی نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ علامہ کا رہوار قلم کس کس شاہراہ پر دوڑا اور اس نے کیسے کیسے معرکے سر کئے ہیں۔

سامعین کو ہماری ان معروضات سے شیخ الاسلام کی فن تفسیر میں مہارت وصداقت، نظر کی وسعت، استنباطی قوت اور ان کی اخاذ طبیعت کا تھوڑا اندازہ ہو گیا ہوگا؛ لیکن راقم کا خیال ہے کہ ان کا تفسیر کے باب میں سب سے اہم اور قابل قدر بلکہ شاہکار کہلانے کا مستحق کارنامہ وہ چند ورقی رسالہ ہے جو مقدمہ فی أصول التفسیر کے نام سے متعدد بار چھپ چکا ہے اور منظر عام پر آچکا ہے کہ یہ کتابچہ '' بقامت کہتر بقیمت بہتر'' بلکہ دریا بکوزہ کا صحیح مصداق ہے اس کی اصل قدر و قیمت میں مزید اضافہ اس حقیقت کے استحضار اور پیش نظر رکھنے سے ہوجاتا ہے کہ علوم قرآن کے اُصول پر اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی اہم تصنیف ہے جو کہ عام ہوئی؛ کیوں کہ تفسیری ذخیرہ کی بے پناہ وسعت کے باوجود اس سے قبل کی اُصول تفسیر پر ایسی کوئی وقیع وجامع تحریر، بعض اہل نظر کا یہ کہنا ہے کہ پورے اسلامی کتب خانہ میں ملتی، (یا تو وجود ہی میں نہیں آئی یا آ گئی تھی تو باقی نہیں رہ سکی) البتہ اس کے بعد تو بہت سی نہایت اہم

اور قابل قدر مختصر ومفصل، تصنیفات وجود میں آئیں، چنانچہ ان میں اس مقدمہ سے استفادہ کیا جانا کھلے طور پر محسوس ہوتا ہے، مثلاً امام بدرالدین محمد زرکشی (م: ۷۹۴ھ) کی '' البرہان'' اور امام سیوطی (م: ۹۱۱ھ) کی '' الاتقان'' اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی (م: ۱۱۷۶ھ) کی '' الفوز الکبیر'' مؤخر الذکر کتاب کے بعض مباحث (مثلاً شان نزول کی بحث) تو اسی سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، اس رسالہ کو اپنے موضوع میں ہی نہیں خود شیخ الاسلام کی تصانیف میں بھی کئی حیثیتوں سے امتیاز حاصل ہے، ایک خاص بات اُسلوب کا امتیاز ہے، شیخ نے دیگر تصانیف کے برخلاف اس کتاب میں نہایت مرکز ومنضبط طریقہ پر گفتگو کی ہے، جس سے مباحث میں انتشار یا کسی طرح کی بے ربطی نہیں ملتی ہے، اسی کے ساتھ تمام اُصولی کتابوں پر ان کے طرز ادا کے مطابق اس میں بھی اختصار، نیز بقدر ضرورت کلام پر اکتفاء کی شان پائی جاتی ہے، رسالہ کی ان خصوصیات وامتیازات کا تقاضہ تھا کہ اس پر مقالہ میں تفصیلی گفتگو کی جاتی اور اس کے افادی پہلوؤں کو نمایاں کر کے سامعین کی علمی ضیافت کا سامان فراہم کیا جاتا، مگر وقت کی قلت اور آپ حضرات کی مشغولیت نیز دیگر مقالہ نگاروں کی رعایت اس سے مانع ہے؛ لیکن '' **إذا لا يدرك كله لا يترك كله** '' کے حکیمانہ اُصول پر عمل کرتے ہوئے رسالہ کے چند اہم مندرجات کی بابت کچھ عرض کرنا شاید تضییع وقت نہیں سمجھا جائے گا؛ بلکہ اُمید ہے کہ اسے مقالہ نگار کی نہیں رسالہ کے جلیل القدر مصنف کی بات سمجھ کر حسن استماع سے نوازا جائے گا۔

شیخ نے یہ رسالہ اپنے بعض تلامذہ کی درخواست پر لکھا ہے جیسا کہ ابتدا میں خود صراحت کر دی ہے، شیخ کے پیش نظر جو مقاصد رہے یا جن اُمور کی نشاندہی مقصود تھی اسے بھی خود ہی بیان فرما دیا ہے، اس لئے اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے صاحب کتاب کی اصل عبارت نقل کر دینا ہی مناسب معلوم ہو رہا ہے، حمد وصلوٰۃ کے بعد فرماتے ہیں:

فقد سألني بعض الإخوان أن أكتب له مقدمة تتضمن
قواعد كلية تعين على فهم القرآن ومعرفة تفسيره

ومعانيه والتمييز في منقول ذلک ومعقوله بين الحق
وأنواع الأباطيل والتنبيه على الدليل الفاصل بين
الأقاويل .

اس کے بعد کسی ایسے رسالہ یا کتاب کی واقعی ضرورت باقی ہونے کے اعتراف یا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

فإن الكتب المصنفة في التفسير مشحونة بالغث
والسمين والباطل الواضح والحق المبين . (۱)

چنانچہ جیسا کہ مصنف نے اوپر کی سطروں میں رسالہ کے مشتملات کی نشاندہی کی ہے،

(۱) مقدمۃ: ۳۳، طبع دار القرآن الکریم، کویت۔

حقیقتاً اس میں صرف وہ قواعد کلیہ ہی بیان کئے گئے ہیں، جن کے جاننے سے فہم قرآن میں بڑی مدد ملتی اور حق و باطل (غلط وصحیح) کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی یا ہوسکتی ہے یہاں ان سب قواعد (اُصول) کا بیان کرنا یقیناً طول کا سبب اور بعض سامعین کی گرانی طبع کا بھی باعث بن جائے گا، اس لئے ان میں سے صرف دو کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کتب تفسیر وحدیث میں بعض آیتوں کا شانِ نزول متعدد واقعات یا افراد کو بتایا گیا ہے اور ان واقعات کے درمیان کبھی کبھی برسوں کا فرق ہوتا ہے، اس صورتِ حال سے اکثر قارئین کو اُلجھن ہوتی ہے اور وہ حیران ہوتے ہیں، پھر تطبیق کی راہ نہ پا کر سوچنے لگ جاتے ہیں کہ آیا یہ آیت کئی بار نازل ہوئی ہے؟ شیخ الاسلام یہ گتھی اس طرح سلجھاتے ہیں (ایک تفصیلی تمہیدی گفتگو کے بعد فرماتے ہیں) '' **وقد يجئ كثيرا قولهم هذه الآية نزلت في كذا الاسيما ان كان المذكور شخصاً** '' اس کی متعدد مثالیں کتب حدیث سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

إن حكم الآية مختص بأولئک الأعيان دون غيرهم
فإن هذا لا يقوله مسلم ولا عاقل على الإطلاق ......
فلم يقل أحد من علماء المسلمين أن عمومات
الكتاب والسنة تختص بالشخص المعين ، وإنما ......
تختص بنوع ذلک الشخص فيعم ما يشبهه ...... فهي
متناولة لذلک الشخص ولغيره ، وكان بمنزلته ......
ومعرفة سبب النزول يعين على فهم الآية . (۱)

مطلب یہ ہے کہ شان نزول بتانے والے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ بس یہی شخص (یا واقعہ) اس آیت کا مخاطب یا اور اس پر عمل کرنے کا مکلّف ہے؛ بلکہ اس جیسے تمام اشخاص

(۱) ص:۴۶-۴۷۔

و واقعات کے لئے اس آیت سے رہنمائی حاصل کی جائے گی اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوگا؛ کیوں کہ شانِ نزول کا ذکر بطور مثال ہوتا ہے، یعنی اس جیسی نوعیت میں یہ آیت نازل ہوئی، مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ اس واقعہ یا شخص کے بارے میں آیت اُتری (اور ظاہر ہے کہ ایک نوعیت کے واقعات کی مثالیں متعدد ہوتی یا ہوسکتی ہیں، یہاں مصنف نے اس کے علاوہ اور بھی تفصیلات ذکر کی ہیں، مگر ہم نے اختصاراً اتنے ہی کو کافی سمجھا ہے۔

شیخ الاسلام نے ایک اہم سوال یہ بیان فرمایا ہے، اگرچہ بعد میں مشہور اور عام ہوجانے کی بنا پر اسی طرح سے اہل علم بالعموم واقف ہیں اور اس میں ندرت باقی نہیں رہ گئی کہ تفسیر کا سب سے بہتر طریقہ '' تفسیر القرآن بالقرآن '' ہے اس کے بعد تفسیر القرآن بالسنۃ ہے، مصنف نے اس پر بکثرت دلائل قرآن وسنت سے پیش کئے ہیں، اسی سیاق میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس سے اجتہاد کی مشروعیت پر استدلال کیا جاتا ہے، شیخ نے اس کی سند کو '' جید '' قرار دیا ہے (ص: ۹۵) اس کے بعد تفسیر

القرآن باَ قوال الصحابہ کا نمبر بتایا ہے،اس بارے میں یہ اہم بات بھی فرمائی تھی :

فإنهم أدى بـذلك لما شاهدوا من القرآن والأحوال التي اختصوا بها وبما لهم من الفهم التام والعلم الصحيح والعمل الصالح ، لا سيما علماؤهم وكبراؤهم كالأئمة الأربعة والخلفاء الراشدين والأئمة المهديين مثل عبد الله بن مسعود ۔

☆ ☆ ☆

مولانا شمس نوید عثمانی کی کتاب ''اگراب بھی نہ جاگے تو......'' کے بارے میں کچھ قابل غور باتیں

جو لوگ راقم الحروف سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کی عادت کتابوں یا شخصیات پر نقد وتبصرہ کرنے کی نہیں ہے؛ لیکن شمس نوید عثمانی صاحب مرحوم کی املائی کتاب ''اگراب بھی نہ جاگے تو......'' عام مسلمانوں؛ بلکہ حدیث السن کم عمر کچھ پڑھے لکھوں کے لئے بھی جب ابتلا کا باعث بن گئی یا بنتی نظر آئی تو اہل علم اور اصحابِ فکر ونظر فکر مند ہوئے؛ چنانچہ ایسے ہی ایک نہایت قابل احترام بزرگ نے راقم سے اپنے حسن ظن کی بنا پر فرمایا کہ کتاب پڑھ کر اپنی رائے سے انھیں مطلع کرے، راقم کے لئے ان کا فرمانا؛ چوں کہ فرمان

کا درجہ رکھتا ہے اس لئے اپنی عادت بلکہ افتادِ طبع کے برخلاف یہ کتاب اسی نظر سے دیکھی اور پڑھنے کے بعد جو تاثر قائم ہوا وہ قلم بند کر کے آں محترم کی خدمت میں پیش کر دیا، ابھی اس کے اشاعت کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ مصنف (شمس نوید عثمانی) راہی ملک بقا ہوئے ، (اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ عفو ودرگذر کا معاملہ فرما کر انھیں ان کی حسن نیت کا اور جو اعمالِ صالحہ انھوں نے کئے ان کا اجر عطا فرمائے)۔

موصوف کے انتقال کے بعد بعض حلقوں سے ان کے بارے میں ایسے غلو آمیز تاثرات وخیالات کی اشاعت کی گئی کہ'' ......مریداں می پرانند'' کی تصویر سامنے آنے لگی، جس سے اس کتاب کی ابتلائی حیثیت اور زیادہ آشکارا بلکہ مبرہن ہوگئی اور اہل فکر ونظر کی دور اندیشی پر مبنی فکر مندی کا نقش اور پختہ ہوگیا، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ راقم کا تاثر وتبصرہ منظر عام پر آجائے ، ہوسکتا ہے کتاب سے متاثر ہوجانے والوں کی، کسی درجہ میں اس خوش فہمی (جو راقم کی نظر میں غلط فہمی ہی ہے) کو ختم یا کم کرنے کا سبب بنے جو اس کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں پیدا ہوگئی یا پیدا کی جارہی ہے، مگر پھر بایں خیال اس تبصرہ کی فوری اشاعت کا ارادہ ترک کرنا پڑا کہ مبادا، اسے معرکہ آرائی یا محاذ آرائی کا نام دیا جائے اور خواہ مخواہ میدان کارزار گرم ہوجائے (جس میں کودنا راقم کی عادت نہیں) نیز مرحوم کی وفات کے فوراً بعد کسی تنقیدی تحریر کا شائع ہونا مروت کے خلاف ہونے کے ساتھ اہل تعلق پر زیادہ بار ہونے کا باعث بھی ہوتا، اب جب کہ فضا ساکن ومعتدل ہوگئی یا کم سے کم ساکن نظر آرہی ہے اور وفات پر بھی خاصا عرصہ گذر گیا تو خیال ہوا کہ اب اس کی اشاعت منفی کے بجائے مثبت اثرات کا انشاء اللہ سبب بنے گی (والغیب عند اللہ) اس لئے اب اس کے شائع کرنے میں مضائقہ نہیں نظر آرہا ہے، واللہ الهادی الی سواء الطریق۔(برہان)

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے، مصنف نے اپنے مدعا

(جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کے لئے جہاں بھی جیسا کچھ بھی مواد پایا جس سے مدعا کے اثبات میں مصنف کو اپنی دانست میں کسی بھی درجہ میں تائید نکلتی نظر آئی، اسے یکجا کرنے میں بڑی عرق ریزی کی ہے، کتاب کے باخبر قاری کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ مصنف پر اپنے مدعا کے اثبات کی دھن اس درجہ سوار ہے کہ بسا اوقات اس فکر سے بھی بے نیاز ہوگئے معلوم ہوتے ہیں کہ وہ جس چیز کو دلیل کے طور پر پیش کررہے ہیں وہ دلیل بننے کے لائق ہے بھی یا نہیں اور اس سے مدعا ثابت ہو بھی رہا ہے یا نہیں؟ وہ بہت سے مقامات پر مفروضات ومحتملات کو حقائق ثابتہ سمجھ بیٹھے ہیں (یا کتاب کے قاری کو انھیں حقیقت ثابتہ مان لینے پر آمادہ کرتے نظر آتے ہیں، وہ اپنے مدعا کے اثبات میں اس بات سے بھی بے پرواہ ہوگئے ہیں کہ اگر ان کا استدلال درست مان لیا جائے تو اس سے کیسے مسلمات کا انکار لازم آئے گا اور کتنے مسلم عقیدوں پر زد پڑے گی؛ چنانچہ وہ نہ صرف موضوع ومنکر احادیث (مثلاً ص: ۱۰۵-۱۰۶) سے استدلال کرنے میں متأمل نظر نہیں آتے؛ بلکہ کشف قبور تک کو دلیل کے طور پر پیش کرنے میں انھیں باک نہیں ہوتا (دیکھئے: ص: ۵۴) انھوں نے ہندوؤں کو قومِ نوح اور پھر حضرت نوح کی قوم کو صائبین (نتیجتاً ہندوؤں کو صائبین) کا مصداق قرار دینے کے لئے جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے فرق باطلہ وضالہ (مثلاً قادیانی اور غالی شیعہ فرقوں) کے استدلالات بھی ماند نظر آتے ہیں، ان استدلالات کی نوعیت محض نکتہ آفرینی کی یا اعتبار وتاویل کی نہیں؛ بلکہ صریحاً تحریف معنوی یا کم از کم تفسیر بالرائ کی ہے، جس کی مذمت احادیث صحیحہ میں صراحتاً کی گئی ہے، مثلاً مصنف نے قوم نوح کو ''صائبین'' ثابت کرنے کے لئے اس طرح کا استدلال بھی کیا ہے کہ قرآن مجید میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے، ان رسولوں میں سے ہر ایک کی طرف ایک ایک اُمت منسوب ہے، مگر حضرت نوح کی طرف کوئی اُمت منسوب نہیں؛ حالاں کہ صائبین کا ذکر قرآن مجید میں ہے، لہٰذا اس سے یہ نکلا کہ صائبین حضرت نوح کی قوم ہے (خلاصۂ مفہوم،

ص: ۴۰) حالاں کہ بالعموم انبیاء مذکورین کے ساتھ متصلاً نصاریٰ وصائبین وغیرہ کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ الگ مستقل طور پر ہے، اس لئے یہ استدلال بے معنی ولغو ہے، نیز یہ کہ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ ایسے بہت سے انبیاء کا ذکر ہے کہ جن کی طرف کوئی اُمت منسوب نہیں ہے۔ (مثلاً حضرت ایوب علیہ السلام)

اس کتاب میں مصنف نے جو چند دعوے کئے ہیں ان میں سب سے اہم بلکہ خطرناک ہندوؤں کا (اصلاً) صاحب کتاب ہونا (موجودہ ہندوؤں کا نہیں؛ کیوں کہ ان کے بارے میں تو مصنف نے صراحت کردی ہے کہ یہ اہل کتاب نہیں ہیں) اور ''وید'' کا آسمانی کتاب ہونے کا دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ ہے کہ (بعثت نبوی یا ہجرت کے) پندرہ سو سال بعد امامت (عربوں سے) ہندوؤں کی طرف منتقل ہوجائے گی، اس آخری دعویٰ کے لئے مصنف نے جو استدلال پیش کیا ہے وہ نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کن اور مصنف کی انتشار خیالی کا بھی آئینہ دار ہے، پہلے تو قرآن مجید کی (تین سورتوں کی) آیتوں سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ '' اللہ تعالیٰ زمین پر جو نظام نافذ کرتا ہے وہ اس کو ہمارے ایک ہزار سال بعد اٹھالیتا ہے، (ص:۲۱) مگر ان آیات سے اس مدعا کا اثبات بالکل ہی غلط ہے کیوں کہ معتبر مفسرین میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا ہے اور نہ قرآن مجید کی ان آیات کا یہ مفہوم ہے اور پھر مصنف کا اس سے نتیجہ نکالنا کہ اُمت محمدیہ کی مدت ہزار سال ہے ''**بناء الفاسد علی الفاسد**'' کا کھلا مصداق ہے، مصنف کو اپنے اس استدلال کی غلطی کے اور کتاب کے ہر قاری کی طرف سے تردید کے خطرہ کے احساس نے (کہ اُمت محمدیہ تو چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی موجود ہے) اس حدیث کے پیش کرنے پر آمادہ کیا جس میں کہا گیا ہے کہ اس اُمت کو آدھے دن، یعنی پانچ سو سال کی مہلت دی جائے گی (مفہوم، ص:۲۱) حالاں کہ اس حدیث سے بھی مدعا ثابت نہیں ہوتا، مصنف نے شاید استدلال کی اس کمزوری کا ادراک کرتے ہوئے مذکورہ حدیث کی تشریح میں مظاہر حق (ترجمہ مشکوٰۃ اُردو، کتاب الفتن، باب قرب الساعۃ مظاہر حق: ۴/۸-۳) کے حوالہ سے سیوطیؒ کے ایک مجمل

سے قول کا سہارا لیا، مگر اتنے عظیم دعویٰ کے لئے ایسا کمزور استدلال جو علمی تاریخ میں ایک عجوبہ ہی کہلانے کا مستحق ہے، پھر مصنف زورِ بیان میں یہ بھی بھول گئے کہ اس حدیث سے (سیوطیؒ کے قول سے سہارا لینے کے بعد بھی) زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی یا ہوسکتی ہے (قطع نظر اس سے کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور آیت ''**ان اللہ عندہ علم الساعۃ**'' کے معارض ہے یا نہیں) وہ ہے ''اُمت محمدیہ کی مدت بقا (یعنی قیامت کی آمد) اس حدیث کی شرح میں شراحِ حدیث نے عموماً یہی لکھا ہے کہ اُمت محمدیہ کے کم سے کم اتنی مدت ضرور باقی رہے گی، مثلاً (دیکھئے: مرقاۃ شرح مشکوٰۃ) مگر موصوف نے اس سے ثابت کیا ہے، عربوں کی امامت کی مدت کا پندرہ سو سال ہونا پھر ہندوؤں کی طرف اس امامت کی منتقلی (ص: ۲۲-۲۳ ومابعد) یہ چابک دستی اُمت کو ''قوم'' کے معنی میں لے کر دکھائی گئی ہے وہ بھی ہندوؤں کو اہل یمن اور فارسی کا مصداق قرار دے کر (یا للعجب) اس سے ہر باخبر منصف قاری اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ تشریح، تحریف (۱) کہلانے کے علاوہ کسی اور عنوان کی مستحق نہیں ہے، نیز ہر ذہین اور فکر رسا رکھنے والا یہ خطرہ محسوس کرے گا کہ کیا ''دین الٰہی'' جیسے گمراہانہ افکار اسی قسم کے استدلالات سے ثابت نہیں کئے جاسکتے؟ بلکہ اگر کوئی اس نتیجہ تک پہنچے کہ جب قرآن کی تین تین آیتوں سے ایک نظام کے ایک ہزار سال بعد اٹھا لئے جانے کا اثبات ہو رہا ہے تو یقیناً اس نظام (اسلامی شریعت) کی مدت بھی ایک ہزار سال تھی، جیسا کہ اکبر نے کہا اور سمجھا تو یہ غلط نہیں ہوگا، سوچئے کہ یہ کس درجہ خطرناک بات ہے!

کتاب کا ایک معتد بہ حصہ اس دعویٰ کے اثبات میں ہے کہ ہندوؤں کے ''مہامنو'' ہی حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور ہندو قوم نوح ہے؛ لیکن جو کچھ بھی اس بارے میں پیش کیا گیا ہے وہ تمام تر غیر مصدق کتابوں سے ماخوذ اور قیاس پر مبنی ہے، اس لئے ان تفصیلات سے اگر وہ سب درست مان لی جائیں تو زیادہ سے زیادہ اس کا امکان واحتمال ثابت ہوتا ہے کہ مہامنو، نوح تھے اور ہندو، قوم نوح ہے (یقین واعتقاد نہیں) حالاں کہ متعین طور پر کسی شخص کو نبی ماننے کے لئے یقینی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے؛ کیوں کہ کسی شخص کا متعین طور پر نبی ہونا ''مُؤْمَنٌ بہ'' میں شامل ہے اور ایمانیات کا اثبات دلائل قطعیہ سے ہوتا ہے، مجرد احادیث صحیحہ سے بھی نہیں ہوتا (یعنی جو درجۂ تواتر یا شہرت کی نہ ہوں) ظاہر ہے کہ مصنف کے استدلالات کتب غیر مصدقہ پر مبنی قیاسات واحتمالات ہیں جو صحیح اخبار وآحاد کے درجہ کے تو کیا ہوتے! ضعاف (بلکہ منکر وموضوع) روایات کے درجہ کے بھی بمشکل قرار دیئے جاسکتے ہیں، پھر ان سے یہ عقیدہ کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے کہ مہامنو، نوح تھے، اگر کتاب کا ناواقف قاری، مصنف کے زورِ بیان سے مرعوب ہو کر ایسا اعتقاد کرلے تو وہ کلامی وفقہی اعتبار سے ضلال ہی کے زمرہ میں آنے کے لائق ہوگا، کتاب کا یہ پہلو وہ ہے جس پر بہت سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ اس کے اثرات بڑے خطرناک اور گمراہ کن ہوسکتے ہیں، ایسا ہی کچھ معاملہ ''وید'' کو آسمانی کتاب اور ہندوؤں کو (سابق زمانہ اور اپنی، اصل کے لحاظ سے ہے ہی) اہل کتاب ماننے کا ہے، اس سے بھی زیادہ خطرناک نتائج کتاب میں مندرج ان ''تحقیقات'' سے نکل سکتے ہیں جن کی رو سے ''ایودھیا'' کا حرم (ص:۱۶۹) نور احمد کا ابیتابھ (ص:۱۰۱) حقیقت احمدی یا محمدی کا رام (ص:۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۸) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہندوستان آمد (ص:۶۰) ہندو مذہب، سناتن دھرم کا اسلام (ص:۱۵) مکہ معظّمہ کا مکتیشور (ص:۱۵۸) شیولنگ کا حجر اسود (ص:۱۸۱) ہونا ثابت کیا گیا ہے، اگرچہ مصنف کا مقصد تو ہندوؤں کو اسلام اور شعائر اسلام نیز نبی اسلام سے عقیدۃً قریب ثابت کرنا ہے، مگر تصویر کا دوسرا رُخ بھی اگر سامنے ہو کہ اس سے ہندوؤں کے اس دعویٰ کو تقویت پہنچے گی کہ ''یہ تمام مقامات (کعبہ، مکہ، حجر اسود) اصلاً ہندوؤں کے ہیں؛ لہٰذا انھیں واپس ملنے چاہئیں'' اور بین الاقوامی طور پر اسلام اور

(۱) اگر ایسی تشریح بھی تحریف معنوی نہیں ہے تو پھر کہنا چاہئے کہ تحریف معنوی لفظ بے معنی ہے یا ایک ناممکن الوجود شئی ہے